UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224557
UNIVERSAL
LIBRARY

ہوتے ہیں - اس سے انکی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُن ہندؤں کو خبر کریں جو مسلمانوں کی زبان سے اپنی زبان کو تحریر کے ذریعہ الگ کرنا چاہتے ہیں - اِن اخباروں کے علاوہ آگرہ میں بغاوت ہند کے نام سے ایک ماہوار رسالہ اور نکلنا شروع ہوا ہے - اس کے مدیر مکنہ لال ہیں - آگرہ کے اور دوسرے نئے اخبار حسب ذیل ہیں —

آفتاب عالمتاب ' یہ اردو کا اخبار ہے - اس کے مضامین ہندی رسم خط میں سورج پرکاش کے نام سے شائع ہوتے ہیں - ایک ہندو جنکا نام گنیش لال ہے اس کی ادارت کرتے ہیں —

اخبار حیدری اور اخبار حسینی دونوں اردو کے اخبار ہیں - پہلے کے مدیر مرزا علی حسینی حیدری ہیں اور دوسرے کے سید حسین علی جو دلی کالج میں پروفیسر ہیں اور انہوں نے الف لیلہ کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے —

" اجمیر " کے دو نو اخبار " جگ لبھد چنتک " اور " خیر خواہ خلایق " ہیں - پہلا اخبار ہندی کا ہے اور اس کے مدیر سوہن لال ہیں - دوسرا اردو کا ہے اور اس کے مدیر کا نام " امرت لیا پرشاد ہے جو اسوقت اردو کے مشہور لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں - انہوں نے علم الحساب اور دوسرے موضوعوں پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں —

اثاوہ سے پندرہ روزہ گزٹ شائع ہوتا ہے جس کا نام " پرجاہت " ہے - یہ مطبع " مصدرالتعلیم میں طبع ہوتا ہے - اس کے اردو ایڈیشن کا نام مصحب رکھا ہے اور انگریزی ترجمہ جو اس کے ساتھ شائع ہوتا ہے اس کا نام People's Friend ہے - اس کے مدیر حکوم " جزاھر لال ہیں - انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں اور انگریزی زبان سے ترجمہ بھی کئے ہیں - اس

گزٹ کو آگرہ کے گزٹ " اخبار الواح " کا قایم مقام سمجھنا چاہئے - اخبار الواح بھی حکیم " جواہر لال " ہی کے زیرادارت نکلتا تھا - ان دونوں اخباروں کا مقصد یہ رہا ہے کہ اپنے مضامین کے ذریعہ سے اخلاقی اصول کی نشر و اشاعت کیجائے اور مختلف ملکوں کی تہذیب ٹھیک خبریں درج کی جائیں اور یوں ہی سنی سنائی باتوں کو بطور سند نہ پیش کیا جائے —

" لدھیانہ " کا ہفتہ وار اخبار نور علی نور اب نہیں شائع ہوتا - اس کی جگہ اخبار مجمع البحرین نکلنا شروع ہوا ہے - اس کے مدیر اصغر حسین ہیں

جونپور سے نسیم جونپور شائع ہوتا ہے - اس کے مدیر سید مظفرالدین ہیں - سہارنپور سے وکٹوریہ گزٹ نکلتا ہے - اس کے مدیر ایک انگریز ہیں اور اگرچہ اس کے نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید انگریزی کا اخبار ہے ' لیکن نہیں ' یہ اخبار نہایت شستہ اردو زبان میں نکل رہا ہے - الہ آباد سے امین الاخبار عزیز الدین خاں کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے - سورت کا شمار مشہور و معروف مسلمانوں میں ہوتا ہے - " کانپور سے اخبار " شعلہ طور ، جمنا پرشاد کے زیرادارت شائع ہوتا ہے - یہ اخبار روزانہ ہے —

بدقسمتی سے ان سب اخباروں کی اشاعت بہت تھوڑی ہے - اور شمال مغربی صوبوں کی تین کروڑ تیس لاکھ آبادی میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو انہیں پڑھتے ہیں —

ہندوستان کے اور دوسرے صوبوں کے اردو اخباروں کے متعلق میری معلومات محدود ہیں - میں صرف آپ صاحبوں کو اسقدر بتلا سکتا ہوں کہ سنہ ۱۷۹۰ ع میں سورت سے ایک اردو اخبار نکلتا تھا جسکا نام منظور الاخبار تھا - اب آج کل اس کا نام نجم الاخبار ہے - اتفاق سے کلکتہ کی Urdu Guide ( و ہنمائے کلکتہ ) کا ایک نسخہ مجھے مل گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ

ہفتہ وار ہر جمعہ کے روز شائع ہوتا ہے —

سنہ ۱۸۷۰ ع کی ابتدا تک شمالی مغربی صوبوں میں ۴۶ مطبع کام کر رہے تھے - اس تعداد میں مرزا پور مشن اور Medical Press کے مطبع بھی شامل ہیں - مسٹر ایچ اسٹورٹ ریڈ نے جو میرے لئے معلومات فراہم کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سال گزشتہ ۳۸۶ مطبوعات ان صوبجات میں شائع ہوئیں - اور یہ مطبوعات کل ۶۵۳ ۵۴۳ نسخوں پر مشتمل تھیں - ان میں ۴۶ مطبوعات جو ۳۵۱ ۶۰۰ نسخوں پر مشتمل تھیں نظامت تعلیمات کی طرف سے طبع ہوئیں - باقی ۳۴۱ مطبوعات جو ۳۰۱ ۹۴۳ نسخوں پر مشتمل تھیں انہیں ہم حسب ذیل اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں —

( ۱ ) ابتدائی مدارس کی کتابیں جیسے قاعدے ، صرف و نحو ، فصاحت و بلاغت کی کتابیں - ۳۸ کتابیں اس قسم کے تحت میں آتی ہیں - ان کے کل مطبوعہ نسخوں کی تعداد ۴۸۷۰۰ تک پہنچتی ہے —

( ۲ ) مذہب و اخلاق فلسفہ اور دیومالا سے متعلق ۱۰۵ کتابیں طبع ہوئیں - کل نسخوں کی تعداد ۱۲۷۰۰ ہے —

( ۳ ) فلکیات اور اختر شناس پر ۱۵ مطبوعات - نسخوں کی تعداد ۷۰۵۰

( ۴ ) شعر و شاعری پر ۲۱ کتابیں - کل نسخوں کی تعداد ۱۸۰۴۴

( ۵ ) تاریخ پر ۹ کتابیں کل نسخوں کی تعداد ۳۵۵۰

( ۶ ) اصول قانون اور فقہ پر ۵۵ کتابیں - کل نسخوں کی تعداد ۲۶۲۲۹

( ۷ ) طب پر ۷ کتابیں — کل نسخوں کی تعداد ۵۳۰۰ —

( ۸ ) جغرافیہ پر ۷ کتابیں — کل نسخوں کی تعداد ۴۸۴۰ —

( ۹ ) علم الحساب ، اقلیدس اور جبر و مقابلہ پر ۴۰ کتابیں کل نسخوں کی

تعداد ۱۸۵۰ —

(۱۰) جنتریاں - ۲۰ مطبوعات مل طبع شدہ نسخوں کی تعداد ۱۷۳۲۵ —

(۱۱) قواعد ڈاکخانہ - اس کے صرف ۴۰۲ نسخے طبع کئے گئے —

اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ پر مطبوعات کی تعداد بہت کم ہے - انسانی علم کی اس شاخ کو شاید ہندوستانی لوگ زیادہ اہمیت کی نظر سے نہیں دیکھتے - شاید ان کے نزدیک بھی تاریخ کی تعریف وہی ہے جو یہاں یورپ میں کسی نے جل کر کی ہے کہ تاریخ چند غیر معتبر روایات کا مجموعہ ہے جسے انفرادی تعصبات کے رنگ و روغن کے ساتھہ پیش کیا جاتا ہے —

حال کی اردو مطبوعات میں مجموعہ قوانین تعزیرات ہند کو بڑی اہمیت حاصل ہے - یہ بڑی تقطیع پر ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے - ہندوستانی فاضلوں کی جماعت نے اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے - مسٹر ایچ اسٹورٹ ریڈ نے بھی اس کی تکمیل میں بڑی مدد کی اور صوبجات شمال مغربی کے لفٹنٹ گورنر جی ایٹنسن صاحب نے خود بہ نفس نفیس اس ترجمہ پر نظرثانی فرمائی ہے - اس سال کے ختم سے پہلے مجموعۂ قوانین تعزیرات ہند شائع ہوجاے گی اس واسطے کہ نئے تعزیری قوانین کا یکم جنوری سے نفاذ شروع ہوگا - ہندوستان سے میرے نام اس کا ایک نسخہ بھیجا گیا ہے جس کے متعلق مجھے اطلاع تو آ گئی ہے مگر ابھی تک وہ پہنچا نہیں - اس کے علاوہ جمع النفائس اور عجائبات صنعت شعاری کے نسخے بھی بھیجے گئے ہیں مگر ابھی تک مجھے نہیں پہنچے - آخر الذکر انگریزی کتاب The Phenomena of Industrial Life and conditions of Industrial success سے خوشہ چینی کرکے لکھی گئی ہے -

اس کتاب میں ہندوستان کے موجودہ معاشی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے —

ناصر خاں نے ڈاکٹر W . Anderson کی مدد سے ڈاکٹر Abercrombia کی کتاب " Inquiries on the intellectual Powers " کو اردو کا جامہ پہنایا ہے - اسی ترجمہ کا نام رہنمائے حکمت رکھا ہے -- اس کا پہلا حصہ اسی سال آگرہ سے شائع ہوگیا —

ہمیں یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ صرف صوبجات شمال مغرب ہی میں اردو زبان کی ترقی کی کوششیں ہو رہی ہیں بلکہ اردو کی ترقی میں سارا ہندوستان شریک ہے -- چنانچہ حال ہی میں لاہور میں پنڈت رام دیا نے مدرسے کے بچوں کے لئے ایک کتاب لکھی جس کا نام " ورتنت وفادار سنگھہ اور غدار سنگھہ " رکھا ہے - سورج بھان نجر نے وقائع " بابا نانک " لکھی ہے - ایک اور ہندو اودھیا پرشاد نے جغرافیہ پر ایک کتاب لکھی ہے - یہ اور دوسری کتابیں بھی تصنیف کر چکے ہیں - مولوی کریم الدین نے جن کی نسبت میں اپنے پچھلے خطبوں میں ذکر کرچکا ہوں پنجاب کا جغرافیہ لکھا ہے - ان مذکورہ بالا چاروں کتابوں میں پہلی دو سنہ ۱۸۶۰ ع میں طبع ہوئی ہیں اور آخری دو سنہ ۱۸۶۱ ع میں - یہ کتابیں مجھے امرتسر کے پرجوش مستشرق مسٹر روبرٹ کسٹ نے حال میں بھیجی ہیں - فرانسیسی سفیر مقیم کلکتہ موسیو لمبار (Lombard) نے ازراہ نوازش میرا تعارف مسٹر روبرٹ کسٹ سے کرادیا چنانچہ موصوف نے اردو کی تقریباً بیس کتابیں مجھے روانہ فرمائی ہیں - ان میں بیشتر خود موصوف کی کتابوں کے اردو ترجمے ہیں - ان میں پنجاب کا اردو نقشہ

بھی شامل ہے - یہ تقریباً ایک سراج گز ہے اور لاہور کے مطبع نور میں سنہ ۱۸۶۰ م میں طبع ہوا ہے —

اردو زبان کے ادبی اور علمی مشاغل کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں آپ صاحبان کے سامنے مسیحی مبلغین کی انجمنوں کی کارگزاری کی نسبت کچھ نہ کہوں - جیسا کہ میں اپنے پچھلے خطبے میں کہہ چکا ہوں کہ " برطانیہ اور ممالک غیر کی انجمن انجیل " نے انجیل کا جو دلپذیر ترجمہ گزشتہ سال شائع کیا اسے یقیناً اردو زبان کی چوٹی کی کتابوں میں سمجھنا چاہئے - یہ ترجمہ اس لئے اور بھی عمدہ اور معتبر ہے کہ ایک مشہور ہندوستانی فاضل نے اس کام میں ہاتھ بٹایا ہے - کہا جاتا ہے کہ اس ہندوستانی فاضل کو اپنی زبان اردو کے علاوہ انجیل مقدس پر پورا عبور حاصل تھا - اس ترجمے کی ترتیب میں سلیقے کو ملحوظ رکھا گیا ہے - اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ لوگ بھی اسے پسند کریں گے جو کہتے ہیں کہ مسیحی انجمنیں بالعموم انجیل مقدس کو غیر مسیحی لوگوں اور جاہل عیسائیوں کے سامنے نہایت بھدے طریقے سے پیش کرتی ہیں - اس ترجمے میں حواشی کا بھی التزام کیا گیا ہے - ان حواشی میں ہم مضمون عبارتیں اور استعاروں کی تشریح کی گئی ہے - اس کے ساتھ واقعات کی تاریخیں ' مختلف ترجموں کے فرق اور بعض جگہ عبرانی یا یونانی کے لفظ یہ لفظ عبارتیں دی ہیں ہر باب کے شروع میں اس باب کے [illegible] ہر صفحے پر زیر بحث مضمون کے اشارے ہر حوالہ [illegible] موضوع شروع ہوتے ہیں وہاں خاص خاص نشان کردئے گئے ہیں جن کی حقیقت وہی سمجھنی چاہئے جو مختلف جملوں کو جدا کرنے کے نشانات کی ہے

یہ کام نہایت دیدہ ریزی سے پایۂ تکمیل کو پہونچا اور اس سے انجمن اور مسٹر ماتھر دونوں کی شہرت کو چار چاند لگیں گے جنھوں نے انتہائی جانفشانی سے اس کی چھپائی کا انتظام کیا —

ان مبلغین مسیحیت کی مختلف مطبوعات کے متعلق میں تفصیل سے ذکر نہیں کرونگا اس واسطے کہ پھر مضمون بہت طویل ہوجائیگا - یہ لوگ انجیل مقدس کی تعلیمات کی بڑے جوش سے نشر و اشاعت کر رہے ہیں اس لوگوں کے لئے مسلمان فقرا کی طرح " شاہ " کا لقب استعمال کرنا ٹھیک ہوگا کیونکہ واقعی یہ سب لوگ روحانی بادشاہ ہیں - انھوں نے یہ بادشاہی اپنے جذبات کو مغلوب کرکے حاصل کی ہے - ان کی بعض مطبوعات نہایت دلچسپ ہیں چنانچہ ایک مذہبی افسانہ نیا کاش کھنڈ کے نام سے طبع ہوا ہے - یہ ہندی میں ہے - اس افسانے کی تمہید میں یہ بتایا گیا ہے کہ شہر بنارس کا ایک بوڑھا باشندہ اس فکر میں غلطاں پیچاں ہے کہ کسی تدبیر سے اس مقدس شہر کے سارے باشندے مسیحی مذہب قبول کرلیں اگر ایسا ہوجائے تو ان کے شہر کی قسمت جاگ جائے - اس عالم فکر میں وہ خواب دیکھتا ہے کہ اس کی دلی تمنا بر آئی - جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھتا ہے کہ ایک کتب خانہ ہے جہاں جاکر اس نے نیا کاش کھنڈ کا ایک نسخہ خریدا - اس کتاب میں اسے اپنے خواب کی تعبیر ملگئی - اس میں ایک ہندو اور اس کے بیٹے کے درمیان جس نے مسیحی مذہب قبول کرلیا تھا فرضی گفتگو کا حال درج تھا - چنانچہ اس گفتگو کے دوران میں مسیحیت ' اسلام اور بت پرستی کا مقابلہ کیا گیا ہے - اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسیحی مذہب ہی انسان کی نجات کا ضامن ہے - ساتھ ہی ہندوؤں کے بعض نابکار رسوم اور ذات پات کے نقصانات واضح کئے گئے ہیں —

مذہبی قسم کی مطبوعات میں جو حال میں شائع ہوئی ہیں اور جن کا مجھے علم ہے ' حیات پال ( پولس ) قابل ذکر ہے - اصل میں یہ کتاب مسٹر آرکسٹ نے انگریزی میں لکھی تھی پھر اسکا * پنڈت سورج بھان نیجر اور اجودھیا پرشاد نے اردو میں ترجمہ کیا - اس میں ایک نقشہ بھی ہے جس میں اس نامور شخص کے سفر کے متعلق معلومات درج ہیں اسی قسم کی ایک کتاب سچے اوتار کے متعلق لکھی گئی ہے ' ایک حقیقی تثلیث اور تری مورتی کے متعلق ہے ' ایک کتاب میں ایک مسیحی مبلغ اور ہندو جاٹری کے درمیان مباحثہ ہے ' ایک میں قران اور انجیل کی تعلیمات کا مقابلہ کیا گیا ہے - ایک میں حضرت محمد ( صلی اللہ علیہ وسلم ) اور حضرت مسیح کی تعلیمات کا فرق بیان کیا گیا ہے - ایک کتاب میں اسلام کی ابتدا - عروج اور زوال پر تبصرہ ہے - ان کتابوں کے علاوہ اور بہت ساری انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں جو فرانسیسی میں بھی موجود ہیں † حضرت " سلیمان کی کہاوتوں " اور " پہاڑی وعظ " کا اردو نظم میں ترجمہ کیا گیا ہے —

بمبئی کی مسیحی انجمن بھی اپنے کام میں مشغول ہے - اس انجمن نے اردو زبان میں ۲۳۰ چھوٹی بڑی کتابیں شائع کی ہیں - اردو کے

---

* یہ نام اسی خطبے میں پہلے بھی آیا ہے وہاں بھان لکھا ہے - یہاں چھاپے کی غلطی معلوم ہوتی ہے - نیز نام کے آخری جز میں بھی کچھ غلطی ہوگئی ہے پہلے نجر لکھا ہے یہاں نیجر ہے ( مترجم )

مثلاً " The goldinakers village " ; " Life of Mahammap

" Account From Umuasal History "

علاوہ اس صوبے کی دوسری زبانوں میں بھی ان کی مطبوعات ہیں -
اس انجمن کا رسالہ " بامداد " برابر نکل رہا ہے جس کی نسبت میں
اپنے سنہ ۱۸۵۹ والے خطبہ میں ذکر کرچکا ہوں —

اس قسم کی تبلیغی کتب کو طبع کرنے کے علاوہ مبلغین مسیحیت
ملک کے طول و عرض میں کلیساؤں کی بنائیں ڈال رہے ہیں اور مدرسے
قائم کر رہے ہیں - یہ سب کچھ ان انجمنوں اور ان افراد کی فیاضی کا
طفیل ہے جن سے ہندوستان کی تبلیغی انجمنوں کا تعلق ہے - میں
سمجھتا ہوں اس ضمن میں اس کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا
کہ مسٹر " لیوپولڈ " کو جن کا تعلق چرچ مشن Church Mission سے ہے
۵ ہزار پونڈ کی رقم بطور عطیہ پیش کی گئی ہے تا کہ اس سے وہ
شہر بنارس میں ایک مدرسہ قائم کریں جہاں اردو زبان کے ذریعہ سب
تعلیم دی جائے —

جن ہندوستانیوں نے مسیحی مذہب قبول کیا ہے ان میں اچھی
خاصی تعداد تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے اور ان میں بعض اردو زبان کے
انشاء پرداز بھی ہیں - مسلمان لوگ حضرت مسیح کو عیسیٰ کہتے ہیں
اور ہندو لوگ عیسیٰ کو سیوا (مہادیو) سے تعبیر کرتے ہیں - مسیحی
دین کی اکثر یورپی اصطلاحوں کو اردو میں نہایت سلیقے سے سمو لیا گیا ہے
اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان میں سامی اور یافثی دونوں قسموں کی
زبانوں کے عناصر پائے جاتے ہیں - دونوں زبانوں کی ترکیبیں اس میں
نہایت خوبی سے کھپ جاتی ہیں - اسلامی اور سنسکرتی عناصر سے مل کر
اردو کی شاعری میں بڑی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے - یہاں تک کہ
انگریزی طرز کی نظمیں اس میں لکھی جا سکتی ہیں - اور انگریزی

ملاقات کی لے تک اردو بولوں میں اچھی طرح کھپ سکتی ہے * —

۱۰ اگست گزشتہ لکھنو میں "یوسف خاں" بہادر کا انتقال ہوا - یہ عیسائی ہونے کے ساتھ ہی اردو زبان کے بڑے عمدہ انشاپرداز تھے - ان کا لقب "کہلی پوش" مشہور تھا - مرحوم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے توپخانے میں تقریباً ۳۰ سال خدمت انجام دے چکے تھے - انھوں نے اردو میں سیر و سفر کے نام سے اپنا سفرنامہ لکھا ہے - یہ سفرنامہ دہلی میں سنہ ۱۸۴۷ ع میں شائع ہوا - اسٹورٹ ریڈ نے اس سفرنامہ کا مقابلہ Morier کی کتاب "Haji Baba in England" سے کیا ہے - اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یوسف خاں بہادر ہندوستانی نہیں تھے بلکہ اطالوی تھے - یہ مسلمان بھی نہیں تھے - بلکہ کیتھولک مسیحی تھے - اور مرتے دم تک کیتھولک عقاید پر قائم رہے - اصل میں ان کا نام Delmerich تھا اور کہا جاتا ہے کہ ان کا فلورنس کے مشہور Medicis خاندان سے تعلق تھا † - کوئی پندرہ سال ہوئے کہ یوسف خاں بہادر سیاحت کی غرض سے انگلستان، فرانس، اسپین، پرتگال، اور جرمنی گئے تھے - واپسی پر "ترکی" اور عربستان کے راستے سے ہندوستان

---

* ستمبر سنہ ۱۸۵۲ کے خیر خواہ ہند میں ایک ہندوستانی مبلغ شرمان کی نظم نکلی ہے جو تین اور چار ارکان میں لکھی گئی —

ہم سجدہ کرتے بے اداب
سر اٹھتے تیری عطا
کہ تو خدا باپ تا ابد
پھر فانی حاکم رہتا

† اودھ گزٹ - (Indian Mail September 1861)

واپس اے - میں نے ابھی جس سفر نامے کا ذکر کیا ہے وہ در اصل انھیں ملکوں کے حالات پر مشتمل ہے - انھوں نے یہ سفر نامہ خود اردو میں لکھا تھا —

میں نے ابھی جن مذہبی کتابوں کا ذکر کیا ان میں ایک اور کتاب کو شامل کرنا ضروری ہے - یہ ہندی سے اردو میں ترجمہ ہے - ساتھ ہی نہایت قابل قدر حواشی بھی ہیں - کتاب کا موضوع ہندؤں کے چھ فلسفیانہ مسلکوں کی تردید ہے - اس کتاب کا مصنف ایک برہمن ہے جس نے مسیحی مذہب اختیار کرلیا تھا - اسے اپنے مضمون پر پورا تبحر معلوم ہوتا ہے - یہ کتاب ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے - مشہور مستشرق Fitz Edward Hall نے اس کو چھپوانے کا انتظام کیا اور اس پر فلسفیانہ تنقید لکھی - یہ کتاب اور یہ تنقید در اصل اس کام کی تکمیل کرتے ہیں جسے Colebrooke اور دوسرے ماہرین ہندیات نے شروع کیا تھا —

وہ کتابیں جو دوبارہ طبع ہوئی ہیں ان میں " تحفتہ اخوان الصفا " کا ہندی ایڈیشن قابل ذکر ہے - کلکتہ ، ہگلی ، بمبئی ، اور دہلی میں متعدد مرتبہ یہ کتاب طبع ہوچکی ہے - مگر یورپ میں اب تک یہ مکمل نہیں چھاپی گئی - یہ کتاب " باغ و بہار " کی طرح سول امتحانوں کے نصاب میں داخل ہے - ڈاکٹر " ریو " نے بڑی محنت اور کاوش سے " باغ و بہار " کو پھر طبع کرایا ہے - موصوف آج کل یونیورسٹی کالج میں پروفیسری کے عہدہ پر ممتاز ہیں - مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ وہ بھی میرے خطبات سن چکے ہیں - میرے قدیم دوست اور مہربان Duncan Farbes نے اس کی طباعت کا انتظام کیا - موصوف نے اردو پر اور اردو میں متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں —

مسٹر E. H. Rogers نے ایک کتاب " How to speak Hindustani " لکھی ہے - یہ کتاب نہ صرف فوجی لوگوں کے لئے بیحد مفید ہے جن کے لئے خاص طور پر یہ تصنیف کی گئی ہے بلکہ ان انگریز بیرسٹروں کے لئے بھی نہایت کار آمد ہے جن کا ارادہ ہندوستان میں وکالت کرنے کا ہے - ہندوستان میں آج کل مقامی عدالتیں ہر جگہ قائم ہورہی ہ - ان نوجوان انگریزوں کے لئے جن کی اپنے وطن میں قدر نہیں ' یہ موقع ہے کہ وہ اس وقت ہندوستان میں اپنی قسمت آزمائیں - لیکن اس سے پیشتر کہ وہ ہندوستان جانے کا ارادہ کریں یہ از بس ضروری ہے کہ وہ دیسی لوگوں کی زبان کو مطالعہ کے ذریعہ سیکھ لیں - انھیں ہندوستانی لوگوں کے ان محاوروں کو جاننا چاہئے جو ہر وقت گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں - مسٹر " روجر " کی کتاب میں ان کے متعلق پوری معلومات مل سکتی ہے - موصوف پہلے Lawrence asylum کے ناظم تھے اور اب کل chatham کے Indian Depots میں ہندوستانی کے استاد ہیں -

ہندوستانی صرف و نحو پر " انگریزی " " لاطینی " " فرانسیسی " " پرتگالی " اور " جرمن " زبان میں جو کتابیں نکل چکی ہیں ان میں دو کا اور اضافہ ہوا ہے - میری مراد Duncan Farbes کی کتاب سے ہے - اس میں صرف و نحو کے ساتھ چھوٹی سی لغت بھی ہے - یہ کتاب اردو میں ہے مگر اس کا رسم خط رومن ہے - دوسری کتاب Monier Williams کی " Hindustani Primer " ہے - یہ بھی رومن رسم خط میں لکھی گئی ہے - اس میں بھی ابتدائی صرف و نحو کے ساتھ ساتھ کثیر الاستعمال الفاظ کے معنی اور کہاوتیں درج ہیں - اگرچہ موصوف آج کل اکسفورڈ یونیورسٹی میں سنسکرت زبان کے پروفیسر ہیں مگر انھیں ہندوستانی زبان سے جو ہمیشہ

سے شغف اور لگاؤ رہا ہے وہ بدستور قائم ہے --

مسٹر سی ماتھر کی ہندوستانی اور انگریزی لغت دربارہ چھپ چکی ہے - اس میں انجیل مقدس کی ساری اصطلاحوں کے معنی دئے ہیں - جو صاحب اس کتاب کو خریدنا چاہیں خرید سکتے ہیں - خود انجیل مقدس کا جو ایڈیشن سوسوت نے تیار کیا تھا جس میں ایک طرف اردو ترجمہ ہے ' وہ ان کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئے - اس ترجمہ کی قدر و قیمت میں اس لغت کی وجہ سے اور بھی اضافہ ہو جائے گا - ہندوستانی اور یورپین دونوں اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے - بالخصوص وہ یورپین جو ہندوستانی زبان کا مطالعہ کر رہے ہیں اس کا بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کریں گے - انہیں ہندوستانی زبان سیکھنے میں اس سے بڑی سہولت ہوگی اگر وہ ذراسی بھی استعداد رکھتے ہیں تو اس کی مدد سے بآسانی آگے چل سکتے ہیں --

آپ صاحبان پر اب یہ روشن ہوگیا ہوگا کہ ہندوستان میں رومن رسم خط کا آہستہ آہستہ استعمال بڑھ رہا ہے - خود ہندوستانیوں میں ایسے اشخاص موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ عام طور پر انگریز لوگ جو رومن رسم خط استعمال کرتے ہیں اسے تھوڑی بہت تبدیلیوں کے بعد ہندوستان میں رائج کیا جا سکتا ہے - بابو شیو پرشاد نے جو بڑے فاضل آدمی ہیں اور کئی اخبار کے مدیر بھی رہ چکے ہیں اور متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں ' حال ہی میں کلکتہ میں ایک رسالہ شائع کیا ہے جس میں اردو کے رسم خط سے بحث کی ہے - ان کا خیال ہے کہ زبان کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ رومن رسم خط اختیار کرلیا جائے اور ولسن نے جو طریقہ رائج کرنے کی کوشش کی تھی اس میں بعض ضروری تبدیلیاں

کردی جائیں —

آپ سبھوں کو غالباً معلوم ہوگا کہ ۱۲ مئی سنہ ۱۸۵۷ ع دھلی کالج کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی - اس کے کتب خانے کو مشعلوں کے نذر کردیا گیا تھا اور اس کالج کے نیک دل پرنسپل کو قتل کردیا گیا تھا - مگر خوش قسمتی سے اس کالج کی آمدنی وقف سے تھی جو اب تک موجود ہے - چنانچہ اس وقف کی آمدنی سے چاندنی چوک میں ایک دوسرا کالج قائم کیا گیا ہے جسے ہم پرانے کالج کا قائم مقام تصور کر سکتے ہیں - اس کا نام دھلی انسٹیٹیوٹ رکھا گیا ہے - ابھی اسے قائم ہوئے ایسا زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر اس میں ۴۰۰ طلبہ کے قریب تعلیم پا رہے ہیں - بعض مخیر اشخاص اور گورنمنٹ کی فیاضی کی بدولت اس کالج کے کتب خانہ میں آج تقریباً ۱۲ ہزار کتابیں موجود ہیں - اس کے ساتھہ ایک عجائب گھر بھی قائم کیا جا رہا ہے - چنانچہ وائسرائے لارڈ کیننگ کی سفارش پر اس کی امداد کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی سے دگنی منظور ہوگئی - اس عجائب گھر میں ایک قدم شریف ( پتھر جس پر رسول مقبول کے قدم کا نشان ہے ) ہے - یہ پہلے ایک صندوق میں بند تھا اس صندوق کی نگرانی پر ایک آدمی مامور تھا جسے ۵۰ روپے ماہوار دئے جایا کرتے تھے - ایک قدم حضرۃ فاطمہ ( رض ) کا ہے - دھلی کے آخری بادشاہ کے حمام خانہ کی چوکی ہے - ہندوستان Materia Medica کی مختلف جڑی بوٹیاں یہاں موجود ہیں - ہندوستانی عطریات ' صنعت و حرفت کے نمونے ' سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی بنی ہوی اشیا ' مصوری کے نمونے ' موسیقی کے آلات ' صندل اور ہاتھی دانت کی صندوقچیاں ' زمرد و جواہرات کے تبے ' لکھنو کے سنّی کے کھلونے ' بچوں کے کھلونے اور مثال اور مختلف انوام کے دیسی کپڑے اس عجائب گھر میں ہیں —

کلکتہ یونیورسٹی جس کا اثر پشاور اور کٹک تک ہے آج کل اچھی حالت میں ہے - بمبئی میں جو حال میں یونیورسٹی قائم ہوئی ہے اس کی حالت بھی قابل اطمینان ہے - اس یونیورسٹی کا آخری سندی امتحان گذشتہ ستمبر کے مہینہ میں ہوا تھا - امتحان میں ۱۵ طلبہ نے شرکت کی تھی جن میں سے ۷ کامیاب ہوے - اس امتحان کے نصاب میں Rev .M Mitchell کی اطلاع کے مطابق ' باغ و بہار جس کا میں اپنے ہر خطبے میں عادتاً ذکر کرتا ہوں ' اخلاق ہندی ' جو Hitopades کا اردو ترجمہ ہے ' میرحسن کی مشہور مثنوی سحرالبیان اور دیوان ناسخ شامل تھے - لطف اللہ سورتی جن کی " خود نوشت سوانح عمری " بڑی مقبول ہوئی کہتے ہیں کہ ناسخ اردو زبان کے بہترین شعرا میں سے ہوا ہے —

Haileybwy اور Addisoncombe کی درس گاہوں کے بند ہونے سے میری دانست میں ہندوستانی زبان کے شوق مطالعہ کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا - میں جس زمانہ میں اپنے درس پیرس میں شروع کرتا ہوں اسی زمانہ میں Woolwich کی فوجی اکاڈمی کے طلبہ بھی اپنا اردو کا درس شروع کرتے ہیں - اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی مدرسہ کے طلبہ Woolwich کے مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں - لیکن ان کی تعلیم اور دوسرے طلبہ سے مختلف ہے - چونکہ بعد میں ان کا ارادہ ہندوستان میں فوجی خدمات پر جانے کا ہوتا ہے اس لئے خاص طور پر ان کے لئے علحدہ استاد مقرر کئے جاتے ہیں جو انھیں اردو اور دوسری مشرقی زبانیں سکھاتے ہیں جن کی انھیں آئندہ زندگی میں ضرورت پڑے گی —

ایسٹ انڈیا ہاؤس کا کتب خانہ Board of Control ( بورڈ آف کنٹرول ) کی

عمارتوں میں منتقل ہو چکا ہے - اس کتب خانے میں مشرقی علوم و ادب پر چوبیس ہزار کتابیں موجود ہیں - ان میں ۸ ہزار قلمی نسخے ہیں - میرا خیال ہے کہ ان کتابوں میں اردو کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جس میں مطبوعہ اور قلمی نسخے دونوں شامل ہیں - ان قلمی نسخوں میں قرآن کا وہ مشہور قلمی نسخہ بھی ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے - یہ کوفی خط میں ہے - اس پر متعدد مشرقی بادشاہوں کے دستخط اور ان کی مہریں ثبت ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک بے بہا اور نادر چیز سمجھی جاتی ہے - قرآن کی چند سورتیں حضرت علی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس ذخیرۂ کتب میں ملتی ہیں - اس کے سرورق پر تیمور صاحبقرآن کی مہر ثبت ہے اور شاہجہاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چند سطریں ہیں - ان چند سطروں میں یہ تحریر ہے کہ اس نے تیرہ ہزار مہر میں اس نسخہ کو خریدا -

ایسٹ انڈیا ہاؤس کا عجائب گھر آج کل Fife House میں ہے جو Whitehall Yard میں واقع ہے - اس میں جب داخل ہو جیے تو پہلے کمرہ میں ولنگٹن ' کلایو ' ہسٹنگز اور ان انگریزوں کے مجسمے نصب نظر آتے ہیں جنھوں نے تاریخ ہند میں کارہائے نمایاں کئے ہیں - یہاں ہر کمرے کی ایک خصوصیت ہے - ایک میں ہندوستان کی دھاتیں ہیں' ایک میں سونے چاندی کا کام ہے ' ایک میں ہتھیار جواہرات ہیں ' ایک میں ریشمی کپڑے اور زیورات ' اور ایک میں آلات کشاورزی و جہاز رانی ہیں - ان سب میں سب سے زیادہ دلچسپی اور بصیرت وہاں حاصل ہوتی ہے جہاں ہندوستان کے مختلف نسلوں کے لوگوں کے مجسمے رکھے ہیں - انھیں دیکھ کر ہندوستانیوں کے رسم و رواج کی نسبت معلومات میں اضافہ ہوتا

ہے - اسی طرح ہندوستانی چڑیوں اور مختلف قسم کے جانوروں کی نہایت محنت و احتیاط سے تقسیمیں کی گئی ہیں اور انہیں الگ الگ رکھا گیا ہے - مسٹر الیٹ کے پاس امراوتی کے سونے کے بتوں کے کچھ ٹکڑے تھے وہ بھی یہاں موجود ہیں - یہ بت بدھ مت کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں —

میں سمجھتا ہوں اس جگہ موقع نہیں کہ میں اس عالیشان عمارت کے متعلق کچھ کہوں جو عجائب ہند کے دفتر کے لئے بنائی گئی ہے - اس کا طرز تعمیر غیر گوتھکی اور خالص اطالوی ہے - آج کل ازمنۂ وسطیٰ کے طرز کو پرو ٹسٹنٹ ملکوں میں بھی پسند کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے —

پیرس میں بدستور ہندوستانی برسوں میں لوگ آتے ہیں - یہ سچ ہے کہ تعداد بہت زیادہ نہیں مگر جو آتے ہیں وہ عموماً اعلیٰ تعلیمیافتہ لوگ ہیں - میرے درسوں میں بیرونی ممالک کے مشہور لوگوں میں سے جو بھی کبھی تشریف لاکر مجھے سرفراز فرماتے ہیں ' میں سمیپترلم روپرام کا خاص طور پر ذکر کرونگا - یہ برہمن ہیں اور ساتھ ہی نہایت با اخلاق آدمی ہیں - صوبہ بمبئی میں انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر ممتاز ہیں موصوف قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ویسی تعصبات کی مطلق پروا نہیں کی اور انگلستان کے انتظام تعلیم کی تحقیق کے لئے اتنی دور آئے - ہندوستان جاتے ہوئے وہ پیرس میں کچھ دن ٹھیرے تھے - میں نے سنا ہے کہ جب وہ احمد آباد واپس پہنچے تو تعلیمیافتہ ہندوستانیوں اور اس شہر کے اعلیٰ یورپین طبقے نے ان کے خیر مقدم میں ایک جلسہ منعقد کیا - اس جلسہ میں سفر سے واپسی کی مبارک باد دی گئی ایک دیسی شاعر نے کہا کہ روپ رام کے سفر یورپ نے یہ ثابت کردیا کہ ہندو لوگوں کو سفر کرنے میں جو تین بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا

یعنی اخراجات ' آب و ہوا کی سختی اور اپنے دھرم اور رسوم کی پابندی نہ کرسکنے کا ڈر ' یہ تینوں دشواریاں ایسی نہیں جن پر قابو پانا انسانی امکان سے باہر ہو —

حضرات ! اس خطبے کا خاتمہ میں اس مبارک باد پر کرتا ہوں کہ ہندوستانی واقعی خوش نصیب ہیں ملکہ نے ان کے لئے لارڈ کیننگ کا جانشین جن کا زمانہ حکومت آئندہ ماہ مارچ میں ختم ہورہا ہے ' لارڈ الجن کو وائسرائے منتخب کیا ہے - لارڈ الجن بڑے مشہور مدبر ہیں - موصوف نہایت ہر دل عزیز ہیں اور ہر کوئی ان کی عزت کرتا ہے - موصوف کینڈا اور اور چین میں اپنی ذہانت اور اپنی بلند حوصلگی کا ثبوت دے چکے ہیں - ان کے والد فنون لطیفہ کے بڑے قدردان تھے اور انہوں نے برٹش میوزیم کو بعض نہایت قابل قدر تحفے عطا کئے - اگر موصوف نے انہیں سنیت سنیت کرنا رکھا ہوتا تو ممکن ہے ان میں سے بعض تباہ ہو جاتے - لارڈ الجن کی والدہ اپنے خلوص ' تقوے اور فیاضی میں مشہور ہیں - موصوفہ کی اعلیٰ قابلیت اور علم دوستی کا بھی انگلستان بھر میں چرچا ہے - مجھے اس بات کا فخر ہے کہ موصوفہ میرے کرم فرماؤں میں سے تھیں اور آج تک ان کے الطاف کریمانہ میرے حافظے نے فراموش نہیں کئے - مجھے پوری توقع ہے کہ لارڈ الجن لارڈ بنٹنگ کی طرح ہندوستانیوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کریں گے اور اپنے حسن انتظام اور عدل گستری سے ان کے دلوں کو تسخیر کر لیں گے - مجھے پوری توقع ہے کہ وہ اپنے زمانہ قیام میں ہندوستانی رعایا اور حکومت برطانیہ کے درمیان نہایت خوش گوار تعلقات قایم کردیں گے جس کے سائہ عاطفت میں زندگی بسر کرنا ان کے لئے تقدیر الہی معلوم ہوتی ہے —

# روسی ادب

## پانچواں باب

### روسی شاعری : پارناسی شاعر ' استعاریت اور انقلاب

### اپولون نکو لائی یوچ مائی کوف ( ۱۸۲۱ تا ۱۸۹۷ ))

از

( جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب بی - اے آنرز (آکسن)

پارناسی شاعروں کی طرح مائی کوف قومی زندگی سے اس قدر بے تعلق رہا کہ اس کی اپنی زندگی میں کوئی خاص واقعات نہیں ہیں جو بیان کے لائق ہوں ' اور اس کے ذاتی معاملات معلوم بھی بہت کم ہیں اس کا ارادہ پہلے مصور بننے کا تھا لیکن شاعری کا ذوق اس ارادہ پر غالب آیا - اس نے چودہ سال کی عمر میں اپنی پہلی نظم شائع کی ' اور جس انداز سے اس کا ادبی دنیا میں استقبال کیا گیا وہ نوعمر شاعر کی ہمت افزائی کے لئے بہت کافی تھا - سنہ ۱۸۴۰ م سے اس نے اپنی زندگی شعر و شاعری کے لئے وقف کر دی —

مائی کوف کے کلام پر فرانسیسی شاعر اندرگئے شے فی ئے * اور

---

* فرانسیسی انقلاب کے زمانے کا ایک شاعر ' جس کی غزلیں اور مرثیے مشہور ہیں زبان اور طرز بیان میں اس نے یونانیوں کی تقلید کی ہے ( ۱۷۶۲ - ۱۷۹۴ ) —

کلاسیکی یونانی شعرا کا گہرا اثر پایا جاتا ہے اور اس کے مضامین بھی عموما خالص روسی نہیں ہیں بلکہ یورپ کی تہذیبی اور مذہبی تاریخ سے لئے گئے ہیں ۔ مگر آرٹ کی پرستش اسے اپنے ملک کے حالات سے بالکل بیگانہ نہ رکھہ سکی ' اور اس کے کلام کا رنگ قوم کے عام خیالات کے ساتھہ بدلتا رہا شروع میں وہ خالص " پارناسی " تھا جب سنہ ۱۸۵۵ کے بعد ملک میں ازادی کا چرچا ہوا تو اس کی نظموں میں اس کا عکس نظر آنے لگا اور پھر جب سنہ ۱۸۶۳ کے بعد لبرل تحریک کچھہ کمزور پڑ گئی تو وہ بھی اپنا داس جھاڑ کر آرٹ کے حرم میں رو پوش ہو گیا ۔ اس آخری تغیر سے اس کی شہرت میں بہت فرق آگیا ' ورنہ اس زمانے میں بھی جب دوسرے " پارناسی " شاعر قوم کی بے توجہی دیکھہ کر بالکل خاموش ہو گئے تھے اس کا کلام شوق سے پڑھا جاتا تھا اب اس کے قدردان بہت کم ہیں —

" تین موتیں " اور " دو دنیا " جن میں مائی کوف نے یونانی اور عیسائی تہذیبوں کی جنگ دکھائی ہے ' اور یونانی تہذیب کو اس کے حریف سے بدرجہا بہتر ثابت کیا ہے مائی کوف کا شاہکار مانی جاتی ہیں ۔ رومن کلیسا کی تاریخ پر بھی چند نظمیں ہیں جو روسی شاعری میں کچھہ دیکھنے رکھنے کا درجہ رکھتی ہیں ۔ لیکن مائی کوف نے جب کبھی معاصر روسی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تو اسے بہت ناکامیابی ہوئی ۔ تاریخی نظموں کے علاوہ جو کچھہ ہیں وہ اس کی مختصر نظمیں ہیں ۔ ان میں اس کے تصور کا زور اور اس کی طبیعت کی رنگینی کچھہ نظر آتی ہے اس کی زبان شیریں اور پر ترنم ہے اور اس کی فصاحت کا معیار بہت بلند ہے ۔ ذیل کی نظم میں اس کے کلام کا خاص رنگ کسی قدر ظاہر ہو جائے گا —

## ابابیل

میرا باغ روز بروز کمہلا رہا ہے
ویران ' اجڑا ہوا اور خالی خالی نظر آتا ہے
میرا دل غمگین ہے
خزاں کے سورج کی چمک
درختوں کی جھڑتی ہوئی پتیاں ' شام کے گیتوں کی آواز
طبیعت میں الجھن پیدا کرتی ہے -
جب حسب عادت میری نظر چھت پر پڑتی ہے
تو کھڑکی کے اوپر ایک خالی گھونسلا دکھائی دیتا ہے
اس میں ابابیلوں کی سرگوشیاں نہیں سنائی دیتی ہیں
اس کی گھاس اور تنکے ہوا سے لٹک آئے ہیں...
مگر مجھے یاد ہے کہ اسے بنانے میں -
وہ ابابیلوں نے کیا کیا کوششیں صرف کیں '
تنکوں کو سختی سے کس طرح جوڑ کر مضبوط کیا '
اِدھر اُدھر سے بال اور پر کیسے جمع کرکے لائیں -
اپنا کام وہ کس خوشی سے کرتی تھیں ' کس صفائی سے !
ان کے دل کیسے باغ باغ اتھے جب گھونسلے سے
پانچ ننھے چنچل بچوں نے
سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا
تمام دن ان کی چوں چوں
جیسے ننھے بچوں کی بکواس
اور پھر ایک دن سب کی سب اڑگئیں !

اس دن سے پھر میں نے انہیں بہت کم دیکھا '
ان کا گھونسلا خالی پڑا ہے !
وہ اب کہیں اور اڑ گئی ہیں '
کہیں اور ' یہاں سے بہت دور ...
آہ ' کاش میرے بھی پر ہوتے !

افناسی فی افناس یوچ فیت (۱۸۲۰ - ۱۸۷۲)

اس اصول کا کہ "آرٹ کی غرض آرٹ ہے" فیت سے زیادہ قائل پارناسیوں میں بھی کوئی نہیں تھا ' اسے روس کے سیاسی اور اقتصادی مسائل سے بہت دلچسپی تھی اگرچہ وہ صرف قدامت پسند نہیں بلکہ جدتوں کا جانی دشمن تھا اور اس نے ان مسائل پر متعدد مضامین لکھے - لیکن اس نے اپنی شاعری میں آرٹ کی پرستش کے سوا اور کسی غرض کو شامل نہیں ہونے دیا - سنہ ۱۸۵۵ ع کے بعد نقادوں کی عداوت نے اس کے کلام کی اشاعت روک دی اور فیت نے اس زمانے کی نظموں کا مجموعہ ۱۸۸۵ ع تک نہیں شایع کیا ' اس وقت ادب پر سے مبلغوں اور مصلحوں کا اثر جاتا رہا تھا —

فیت کے کلام کی خاص صفت اس کے احساسات کی نزاکت ہے اس میں تخیل کی کوئی خوبی ندرت یا گہرائی نہیں ' صرف الفاظ اور تر نم کی پیدا کی ہوئی ایک کیفیت ہوتی ہے جو جذبات میں گدگدی سی پیدا کرتی ہے - مجموعی حیثیت سے فیت کے کلام میں یکرنگی محسوس ہوتی ہے ' اس لئے کہ نازک احساسات کے سوا اس نے انسانی جذبات کے کسی اور پہلو کو اپنی شاعرانہ توجہ کے لائق نہیں سمجھا ذیل کی نظم کا فیت کے مخالفوں نے بہت مذاق اڑایا تھا اس لئے کہ اس میں اول سے آخر تک کوئی فعل نہیں ہے —

زیر آواز - دبی سانسیں :
بلبل کے لہرے -
دریا کی چاندی جیسی چمک '
اس کی جھومتی چال -
رات کی دھیمی روشنی - دھندلی تاریکی کا سمندر —
تاریکی کا بے پایاں سمندر -
ایک محبوب چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیتیں
مسحور کن ادائیں
دھوئیں جیسے بادلوں میں کہیں ارغوانی رنگ
کہیں کہربا کی جھلک '
پیار ' پیار اور آنسو —
اور آفتاب کا طلوع ! ...
اسی انداز کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو
میں تجھے مبارکباد دینے آیا ہوں —
یہ کہنے کہ سورج نکل آیا ہے
اور اس کی گرم ' روشن کرنیں
پتیوں پر کانپ رہی ہیں ؛
یہ کہنے کہ جنگل جاگ اٹھا ہے
سارے کا سارا جاگ اٹھا ہے ' اس کی ہر شاخ
ہر چڑیا چونک پڑی ہے '
اور وہ بہار کی آرزوؤں سے بھرا ہے ...
یہ کہنے کہ کل کی سی امیدیں اور جوش لے کر

میں پھر تیرے پاس آیا ہوں
میرا دل اسی طرح مسرت کا ،
اور تیری خدمت کرنے کا آرزو مند ہے
یہ کہنے کہ ہر طرف سے میرے پاس
شادمانی کا پیغام آرہا ہے ،
یہ کہنے کہ میرا دل نغمہ سرائی پر تلا ہوا ہے
مگر معلوم نہیں میں گاؤں گا یا نہیں ...

یا کوت پتر ووچ پولون سکی ( سنہ ۱۸۱۹ ع - سنہ ۱۸۹۸ ع )

فیت اور مائی کوف کے مقابلہ میں پولون سکی کے مضامین کا میدان بہت وسیع ہے اور و عام زندگی سے بہت زیادہ وابستہ ہے ، اس کے احساسات میں بھی اتنی نزاکت نہیں کہ وہ معمولی انسان کی عقل اور سمجھ کو عاجز کردیں - اس نے عوام کے طرز پر چند نظمیں لکھی ہیں جو ادبی نقطہ نظر سے قابل قدر تو نہیں ہیں مگر ان میں کچھ ایسی سادگی ہے اور ان کی زبان اتنی سہل کہ وہ ایک زمانہ میں بچے بچے کو یاد ہوا کرتی تھیں اس کے کلام میں ظرافت بھی پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ایک فلسفہ حیات جو بہت گہرا نہیں ہے مگر اوسط درج کے تعلیم یافتہ لوگ اس سے نہایت درجہ مرعوب ہوتے ہیں - پولون سکی روس کی سیاسی فرقہ بندیوں سے ہمیشہ الگ رہا اس لئے اسے نقادوں کی عداوت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اس کے کلام کی اشاعت میں کوئی دشواری یا رکاوٹ نہیں ہوئی مگر اعلیٰ ادبی مذاق کے لوگوں میں اسے بہت کم قدرداں ملے ہیں - اُسے وہی لوگ پسند کرتے ہیں جن کی علمی بساط کم ہے ، اور جو شاعری کے ذریعہ سے اپنے جذبات اور خیالات

میں ذرا سا ہیجان یا ہلکا سا سرور پیدا کرنا چاہتے ہیں پولون سکی کی سب سے مشہور نظم " موسیقی کے شوقین تندے " کا قصہ ہے جو کسی بلبل کا گانا سن کر اس پر عاشق ہوگیا اور ملاقات کے شوق میں اُس کا دل تڑپنے لگا - بڑی تمناؤں کے بعد آخر کار اُسے دیدار کا شرف حاصل ہوا ' لیکن بلبل اُسے دیکھتے ہی کھا گیا - اس نظم کے علاوہ پولون سکی نے ,, پارناسی " طرز کے مطابق مختصر نظمیں بھی لکھی ہیں جن سے بعض بعض ہر لحاظ سے بہت اچھی ہیں مگر یہ اعلیٰ نمونے اس کے کلام میں صرف گاہے گاہے نظر آتے ہیں · اس کی بہترین نظموں میں سے ایک کا ترجمہ دیا جاتا ہے --

## گزرا ہوا زمانہ

مجھے یاد ہیں وہ بچپن کے دن ' جب ہمارے گالوں پر پھول کی سی سرخی تھی '
ہم تم بھر بھرے برف پر کھیلتے پھرتے تھے '
اور سردی ایک بوڑھی عورت کی طرح اپنے ہاتھوں سے '
ہمیں پیار کرتی اور پھر اپنی بیساکھی سے آگ کے پاس بھگا دیتی '
شام کے اندھیرے میں تمہاری آنکھیں چمکتی تھیں '
آتش دان کی چنگاری تمہاری صورت دیکھا کرتی تھی '
اور بوڑھی کھلائی ہمیں کہانیاں سناتی تھی '
ایک بے وقوف کی جو کسی زمانہ میں تھا '
لیکن وہ جاڑا بہار کی طرح مسکراتا ہوا چل دیا '
گرمیاں بھی گذر گئیں - اور اب خزاں کے طوفان کا شور سن کر
ایک اور جاڑا آرہا ہے ' بالکل دوسری طرح کا '
ایک بے حس جاڑا ' اور وہ بھی اپنی بیساکھی سے ڈرا رہا ہے ...

ہماری کھلائی پیر پھیلائے سو رہی ہے '
قبر میں آرام کر رہی ہے ' اور یہ بھی نہیں دیکھتی
کہ تم تھک کر میرے سینے سے چپٹ گئی ہو '
گویا سن رہی ہو کہ میرا دل کیا کہتا ہے -
لیکن کھلائی کی طرح میرا دل بھی آج پیار سے
متاثر نہیں ہوتا ' وہ چنگاری بجھ گئی ہے
اور میرا دل تمہیں کہانیاں سنا رہا ہے
ایک بے وقوف کی جو کسی زمانہ میں تھا -

---

سنہ ۱۸۵۵ ع سے سنہ ۱۸۶۳ ع کے سیاسی جوش کے رفتہ رفتہ ٹھنڈے ہونے کے ساتھ ہی روسی شاعری کا معیار گرتا گیا ، اس میں نہ فن کی وہ خوبیاں رہیں نہ تخیل کی وہ بلند پروازیاں جو پشکن ' لیرمنتوف اور جوکوفسکی کے کلام میں پائی جاتی ہیں - نکرا سوف نے مضامین میں بہت جدت پیدا کی اور اگر اسے اچھے پیرو ملتے تو ممکن ہے روسی شاعری کا باغ پھر سرسبز اور شاداب ہو جاتا ' اور اس میں نئے نئے پھول کھلتے - لیکن افسوس ہے ایسا نہ ہوا ، اور جب تک کہ صدی کے آخری سالوں میں ' استعاریت ' نے نئے باغبان نہیں پیدا کئے روسی شاعری کا باغ ویران ہوتا گیا - سم یون یا کوف لے وچ فاد سون ( ۱۸۶۴ - سنہ ۱۸۸۷ ) ' الک سے ئی نکولایے وچ اپوخ تن ( سنہ ۱۸۴۱ ع - سنہ ۱۸۹۳ ع ) کونس تان تن کونس تان تی نووچ سلوچیف سکی ( سنہ ۱۸۴۴ ع - ۱۹۳۰ ع - اور ولا جیمر سرگے یوچ سولوف یوف ( سنہ ۱۸۵۳ - سنہ ۱۹۰۰ ع ) کی شاعری میں اس دور کے تمام ذہنی اور فنی نقائص

نظر آتے ہیں - ناولوں نے بہت شہرت حاصل کی ، اور غالبا اس کے کلام سے زیادہ اشاعت اور ہر دلعزیزی اس دور کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی ، لیکن نقاد اس کی مقبولیت کو محض عام مذاق کی پستی کی ایک علامت مانتے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ناولوں کی شاعری میں لفاظی کے سوا کچھ نہیں ، اور اس کے خیالات بھی جو کچھ ہیں وہ ذہن اور تصور کی بیماری کی دلیل ہیں - اپوخ تن کے کلام میں پھر بھی زیادہ جان ہے ، لیکن اس میں ایک دوسرے طریقے پر ظاہر ہوتا ہے کہ روسی قوم میں انحطاط کی کیفیت تھی - اپوخ تن کی نظمیں روس کے جپسی گوئیوں کی زبانی بہت سننے میں آتی ہیں اور ان جپسی گوئیوں کا کام عموما میخانوں میں لوگوں کو مست کرنا اور عیاشی میں چٹپٹا پن پیدا کرنا تھا - سلوچیف سکی اور سونوت یوت پر اس قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا ، لیکن ان دونوں میں فنی خامیاں بہت ہیں اور تخیل کی کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی - ان چاروں شاعروں کی یادگار بس اسی وجہ سے قائم ہے کہ ان کے دور میں ان سے بہتر کوئی اور شاعر نہیں تھا ، یہ "کلاسیکی" اور "استعاری" دوروں کی درمیانی کڑی ہیں —

استعاریت اس عام ذہنی ہیجان کا ایک پہلو اور اس کی ایک پیداوار تھی جو انیسویں صدی کے آخر میں نظر آتا ہے اور جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مہذب اور منظم ہونے کے باوجود روسی قوم اپنی سیاسی اور سماجی زندگی میں جان نہیں پھونک سکی تھی - ہر طرف خانہ ساز خیالات کا فروغ تھا ، ہر روشن خیال آدمی اپنا فلسفہ حیات بناتا قومی

اصلاح اور نئی زندگی کی تعمیر کی تدبیریں سوچتا، کلیسا، مذہب، حضرت عیسیٰ کی شخصیت، ریاست پرستی، زار پرستی، قوم پرستی، یورپ پرستی ان سب کے معتقد اور مبلغ تھے، مگر سب یکساں ناکامیاب رہے اور وہم و گمان کے جال میں گرفتار ہو گئے۔ نکراسوف کے بعد سے سنہ ۱۹۰۵ ع کے انقلاب تک شاعری کا عام سیاسی اور سماجی زندگی سے بس اتنا تعلق تھا کہ بعض ناءسون جیسے شاعروں نے قومی خدمت کی امنگوں کو نظم کا جامہ پہنایا، لیکن یہ زمانہ ایسے انحطاط کا تھا کہ ان شاعروں کے کلام میں نہ سلاف دوستی کے اعلیٰ جذبے نظر آتے ہیں، نہ قومیت کے بلند و لولے۔ استعاریت کی تحریک روسی شاعری کو نئے اسالیب کے ذریعہ سے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش تھی اس کا سلسلہ نسب فرانسیسی شاعری کی ہم نام تحریک سے ملتا ہے، لیکن روسی استعاریت پسند شاعروں نے اپنے استادوں کی زیادہ پیروی نہیں کی، اور دراصل ان سے سیکھا بھی بہت کم۔ امریکن شاعر ایڈگر ایلن پو (۱۸۴۹ ع - ۱۸۰۹ ع) اور جرمن فلسفی اور شاعر گوئٹے کا اُن پر فرانسیسی استعاریت پسند شاعروں سے بہت زیادہ اثر تھا —

فرانسیسی شاعر بودیلیر (۱۸۲۱ - ۱۸۶۷) کا ایک مصرعہ جس میں کائنات "استعاروں کا ایک جنگل" بتائی گئی ہے اور جرمن شاعر گوئٹے کا ایک شعر کہ "سب فانی چیزیں محض مجازی نقوش ہیں" استعاریت کے فلسفے کی بنیاد ہیں استعارے اور مجازی نقوش جس حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں اس کی جستجو اور اس کے دیدار کا اشتیاق روسی استعاریت پسند شاعروں کا محرک، ان کا "جنون" اور "سودا" تھا — انہوں نے اپنے فرانسیسی استادوں کی طرح اسے صرف ایک شاعرانہ انداز، اور نظم میں جدت اور انوکھاپن پیدا کرنے کا ایک بہانہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک

مکمل فلسفہ حیات کی صورت دیدی اور اس سے وہ روحانی غذا حاصل کرنے لگے جو ان کا مذہب اور کلیسا فراہم کرنے سے معذور تھا یوں گو استعاریت شروع میں ایک مغربی چیز تھی اور مغربی رنگ میں ڈوبی ہوئی روس میں اس نے بہت جلد روسی بھیس اختیار کرلیا ' اپنا نسب بھول گئی اور روس کے گذشتہ ذہنی رہبروں ' خصوصاً دستہ ٹف سکی سے بہت گہرا رشتہ قائم کر لیا - اس رشتے کے قائم ہونے سے روسی ادب کو سراسر فائدہ ہوا ' انحطاط کے زمانہ میں روسی ادبی مشاہیر کی طرف سے جو غفلت برتی جاتی تھی اس کے بجائے انھیں سمجھنے کا ایک نیا شوق پیدا ہو گیا ' ان کے فلسفہ پر غور کرنے کی ضرورت ہونے لگی ' اور جیسے کوئی گہری نیند سے چونک کر سونے سے پہلے کے واقعات یاد کرتا ہے اور انھیں اپنی زندگی کا ایک ضروری حصہ سمجھنے لگتا ہے ' انحطاط کے بعد استعاریت پسندی کے ذریعہ سے روسی ذہن نے بیدار ہوکر اپنی ذہنی جدوجہد کے ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو پھر جوڑ دیا ' اپنی ذہنی دولت کو یوں بہت بڑھا دیا - اس کی سب سے روشن دلیل یہ ہے کہ روس کے استعاریت پسند شاعر آزاد خیال ' بلند حوصلہ ' اپنے دیس اور اپنی قوم کے سچے اور گہرے دوست اور خیرخواہ تھے - سیاسی تحریکوں میں ان میں سے کوئی شریک نہیں ہوا ' لیکن ۱۹۰۵ کے انقلاب میں انھوں نے دکھا دیا کہ وہ جابرانہ حکومت کے دشمن اور ہر تحریک کے حامی ہیں جس کا مقصد روس کی آزادی اور بہبودی ہو —

استعاریت پسند شاعروں کے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جمالیات پر تصوف اور فلسفے کا رنگ چڑھانا چاہا ' اور اپنے جذبات کو لفسانیت اور مجاز پرستی سے بڑی حد تک پاک رکھا - عشق کو وہ ایک خالص روحانی

کیفیت کی صورت میں پیش کرتے ہیں' جس کی پاکی اور صفائی پر انسان کے حرکش' نفس پرست جذبات دھبے لگاتے رہتے ہیں' حسن ان کی نظروں میں ایک جلوہ ہے جس کے دیدار سے انسان محروم رہتا ہے' کیونکہ وہ ہوس اور شہوت کا بندہ ہے۔ لیکن یہ شاعر مذہبیت کے یا تو قائل نہیں یا اس سے نا آشنا ہیں' اور ان کی روحانیت کو تصوف کا ہم معنی نہ سمجھنا چاہئے کائنات' دنیا اور دنیاوی زندگی استعارے ہیں' حقیقت نہیں' "استعاروں کے جنگل میں" بھٹکتے پھرنا انسان کے شایان شان نہیں' بس اسی کو جتا کر استعاریت کا فلسفہ ختم ہو جاتا ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ انسان کی گمراہی پر افسوس' تمناؤں کی بیکسی کا گلہ ہے اور سرد آہیں اور آنسو۔ نامسون اور اپونن تن کے بعد شعر و شاعری کا ایسا موضوع اختیار کرنا بہت قابل قدر جدت تھی' اور اس کے ساتھ ہی استعاریت پسند شاعروں نے اپنے کلام کو فنی حیثیت سے بھی اس درجۂ کمال تک پہنچایا جو پشکن کے عہد کے سوا روسی شاعری کو کبھی نہیں نصیب ہوا تھا۔ یہ خاص طور سے تعریف کی بات ہے' کیونکہ ان شاعروں نے نئے مضامین نئے طرز پر ادا کئے' اور ایسے ادبی انقلابوں کے ہراولوں میں عموماً فنی خامیاں اس کثرت سے ہوتی ہیں کہ اہل ذوق کو ان کی جدتیں تسلیم کرنے میں بہت تامل ہوتا ہے —

استعاریت پسند شاعروں کی تیسری خصوصیت ان کی زبان اور الفاظ کا انوکھا استعمال ہے۔ وہ زبان کو محض خیالات ادا کرنے کا آلہ نہیں سمجھتے' بلکہ کیفیات اور فضا پیدا کرنے کا ذریعہ بھی' اور یوں وہ الفاظ کے معنی سے زیادہ ان کی آواز کی تاثیر کو توجہ کے لائق فرض کرتے' بحر اور قافیہ اور الفاظ کے ارکان کی اونچ نیچ سے وہی کام نکالنا چاہتے ہیں جو

گوئیے سروں سے جو زبان اور الفاظ بھی ان کے نزدیک استعارے ہیں جن کے توسط سے جذبات کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے ' اور چونکہ جذبات کا تعلق صرف انسان کے ذہن سے نہیں بلکہ اس کی ہستی سے ہے ' اس لئے وہ جذبات کے ادا کرنے میں شاعر کے لئے ایسا طرز اختیار کرنا لازم قرار دیتے ہیں جس میں تصویروں کے رنگ ہوں اور موسیقی کے سر اور تال کے بھاؤ - ظاہر ہے یہ معیار کس قدر بلند اور مشکل ہے اور کوئی تعجب نہیں استعاریت پسند شاعروں کے کلام کا اکثر حصہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا ' کبھی آواز کی تاثیر پیدا کرنے کی کوشش میں معنی خبط ہو جاتے ہیں ' کبھی کیفیت اور فضا کے چکر میں شاعر اپنے مطلب اور مقصد بھول جاتا ہے - پڑھنے والے کو بھی اپنا فرض ادا کرنے میں بہت دشواریاں ہوتی ہیں ' اور اگر استعاریت کے قدر دانوں میں ہلکے سرور اور ذرا ذرا سی گد گدی کا خاص شوق نہ ہوتا ' اگر وہ نظم میں معنی اور مطلب اور فلسفے کی جگہ آوازوں کی خوش گوار گونج اور اس کیفیت کے جو موسیقی کے سروں سے چھا جاتی ہے خواہش مند نہ ہوتے ' تو ممکن ہے استعاریت ہر دلعزیزی اور شہرت سے محروم رہتی - لیکن استعاریت پسند شاعروں کے ہنر ان کے عیبوں کو نظر سے چھپا دیتے ہیں - ان کے کلام کے اعلیٰ نمونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تخیل صرف بلند اور پاک نہیں ' وہ اپنی زبان کے سب جوہر پہچانتے ہیں ' اس کے ہر رنگ سے واقف ہیں ' اور اس پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ نازک سے نازک احساس اور نادر سے نادر کیفیت انتہائی سہولیت اور صفائی سے بیان کرسکیں ' الفاظ کی جانچ پرتال اور انتخاب میں وہ ویسے ہی ماہر ہیں جیسے مئے فروش شرابوں کا مزہ پہچاننے ' یا جوہری نگینوں کے

پر کہنے' یا سچا گویا اپنے راگ کو اور گیت کو خارجی فضا سے موزوں کرنے میں' اپنے علم و ہنر کا کمال دکھانا بھی خوب آتا ہے —

استعاریت کا پیش خیمہ دلاجیمر سولوفیوف اور دمیتری مرژ کوفسکی کا کلام تھا' لیکن اپنی اصل صورت میں وہ اس مجموعہ میں نظر آئی جو سنہ ۱۸۹۴ ع میں بال مونت ( پیدایش سنہ ۱۸۶۷ ع ) اور بر یوسوف ( سنہ ۱۹۲۴ - سنہ ۱۸۷۳ ع ) نے " روسی استعاریت پسند " کے عنوان سے شائع کیا - اُسی کے ساتھ ہی بال مونت نے اپنے کلام کا ایک مجموعہ بھی ناظرین کے سامنے پیش کیا - روسی نقاد ان جدتوں کو تسلیم کرنے پر نہیں تیار تھے جو ان نظموں میں اختیار کی گئی تھیں' اور استعاریت پسندوں پر اعتراضوں اور تضحیک کی بوچھار ہونے لگی - مگر وہ ہمت نہیں ہارے اور بیسویں صدی کے شروع تک وہ روسی مذاق پر حاوی ہوچکے تھے سنہ ۱۹۰۵ ع کے انقلاب نے انہیں ہر طبقے میں ہر دلعزیز بنا دیا اور اس کے بعد سے دس سال تک میدان سخن میں انہیں کا راج رہا ان میں سے اکثر کو سنہ ۱۹۱۷ ع کے انقلاب کا منظر دیکھنا بھی نصیب ہوا' اور جس صدق دل اور خلوص اور جوش سے انہوں نے اُس نئی زندگی کا استقبال کیا جس کی امید انہیں انقلاب کے بھونچال اور زلزلے دلا رہے تھے' وہ ان کی بیدار دلی' قوم پرستی اور قوم کے مستقبل میں شاعرانہ عقیدت کو بہت سبق آموز بنا دیتی ہے' اور ان کے کلام کی وقعت ہماری نظروں میں اور بھی بڑھا دیتی ہے —

بال مونت اور بر یوسوف کے کلام پر مغربی' یعنی فرانسیسی اور انگریزی اثرات غالب ہیں' اور ان کی زبان میں نہ وہ فصاحت ہے اور نہ وہ ترنم جو استعاریت پسند شاعروں کا معمول تھا - بال مونت فطرتاً شاعر تھا' مگر اس نے

زبان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی' بریوسوف نے محنت اور مشق سے زبان میں پختگی اور لوچ پیدا کر لیا لیکن اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ذہن اور تخیل ایک سچے اور اعلیٰ شاعر کا نہیں تھا۔ بال مونت کے عروج کا زمانہ انیسویں صدی کے آخری سال تھے' اور گو اس کے بعد بھی وہ ہر سال اپنی نظموں کے مجموعہ شایع کرتا رہا ہے' اس کا بعد کا کلام بالکل بے رس ہے۔ سنہ ۱۹۱۷ ع میں اس نے بولشوک انقلاب کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فرانس میں جابسا۔ بریوسوف کو شہرت سنہ ۱۹۰۵ کے انقلاب میں حاصل ہوئی' جب اس نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ جس کا عنوان "ستے فانوس" تھا شائع کیا۔ اسے سیاسی معاملات سے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی' صرف اس کا شاعرانہ خیال تھا کہ

"مرکز حسن ہے مشرقی بادشاہ اسارھدؤن کی قوت اور شان کا جلوہ رعب دار ہے وہ منظر جب ایک بپھری قوم کا غصہ بادشاہ کے لڑکھڑاتے تخت پر طوفانی موجوں کی طرح تھپیڑیں مارتا ہے' مگر قابل نفرت ہیں درمیانی کیفیتیں۔"

طوفان کے شوق نے بریوسوف کو سنہ ۱۹۱۷ ع کے انقلاب کا بھی ہمدرد بنادیا۔ لیکن اس کے کلام سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ اسے روس یا اشتمالیت سے واقعی کوئی روحانی تعلق تھا۔ آخر عمر میں اس کی سب سے قابل قدر خصمت تھی "مزدور" شاعروں کو اپنے فن میں تعلیم دینا۔ جس کا وہ شعر کہنے سے زیادہ اہل تھا۔

بال مونت کی ایک نظم جس کا موضوع ڈاکٹر اقبال کی "تنہائی" سے بہت ملتا جلتا ہے ترجمہ کی جاتی ہے:

"میں نے آزاد ہوا سے پوچھا

کہ جوانی کا راز کیا ہے ؟
ہوا نے کھیلتے کھیلتے جواب دیا :
" قید صورت سے نجات حاصل کرنا ، جیسے ہوا اور دھواں ! "
میں نے صاحب حشمت سمندر سے پوچھا
کہ زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد کیا ہے ؟
سمندر نے اپنے راگوں میں جواب دیا :
" ہمیشہ میری طرح محو فریاد رہنا ! "
میں نے آسمان کے بادشاہ ، آفتاب سے پوچھا
کہ وہ چمک کیسے حاصل ہوگی جو صبح کو شرمندہ کرے ؟
آفتاب نے کوئی جواب نہیں دیا ،
مگر میرے دل میں کہیں سے آواز آئی : " جلنے سے ! "

پال مونت اور بریوسوف ہراول تھے ، جو استعاریت پسند شاعری کے بعد میدان میں آئے انہوں نے استعاری شاعری سے بڑی حد تک وہ فنی خامیاں دور کردیں جو ان دونوں کے کلام میں پائی جاتی ہیں، استعاریت کو مغرب کی رہنمائی سے بے نیاز کرکے اسے ایک خالص روسی ذہنی تحریک بنا دیا ، الفاظ اور طرز بیان خود ایک معیار ہونے کے بجائے شاعر کے فلسفۂ حیات اور نظام کے موضوع کے ماتحت کر دئے گئے ، گو ان کی استعاری اہمیت صرف قائم نہیں رہی بلکہ اور بڑھ گئی ۔ ۱۵۱ان کونف سکوئی ( سنہ ۱۸۷۷ ع - سنہ ۱۹۰۱ ع ) ایک بہت ہونہار شاعر جو عین جوانی میں ڈوب کر مرگیا ، الک سانڈر میخا ئلووچ ڈوبر ژلیوبوف ، ( پیدائش سنہ ۱۸۷۶ ع ) ایک بہت ہی سنکی اور مزاقی آدمی جو لاپتہ پھرا کرتا ہے اور اب معلوم نہیں زندہ ہے یا نہیں اور ہے تو

کہاں ہے ' سرژ کوت سکی کی بیوی ' زنئیدا نکو لائفنا ہپي وس ( پیدائش سنہ ۱۸۶۷ م ) یہ تینوں استعاریت پسندوں میں فلسفیانہ طرز کے شاعر مانے جاتے ہیں اور ان کے کلام میں کائنات اور انسانی زندگی کے معمہ حل کرنے کی ایک بہت گرم آرزو پائي جاتی ہے - اِنو کنتی فیودوروویچ آنن سکی (سنہ۱۸۵۶ م) سنہ۱۹۰۹ م ) کے کلام میں استعاریت کا انداز خالص شاعرانہ ہے ' لیکن پس منظر میں وہي مسائل ہیں جن پر فلسفیانہ رجحان کے استعاریت پسند محو رہتے ہیں - ناول نویس فیودوروسو لوگب (پیدائش سنہ ۱۸۶۳ م) نے اپنا ایک جمالیات اور اخلاق کا انوکھا فلسفہ گھڑا ہے ' لیکن ذیل کی نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فلسفہ میں بھی وہ گہرے خیالات رکھتا ہے اور انہیں ادا بھی خوب کرتا ہے :

اس سے محبت کیوں کر ' دنیا تری محبت کی
سزاوار نہیں -
اس کے اوپر سے گذرجا ' شہاب ثاقب کی طرح
تیزی سے —
اس کی سرد فضا میں ایک لمحہ کے لئے
چمک اُٹھو ' —
ایک دم بھر ایمان و عقیدت کی مشعل بن ·
اور ڈل ہوجا - —

ویاچلات اِوانوف ( پیدائش سنہ ۱۸۶۶ م) اور الک سانڈروویچ بلوک (سنہ۱۸۸۰ م۱۹۲۱ م) استعاریت پسند شاعروں کے سر تاج مانے جاتے ہیں اور انہیں کے کلام میں استعاریت اپنی پوری شان میں نظر آتی ہے - اِوانوف پیٹرسبرگ کے حلقے بلوک ماسکو کے گروہ کا سردار تھا ' اور دونوں اپنے طرز میں یکتا ہیں —

اوانوف نے سنہ ۱۹۰۳ م میں اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع

لیا - گو اس کا کلام استعاریت پسندوں کے عام طرز سے بہت مختلف تھا، لیکن ان لوگوں نے اس کی شاعری کی عظمت اور اس میں استعاریت کا خاص رنگ محسوس کیا، اور اوانوت کو اپنے حلقے میں شامل کرلیا، اوانوت کی شخصیت ایسی قوی تھی، اس کے علم کا سرمایا ایسا زبردست کہ وہ بہت جلد سب پر حاوی ہوگیا، اور سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک پیترزبرگ کے شاعروں کا بے تاج کا بادشاہ رہا - اس کا مکان شاعروں کا مرجع تھا، اور ہر ہفتہ کی رات کو وہاں مجلسیں ہوا کرتی تھیں جن میں لوگ دوسرے دن صبح تک نظمیں سنتے اور سناتے، یا مذہب اور تصوف کے مسائل پر بحث مباحثہ کیا کرتے تھے - سنہ ۱۹۱۲ء میں کسی وجہ سے ان دوستوں میں جو یہاں جمع ہوا کرتے تھے، پھوٹ پڑگئی، اوانوت روس چھوڑ کر یورپ چلا گیا، اور جب واپس ہوا تو پیترزبرگ کے بجائے ماسکو میں سکونت اختیار کی - بولشویک انقلاب کے وقت اس نے وہ جوش نہیں دکھایا جو سنہ ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں، مگر پھر بھی وہ بولشویکوں کا حامی تھا اور اس نے خانہ جنگی کے زمانہ کی (سنہ ۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۹۲۱ء) ساری مصیبتیں خاموشی سے برداشت کیں - سنہ ۱۹۲۱ء میں وہ آزربائجان کے نئے قائم کردہ دارالعلوم میں قدیم یونانی زبان اور ادب کا پروفیسر مقرر ہوا اور وہاں تین سال کام کیا، ماسکو واپس ہونے پر بھی اس کے تعلقات بولشویک حکام سے بہت اچھے رہے —

اوانوت نے "دل سوزاں" کے عنوان سے اپنی نظموں کا دوسرا مجموعہ سنہ ۱۹۱۱ء میں شائع کیا اور یہ اس کے کلام کا عروج تھا - "جاڑے کے گیت" جو اس نے سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع کئے، صرف اس کے ادبی ذوق کی شدت نہیں دکھاتے، بلکہ اس کے کلام کا ایک دوسرا رنگ بھی،

جو چند لحاظ سے " دل سوزاں " کے جواہر ریزوں سے بھی بہتر ہے - اسی سال کا ایک اور کارنامہ " گوشوں کے درمیان خط و کتابت ' ہے جس میں اوانوف اور اس کے دوست گرشن زون کی اس زمانہ کی گفتگو ہے - جب دونوں ہسپتال میں بیمار پڑے تھے ' یہ کمرے کے ایک گوشے میں ' وہ دوسرے میں گرشن زون کی آرزو ہے کہ دنیا سے گذشتہ زندگی کے تمام آثار مٹ جائیں ' اور ایک نیا انسان " ننگا " آزاد ' زندگی کی تعمیر نئے سرے سے شروع کرے - اوانوف انسان کی حاصل کردہ تہذیبی اور اخلاقی دولت کو محفوظ رکھنے کا قائل ہے ' اور انسان کی گذشتہ ذہنی جد و جہد کی بہت محبت ' عقیدت اور جوش سے حمایت کرتا ہے ایسی صورت میں جب دن کو بھوک ستاتی ہو اور رات کو جاڑا ' نظمیں لکھنا اور تمدن اور تہذیب کے گن گانا انتہائی شوق اور محویت کی دلیل ہے ' اور اوانوف کے لئے یہ اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ وہ ساری عمر علم اور ادب میں ڈوبا رہے - اسے قدیم یونانی ادب سے بہت گہرا روحانی تعلق تھا ' اور اس نے جدید روسی ذہنیت پر قدیم یونانی فلسفے اور احساسات کی قلم جس صفائی اور کامیابی سے لگائی وہ واقعی حیرت انگیز ہے - اپنی نظموں میں اس نے اکثر یونانی محاورے استعمال کرکے ایک عجیب شوکت پیدا کردی ' اپنی مذہبیت کے مایوس چہرے میں قدیم یونانی رند مشربی کے پریشان بال اس طرح کھپائے کہ ایک ہی صورت معلوم ہوتی ہے ' اور وہ بھی حسن اور ادا کا کرشمہ - اس کی نظمیں بہت مشکل ہیں ' اس کے خیالات کی باریکیاں پورے طور سے سمجھنے کے لئے یونانی اور روسی ادب اور مذہب اور فلسفۂ حیات سے گہری واقفیت درکار ہے ' لیکن جو یہ استعداد نہیں رکھتے وہ اس کی زبان کے ترنم اور شیرینی کی لذت اٹھا سکتے ہیں ' اور اس کی

ان کیفیتوں سے جن میں علمی اور تہذیبی نکتہ سنجی نہیں ' اور جو دراصل اس کے کلام کا بہترین حصہ ہیں ' اس شراب کا مزہ چکھہ سکتے ہیں جس کے نشے میں شاعر خود چور رہتا تھا - اوانوت کا کلام کچھہ اس وجہ سے بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں معاصر روسی ذہنیت کا تقاضا کہ ہر شاعر اور ادیب کا اپنا فلسفہ بھی ہونا چاہئے پوار کیا گیا ہے ' اور چونکہ شاعر کی طبیعت وہ پابندیاں نہیں منظور کر سکتی جو کسی خاص نظام فلسفہ یا مذہبی عقیدے کے مبلغوں پر لازم ہے ' اس لئے کوشش سے ان کے کلام میں خواہ مخواہ الجھاؤ اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے —

اوانوت نے سنہ ۱۹۱۵ ع کے انقلاب میں دستہ ئف سکی کے مشہور کیرکٹر اوان کرمازوت کے طرز پر انکار اور بغاوت کا فلسفہ اختیار کیا اور اس کی تعلیم دی کہ انسان کو تمام خارجی پابندیوں اور رکاوٹوں سے آزاد کرنا چاہئے - اس تخیل کا نام اس نے ,, صوفیانہ نراج " رکھا تھا ' انقلاب کی تحریک دب جانے کے بعد ,, صوفیانہ نراج " سے اوانوت کو زیادہ عقیدت نہیں رہی ' اور پیتر برگ کے اشتعاریت پسندوں کی رہبری کے زمانے میں اس نے ایک نیا فلسفہ اس بنا پر تعمیر کیا کہ آرٹ بھی ایک قسم کا مذہب اور تصوف ہے ' اور اس کا معیار مذہبی اور صوفیانہ ہونا چاہئے - لیکن اس حالت میں جب کہ مذہب اور تصوف خود تعریف اور تعین کے محتاج ہوں اس قسم کے عقیدے بالکل آبے معنی ہیں اور یہ نہ اوانوت کے ذہن میں کوئی مستقل صورت اختیار کرسکے نہ اس کے چیلوں کے ذہن میں - اوانوت کے کلام میں جو شخصیت ظاہر ہوتی ہے وہ آزاد ہے ' نکتہ چین ہے ' کبھی کبھی ہاکی بھی

ہوجاتی ہے ' اپنے احساسات اس متانت اور شوکت سے ادا کرتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اسے مذہب اور تصرت کی سرپرستی بالکل درکار نہیں ' اور اس کے نغموں میں ایک سرور ہے جس کی تاثیر میں عقیدے کی موافقت اور مخالفت سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا —

اوانرت کی نظموں کا ترجمہ کرنا دراصل ان کی توہین کرنا ہے کیونکہ زبان کا ترنم اور الفاظ کے انتخاب کی باریکیاں جو اس کی نظموں کا خاص زیور ہیں ترجمے میں کسی طرح ظاہر نہیں ہوسکتیں ' اور اس کے خیالات اگر ان خاص الفاظ سے کر دئے جائیں جن سے آراستہ کرکے اوانرت نے انہیں پیش کیا ہے تو ان کی صورت بہت بگڑ جاتی ہے - تاہم ایک دو نظموں کا ترجمہ دیا جاتا ہے —

یونانی عشق کے دیوتا ایروس کی شان میں ایک گیت ہے جس کے آخر میں شاعر کہتا ہے —

تیرے تیر کا زخم کھاتے ہی
میں تیری تیر اندازی کا محرم راز بن گیا -
تیرا شاگرد بننے سے معلوم ہوا
کہ جدائی ایک بیش بہا دولت ہے -
موت عشق کی ضمانت ہے '
موت عشق کا ہم زاد ہے '
اُس روح کے لئے جو دنیا میں پھنسی ہو '
موت اور عشق ایک ہی انجام کے
دو نام ہیں ' پکارنے کے دو طریقہ -

جاڑے کے گیتوں کی ایک شکایت سنئے -

میرے ویران راستوں کے غیبی رہبر !
تو مدتوں سے میری آزمائش کر رہا ہے
اعراف کے ان گہرے قعروں میں، جہاں داخل ہونے کو
ہم اس دنیا میں پیدائش کہتے ہیں -
میری عزت چھن گئی، اور مجھے ملا کیا :
اوروں کے ساتھ ایک کال کوٹھری میں بند رہنا،
جب تک کہ میں ان چیزوں سے جو میرے دل کو نہیں بھاتیں
راضی نہ ہوجاؤں، ایک بوسہ دے کر دل کا غبار دور نہ کردوں -
میں نے سنگ دل، بے لطف جاڑوں کی صحبت سے گریز کیا،
اور عیاشوں کی طرح ان دیسوں میں جا کر جہاں جاڑے کی پھونچ نہیں
مناظر فطرت کو محبوب بنایا اور رنگ رلیاں مناتا رہا
لیکن میرے آقا اور استاد نے خفا ہوکر حکم دے دیا
کہ تاریکی کے بادل میری دنیا ہوں، برف کے ڈھیر میری قبر
اور برف کے طوفان میری نجات کے لئے گیت گائیں، دعائیں مانگیں -

استعاریت کے خاص طرز اور روسی کلاسیکی، رومانی اور حقیقت نگار شاعری کے اسالیب کی بہترین آمیزش الکساندر بلوک کے کلام میں پائی جاتی ہے - شروع میں اس پر سولوفیوف کے فلسفے اور زنئی ہاپی ٹس کے طرز کا اثر تھا، اور اس کے پہلے مجموعۂ کلام (سنہ ۱۹۰۴ ع) میں یہ ظاہر بھی ہوتا ہے - یہ نظمیں ایک "خوبصورت خاتون" کی شان میں تھیں، اور یہ معلوم کرنا دشوار نہیں کہ یہ "خوبصورت خاتون" کوئی انسان نہیں ہے بلکہ عقل کامل کا وہ مجسمہ جسے بعض یونانی فلسفی "صوفیا" کہتے تھے اور جس کا ذکر سولوفیوف کی نظموں میں آتا ہے - لیکن "خوبصورت خاتون"

کی ذات و صفات اور نظم کی ساخت اگرچہ بلوک کی اپنی ایجاد نہیں ' پھر بھی اس پر سرقے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا اور اس کی ان نظموں میں بہت سی خوبیاں ہیں جو اس کی اپنی طبیعت کی پیدا کی ہوئی ہیں - اس مجموعہ نے شاعری کے عام قدر دانوں میں تو بلوک کو مشہور نہیں کیا ' کیونکہ اس کے کلام کا استعارت کے خاص تخیل سے بہت تعلق تھا اور جو بلوک کے خیالات سے واقف نہ تھے انہیں ان نظموں کے سریلے الفاظ سوا اور کسی چیز سے لطف نہیں حاصل ہوسکتا تھا - لیکن خود شاعروں کے حلقوں میں بلوک اور اس کا کلام ہاتھوں ہاتھ لیا گیا - سنہ ۱۹۰۵ کے انقلاب میں بلوک کا خون بھی ابل اٹھا ' وہ نظموں میں " صوفیانہ نراج " کی تعلیم دینے لگا ' اور ایک موقع پر اس نے سرخ جھنڈا لےکر سڑکوں کا گشت بھی لگایا یہ جوش چند روزہ تھا - انقلابیوں کی ناکامی نے بلوک کو بہت مایوس کردیا ' اور وہ صرف " صوفیانہ نراج " کے عقیدے نہیں بھول گیا بلکہ اپنی " خوبصورت خاتون " کو بھی ' اور سنہ ۱۹۰۶ میں اس کے کلام کا جو مجموعہ شائع ہوا اس میں ان دونوں کا پتہ نہیں ملتا - بلوک نے فلک پیمائی کے حوصلے چھوڑکر دنیا کی طرف رخ کیا ' شاعرانہ طبیعت کے نازک احساسات ترک کرکے دنیا اور زندگی کی حالتوں اور کیفیتوں کو اپنا موضوع بنایا - " خوبصورت خاتون " کی بجائے اب ایک " اجنبی عورت " کا تصور اس کے ذہن پر حاوی ہوگیا ' ایک انجان ہستی جو " خوبصورت خاتون " کی طرح آسمان کی رہنے والی اور ستاروں کی سہیلی نہیں ہے بلکہ ایک لڑکی جو طرح طرح کے بھیس بناکر دنیا کا تماشا دیکھتی پھرتی ہے ' اور اکثر ایسے مقامات پر نظر آتی ہے جہاں شرابی اور عیاش جمع ہوتے ہیں - کبھی شاعر اسے دور ہی سے دیکھتا ہے اور " تیز شراب دل کے گوشہ گوشہ میں سرایت

کرجاتی ہے " کبھی مت بھول ہوجاتی ہے اور شاعر کو اس کے چہرے پر اس کے مزاج کی عجیب عجیب کیفیتیں اس کے دل کے راز ' اس کی آرزوئیں اور تمنائیں نظر آتی ہیں - لیکن گو " اجنبی عورت " کی کیفیتیں روشن ہیں ' شاعر اپنی امنگیں اور خواہشیں نہیں سمجھتا کہ کیا ہیں —

" میں ' اپنے نصیب کے ستارے کے چمکنے سے مست اور مسحور ہوں '
شراب نے اور صبح کی رونق اور دیدار نے
مجھے بے زبان کردیا ہے ' تڑپا دیا ہے '
مجھے امید اب کس بات کی ہے ' انتظار کا ہے کا ؟

" خوبصورت خاتون " اور " اجنبی عورت " دونوں کے عشق سے بلوک اپنے دل کو تسکین نہیں پہنچاسکا اس کا جذبہ نہایت پاک تھا - اور شوق بے انتہا لیکن یہ استعارے اصلیت کی شکل نہیں اختیار کرسکے ' اور بلوک ان میں جان ڈالنے کی کوشش سے اٹتا گیا - آخیر میں روس ' اس کا دیس ' وہ سر زمین جس کی گود میں اس کی شخصیت پلی تھی ' جس کی مصیبتوں نے اس کا دل دکھایا تھا ' جس کی فضا نے اسے فراسنجو سکھائی تھی ' اس کی معشوقہ بن گئی • نظموں کا تیسرا مجموعہ جس میں بلوک کے فلسفے کا یہ رنگ نظر آتا ہے ' ہر صورت سے اس کے کلام کا بہترین حصہ ہے - وہ مایوسی جو اس سے پہلے کی نظموں میں محسوس ہوتی ہے ' اب حد سے گذر جاتی ہے ' مگر اس کے ساتھ ہی بلوک کو روس کے مستقبل کا خیال کرکے کچھ روحانی سہارا بھی مل جاتا ہے ' اور اس کی مایوسی محض ایک ذاتی کیفیت ہوجاتی ہے ' کل کائنات پر چھائی ہوئی نہیں رہتی - اس مجموعے کی اشاعت کے ایک سال بعد ہی بولشوک انقلاب نے روسی زندگی کی کایا پلٹ دی ' اور گو بلوک کو

---

• روسی زبان میں روس مونث ہے

سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ بولشویکوں کے ساتھ شریک ہوگیا، اور اپنی شاعرانہ امیدوں کو ان کی کوششوں سے وابستہ کردیا اس کی دو لمبی اور بہت سی مختصر نظمیں جو انقلاب کے دوران میں لکھی گئیں ان امیدوں کا رنگ دکھاتی ہیں لیکن اپنی نسبت اس کا وہی خیال رہا، اپنی ذات کی طرف سے وہی مایوسی جو سنہ ۱۹۱۴ء کی ایک نظم سے ظاہر ہوتی ہے —

اور اگر ہمارے بستر مرگ پر
چیل کو چلائیں اور منڈلائیں تو پروا نہیں -
تو ان کو جو ہم سے زیادہ سزاوار ہیں
اے خدا اپنے جلوے کی دیدار سے سر فراز کر!

بلوک کے پہلے طرز کی دو نظمیں ملاحظہ ہوں .

مجھے مت بلا میں بن بلائے
تیرے حرم میں پہنچ جاؤں گا -
خاموشی سے تیرے پیروں پر
سر کو جھکاؤں گا -
تیرے احکام سنوں گا،
چپ چاپ انتظار کروں گا -
دیدار کے لمحے کے مزے لیکر
پھر اسی آرزو میں محو ہو جاؤں گا :
تیرے جذبات کی شدت
میرے گلے کا طوق ہوگی -
کبھی خادم بنوں گا کبھی محبوب

اور ہمیشہ غلام رہوں گا :

شاعر کے دل کی ایک خاص کیفیت کا بیان سلئے -

شام کو جب زمین کہرے کی نقاب ڈال لیتی ہے
تو بھونچال اور شعلوں سے گھرا ہوا
ایک فرشتہ قرآن کے صفحوں سے نکل کر
میری مردہ روح میں داخل ہو جاتا ہے -
دماغ کمزور اور تھکا ماندہ ہوتا ہے '
روح اڑتی چلی جاتی ہے ...
ہر طرف بے شمار پروں کی پھر پھراہٹ ہوتی ہے '
کانوں میں ایک پر اسرار گیت کی صدا گونجتی ہے -

تیسرے دور میں بلوک کی ذہنیت پر مایوسی کا غلبہ تھا - ایک مختصر نظم میں وہ اسے اپنے خاص طرز میں ظاہر کرتا ہے :

عیش و طرب کی مجلس کا لطف اٹھا کر
میں رات کو بہت دیر سے گھر واپس آیا -
رات کا اندھیرا میرے کمروں میں منڈلا رہا تھا '
میرے گوشۂ عافیت کی حفاظت کرنے کو ...
صرف میرا شیطان دم بھر بھی چین نہیں لیتا -
وہ مجھ سے کہتا ہے : دیکھ یہ تیرا جھونپڑا ہے -
اب اس وقت کی کیفیت ' اس وقت کی بیہودگیاں بھول جا
اور پارساؤں کا سامنہ بنا کر اپنے گیتوں میں گذشتہ زمانے کی جھوٹی تعریف کر -

اس دور کی بہترین نظمیں وہ ہیں جن میں بلوک نے اپنے کو مخاطب کیا ہے ' مگر افسوس ہے طوالت کے اندیشہ سے یہاں ان کے ترجمے دینا ممکن

نہیں - بلوک کی استعاریت پر آخری دور میں حقیقت نگاری کا جو رنگ چڑھ گیا : اس کی بہت اچھی مثال ایک نظم میں ملتی ھے جس میں ایک فوج کا ریل پر سوار ھوکر پیٹر برگ سے میدان جنگ کے لئے روانہ ھونا بیان کیا گیا ھے —

اس ریل گاڑی کے مسافروں میں جدائی کے درد ' محبت کی بے چینیوں '
قوت ' جوانی ' امید کے ھزاروں پھول کھلے ھوئے تھے ...
اور دور مغرب کی طرف
دھویں جیسے بادل خون میں ڈوبے ھوئے تھے -

موت کا یہ شگون اور بھی واضح کردیا جاتا ھے -

گاڑی اسٹیشن سے نکل گئی
اندھیرے میں آخری دیے چھپ گئے :
اور خاموشی نے صبح تک کے لئے ڈیرے ڈال دئے :
لیکن بارش سے ' گیلے میدانوں سے " ھورا " کی آواز آتی رھی تھی '
جس کی ھولناک صدائے باز گشت تھی : آگیا ' وقت آگیا "

---

سنہ ۱۹۱۸ کے بعد استعاریت کا زور کم پڑگیا - اگرچہ بلوک اور ویا چلاتاوانوف ؛ اس کے دو عظیم الشان نمائندے زندہ تھے اور ان کا کلام بہت مرغوب بھی تھا ؛ اس سال سے ایک نئی تحریک شروع ھوئی جو " شاعری پیشہ براداری " کے نام سے مشہور ھے اور جس کا بانی نکولائی ستیپا نووچ گومی لیوف تھا - شاعری کے اس نئے معیار کے مطابق دنیا اور زندگی کو استعارہ سمجھنا غلط تھا ؛ اور شاعر کا فلسفہ حیات ایک حقیقت نگاری قرار دی گئی جو پھول کو پھول کہے ؛ اور خوبصورت سمجھے ؛ مگر

اپنے احساسات کے بیان میں وہ تازگی پیدا کرے ' اپنی نظر میں وہ سادگی جو اس نسل کی خصوصیات تھیں جس نے پہلے پہل دنیا میں وارد ہوکر دنیا کو دیکھا اور اس پر تعجب کیا - اس نئے معیار نے تصوف کو بھی شاعری سے خارج کردیا ' اور شاعر کو بجائے استعاریت پسندوں کی طرح عارف سمجھنے کے محض صناع قرار دیا - خود گومی لیوف کا کلام اس معیار پر پورا اترتا ہے ' کیونکہ وہ آدمی بہت من چلا تھا ' سیر و سیاحت اور درندوں کے شکار کا شوقین ' بالکل ویسا ہی دنیا میں وارد انسان جیسا " شاعری پیشہ برادری " والوں نے شاعر کے لئے ہونا لازم کیا تھا - اس کی نظموں کے موضوع بھی جنگل اور شکار اور شکار کے حادثے ' سمندر کے سیاح اور بہادر سپاہی تھے - ایک نظم میں جہاں گومی لیوف نے جسم اور روح کا ایک مکالمہ بیان کیا ہے ' جسم کہتا ہے ؛ مگر اس سب کے بدلے جو میں نے لیا ہے اور اب بھی لینا چاہتا ہوں ' اپنی خوشی اور حماقتوں اور رنج کے بدلے ' میں ' جیسا کہ ہر مرد آدمی کو چاہئے ' مرنے اور مٹ جانے پر بھی راضی ہوں - مردانگی کو اس درجے تک پہنچانا کہ وہ شعر بن کر بھی ظاہر ہوا کرے آسان کام نہیں - اور " شاعری پیشہ برادری " کا گومی لیوف کے علاوہ ایک ہی اور رکن ہے جس نے میدان سخن میں نام پیدا کیا ؛ آننا آخما توووا ' جو چند سال تک گومی لیوف کی بیوی بھی رہ چکی ہیں —

آننا آخماتووا ( پیدائش سنہ ۱۸۸۹ م ) کی نظمیں پہلی بار سنہ ۱۹۱۱ م میں ' گومی لیوف سے شادی ہونے کے ایک سال بعد شایع ہوئیں - یہ نظمیں خاص شاعروں کے حلقوں میں بہت پسند کی گئیں ' عام شہرت آننا آخماتووا کو ان کے کلام کے دوسرے مجموعے کی اشاعت پر حاصل ہوئی

( سنہ ۱۹۱۴ ) - اس کے بعد دو اور مجموعے شائع ہوئے ' ایک سنہ ۱۹۱۷ ع میں دوسرا سنہ ۱۹۲۲ ع میں - بلوک کے انتقال پر پیتر برگ کے شاعروں کی سرداری ان کا حصہ ہوئی —

آنا آخما توووا کی نظمیں زیادہ تر ڈراما کے سے مناظر ہیں ' مگر بہت مختصر - ان کے جذبات میں کسی قسم کا شاعرانہ بڈو سنگار نہیں ' لیکن شدت ہے اور خلوص ' طرزبیان کے اختصار سے ان کی نظموں میں ایک عجیب لطف پیدا ہوتا ہے ' اور گو وہ زیادہ تر آپ بیتی سناتی ہیں ' ان کی کیفیت ایک خواب کی سی رہتی ہے - دو نمونے ملاحظہ ہوں —

جیسا کہ سیدھی سادی خوش اخلاقی کا تقاضا ہے '
تم میرے پاس آئے مسکرائے '
کچھ پیار سے ' کچھ بے پروائی سے
میرے ہاتھ پر بوسہ دیا '
اور مجھ پر ایک نظر ڈالی ' معلوم ہوا
کہ پرانی انجان صورتیں مجھے دیکھ رہی ہیں —
میں نے ایک لفظ کہا جس میں
دس برس کی آہیں ' اس مردنی کی جو مجھ پر طاری تھی '
ان راتوں کی جو میں نے جاگ جاگ کاٹی تھیں
ساری تاثیر جمع تھی - مگر اس کا کہنا بے سود ہوا
تم چلے گئے اور پھر میرا دل
سیاہ اور ویران اور خالی ہوگیا

جدائی کی ایک صورت یوں بیان ہوئی ہے

میں تیرا صفیہ مکاں ' تیرا خاموش بام جھروکوں کی '

اس کی پروانہ کروں گی کہ میری زندگی ویران ہوگئی ' جیسے بے بادل آسمان ،
تیرا ' صرف تیرا اپنے گیتوں میں چرچا کروں گی ،
تجھے مشہور کروں گی ، جیسا کوئی عورت اپنے دوست کو نہیں کر سکی ہے -
تو اپنی عزیز دوست کو یاد کرے گا ، اس جنت کو
جو تو نے اس کی آنکھوں کو فرحت پہنچانے کے لئے بنائی تھی '
اور میں سودا کری کروں گی ایک بیش بہا مال کی —
تیری الفت اور محبت کو شعر بنا کر بیچوں گی —

آنا آخمانووا کی ایک اور نظم کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں صرف روس کی نہیں بلکہ ہر اس قوم کی ذہنیت جو تنزل کی حالت میں ہوتی ہے بہت سچے اور دل کش طریقے پر بیان کی گئی ہے :

ہم نے سمجھ لیا کہ ہم مفلس ہیں ' ہمارے پاس کچھ بھی نہیں -
اور جب ایک کے بعد ایک نعمت ہمارے ہاتھ سے جانے لگی ،
اور ہر دن ایک نئے نقصان کا ماتم ہونے لگا
تو ہم نے گیت بنانا شروع کئے
خدا کے عظیم الشان فیض و کرم پر '
اور اس دولت پر جسے کبھی ہم اپنی کہتے تھے "

استعاریت کے زوال پر روسی شاعروں کے اصولوں اور اسالیب میں انتشار پیدا ہوگیا اور ابھی تک یہی صورت قائم ہے - ارسپ یمییل یوچ مانڈل ستام نے شروع میں ,, شاعری پیشہ برادری "کے اصول نظم اور گوسی ایوت کی تقلید کی ' لیکن پھر اپنا نیا طرز ایجاد کیا ہے جس میں خیالات اور زبان کے اعتبار سے کوئی خوبی نہیں ' صرف الفاظ کے انتخاب اور ترتیب سے موسیقی کی خاص کیفیتیں شعر میں پیدا کر دی گئی ہیں - سنہ ۱۹۱۷ ع کے بعد دو اور

نئے حلقے وجود میں آئے ہیں ' " دیہاتی شاعری " یا " تصوری " اور " مستقبلی " دونوں پر اشتمالیت کی تعلیم اور انقلاب کی فضا کا بہت اثر ہے ' یعنی انھوں نے فن شاعری کے وہ بنیادی اصول اور وہ مقاصد جو شروع سے اس وقت تک ہر شاعر نے تسلیم کئے ہیں اور جو شاعری کا خاص میدان سمجھے جاتے ہیں ' بالکل رد کر دئے ہیں - ان کی شاعری کو جمالیات سے کوئی واسطہ نہیں ' وہ خود نہ لطیف جذبات رکھتے ہیں نہ دوسروں کی طبیعتوں میں ان کا وجود تسلیم کرتے ہیں ' جن سے انہیں کوئی سروکار نہیں ' خواہ وہ منظر فطرت کا ہو یا انسان کا یا تخیل کا - اس صورت میں ان کے کلام کا ذکر کرنا فضول ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنا بیکار - ان جدتوں سے کہیں بہتر ان پرانے شاعروں کی نظمیں ہیں جو انقلاب کے زمانے میں انقلاب کی اخلاقی اور روحانی کیفیات پر لکھی گئی ہیں ' جن میں سچی باتیں اچھے طریقے سے کہی گئی ہیں اور جن کے مصنف روسی قوم اور روسی فطرت سے انقلابیوں سے بہت زیادہ گہری واقفیت رکھتے ہیں -

انقلابی دور کی پرانے طرز کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے بلوک کا نام زبان پر آتا ہے - جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ' بلوک نے " خوبصورت خاتون " اور " اجنبی عورت " کی طرح سے سرد مہر ہو کر اپنی سرزمین روس کو معشوقہ بنایا تھا - پہلے انقلاب کی ناکامی اور اصل حقیقت کے انکشاف نے اسے بہت مایوس کر دیا تھا ' مگر اس مایوسی کے باوجود اس کی محبت کا جذبہ بہت قوی رہا - ایک نظم میں وہ روس کو ایک دنیا دار عورت کی شکل میں پیش کرتا ہے - اور اس کی طرف ہر قسم کی اخلاقی پستی اور دل کا کھیدہ پن منسوب کرکے آخر میں کہتا ہے :

مگر اس صورت میں بھی ' اے سرزمین روس

تو مجھے دنیا کے ہر ملک سے زیادہ عزیز ہے :

جہاں روسی فطرت کی خامیاں نہیں بیان کی جاتی ہیں وہاں اور باتوں پر افسوس ظاہر کیا جاتا ہے مگر شاعر کی محبت ہر دوسرے جذبے پر غالب رہتی ہے :—

روس ' مفلس روس ' میرے نزدیک
تیرے متیالے جھونپڑے '
تیرے گیتوں کے سبک نغمے -
گراں بہا ہیں جیسے محبت کے بہائے ہوئے پہلے آنسو -

کبھی کبھی اُمید نے بلوک کی دست گیری کی ' اور اس نے اپنے ملک کی عظمت کے بیحد دل ربا خواب دیکھے ' جن میں سے ایک اس کی نظم " نئے امریکہ " میں بیان کیا گیا ہے - لیکن ترقی اور رونق کے یہ خواب اس کے دل سے بے چینی اور اندیشہ دور نہ کر سکے سنہ۱۹۰۸ع میں اس نے ایک نظم " میدان کولی کووو " لکھی جس میں جنگ عظیم اور انقلاب کے زلزلے کی پیشین گوئی ہے ' اور انقلاب تک بلوک اپنے دل کو اسی امید سے تسکین دلاتا رہا کہ روسی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا بنیادی تغیر ضرور ہوگا جو حالات کو بالکل بدل دے گا ' پرانے فلسفۂ حیات کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دے گا اور یوں روس کی فلاح کا ذریعہ ہو گا لیکن حزن اور مایوسی بلوک کی طبیعت پر اس طرح حاوی ہوگئی تھی کہ جب مستقبل کے وجدانی علم نے اسے انقلاب کے آمد کی خوش خبری سنائی تب بھی وہ اپنے آپ پر ' یا ان روسیوں پر جو اس کے ہم عصر تھے مطلق اعتبار نہ کرسکا ' روس میں جان پھونکنے کی خدمت دوسروں کو سونپی ، اور اپنے لئے روحانی تباہی کے سوا اور کوئی انجام تصور نہ کر سکا - مایوسی اور امید کی یہ

عجیب آمیزش ان تمام نظموں میں پائی جاتی ہے جو اس نے انقلاب کے زمانے میں لکھیں ' اور جو در اصل اس دور کی سب سے قابل قدر ادبی یادگاریں ہیں - اپنی کیفیت وہ ذیل کی نظم میں بہت پر درد مگر صحیح طریقے سے ظاہر کرتا ہے :

مجھ پر بیچارے جاہل ہنستے تھے '
کہتے تھے نوجوان شاعر شعبدہ بازی کر رہا ہے '
جہاں امید کی صورت نہ تھی ' امید پیدا کر دی '
جن کی کوئی انتہا نہ تھی ' اس کی حد باندھ دی -
مجھے خود بھی وہ شعلہ جو میں نے روشن کیا ہے
عجیب نظر آتا ہے ' میرے دل کو اس سے وحشت ہوتی ہے '
میں خود اپنے تیر کا زخمی ہوں '
خود اِس نئی زندگی کا بوجھ اٹھانے سے ہمت ہار بیٹھا ہوں '
گزرنے والو - میرے پاس سے گزرتے جاؤ
میرے درد کا مذاق اڑاتے جاؤ -
میں تو مر رہا ہوں ' مگر مجھے معلوم ہے میری بنائی ہوئی دنیا '
میری موت کو برداشت کر لے جائے گی ' اور تمہاری ہیبت ناک تضحیک کو بھی

ایک اور نظم ملاحظہ ہو ' اس میں مایوسی کی وہ شدت نہیں اور ناکامی کا کچھ اندیشہ جو ظاہر ہوتا ہے انقلاب کے عظمت کے احساس میں محو ہو جاتا ہے :

دنیا کی اس تاریکی پر جو صدیوں سے چھائی ہوئی تھی !
اس تاریکی پر جو نفرت اور شہوانیت سے بھری ہوئی تھی ،
اس تاریکی ' پر جنگی نعروں کے جواب میں آسمان پر

ایک نئی قوت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔
وہ شعائیں جو اس آفتاب کے تاج کے گوشے ہیں
بہت جلد کالے بادلوں کی گھٹا کو پار کر جائیں گی،
اور لوگ میدان جنگ سے دریا کے دھارے کی طرح
اس کے چمکتے ہوے تخت کے سامنے پہنچیں گے۔
ہم جو صرف رات کے اندھیرے اور طوفان سے آشنا ہیں،
اس شاہانہ جلوے کے دیدار کی تاب نہ لا سکیں گے،
اور ہماری دنیا آسمان کا وحشت ناک منظر دیکھ کر،
راکھ کا ایک ڈھیر بن جائے گی۔

انقلاب کے زمانے کا ادبی کارنامہ بلوک کی نظم " بارہ سوار " ہے، جس کا اکیس مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اور بعض زبانوں میں متعدد بار۔ اس میں بارہ سواروں کا قصہ ہے جو رات کو شہر میں پہرہ دے رہے ہیں، اور فحش گیت گاتے اور ادھر اُدھر گولیاں چلاتے سڑکوں کی گشت لگا رہے ہیں۔ انقلاب کا زمانہ ہے، زیادہ رات گزرنے کے بعد لوگوں کو سڑکوں پر گھومنے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے یہ بارہ سوار جب اپنے آگے ایک شخص کو سر جھکائے جاتے ہوے دیکھتے ہیں تو اسے فوراً للکارتے ہیں وہ شخص کوئی جواب نہیں دیتا، سوار فوراً گولی مارتے ہیں، مگر اس کا بھی راہ رو پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تب وہ قرار کے ایڑ لگا کر اس کے پاس پہنچتے ہیں راہ رو منھ پھیر کر ان کی طرف دیکھتا ہے، اور سوار اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں، کیونکہ وہ کوئی معمولی راہ رو نہیں، خود حضرت عیسیٰ ہیں، جو اپنی محبوب قوم میں روحانی بیداری کے آثار دیکھ کر آئے ہیں کہ کلیسا کی بھی اُمیدیں پوری ہوں۔ اس نظم میں بلوک نے صرف انقلاب کی

روحانی اہمیت نہیں جتائی ہے بلکہ شاعری کا ایک کرشمہ دکھایا ہے - اس کی زبان وہی ہے جو عوام، خصوصاً شہری مزدوروں کے گیتوں کی، مگر اس کی بحریں موسیقی اور ترنم کے جواہر ریزے ہیں، اور اس میں ایک شان ہے جو بہت کم نظموں میں پائی جاتی ہے -

بلوک کے علاوہ ان تمام شاعروں نے جن میں وطن پرستی کی ذرا بھی گد گدی تھی اپنے اپنے طرز پر انقلاب سے ہمدردی اور ان مصیبتوں پر افسوس ظاہر کیا جو انقلابیوں اور روس کی عام آبادی کو اس تحریک کے کامیاب بنانے کے لئے اُٹھانی پڑیں، لیکن بلوک کے پایہ کو کوئی نہیں پہنچا آنا آخما تووا کو بھی اپنے وطن سے بہت محبت ہے، اور لڑائی کے زمانے میں انہوں نے اپنے جذبے کا یوں اظہار کیا تھا —

برسوں بیمار رکھ کر میری زندگی تلخ کردے -
مجھے سانس کے روگ میں مبتلا کردے، میری نیند چھین لے، مجھے گرسنہ میں جلا
اولاد اور دوست سے محروم کردے —
نغمہ سرائی کی پر اسرار نعمت واپس لے لے،
لیکن اے خدا، میری یہ دعا بھی قبول کرلے
کہ اتنے دنوں تکلیف دینے اور تڑپانے کے بعد
وہ بادل جو تاریک روس پر چھایا ہوا ہے
آخر کار افتاب کی شعاعوں سے چمک اُٹھے

لیکن یہ وطن پرستی ایسی شدید اور دل افروز نہیں کہ شاعر کو مستقبل کے راز بتادے، یا انقلاب کے روحانی اسرار ان پر واضح کر سکے انقلاب کی نسبت آنا آخما تووا صرف یہ کہہ سکیں :

گذشتہ صدیوں سے ہمارا زمانہ کس صورت سے بدتر ہے ؟

کیا اس لحاظ سے کہ درد اور پریشانی کی انتہائی حالت میں
اس نے وہ روگ دور کرنا چاہا جو سب سے زیادہ زہریلا تھا'
اور نا کامیاب رہا؟

ان شاعروں نے جو انقلاب اور انقلابیوں کے خاص حامی اور مبلغ مانےجاتے ہیں' اور جن کا سردار مایا کوفسکی (پیدائش سنہ ۱۸۹۳ م) ہے' تخیل کی بلند پروازی اور ادبی کمال سے بالکل بیگانہ ہیں اور ان کی شاعری کو دراصل ادب میں شامل ہی نہ کرنا چاہئے۔ البتہ انقلاب نے نئی زندگی کی تعمیر کا سچا جوش اور حوصلہ پیدا کردیا ہے' اور یہ حوصلہ ممکن ہے رفتہ رفتہ نئے پھول کھلائے۔ ولیرئی بریوسوف کی نظم "تیسری خزاں" کے آخر میں جو دعوی ہے اس میں مبالغہ بہت ہے مگر روسی قوم کی عام بیدار دلی دیکھتے ہوئے اس کا بھی امکان ہے کہ وہ ایک حد تک صحیح نکلے:

اے ہوا' اے ہوا' یہ یاد رکھ
کہ جھگڑوں' اور بیکسی اور مفلسی کے باوجود
سارا روس تعمیر کی خوابوں سے مست
خدا کے حکم پر چلے گا اور فتحیاب ہوگا!
اے ہوا، یاد رکھ کہ پرانی قوت پھر روس میں آگئی ہے'
فتحیابی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے'
اور اس کی روز افزوں طاقت اور اقتدار
اسے دنیا کی ساری قوموں کا رہبر بنادے گا!

# مغربی اسماء معرفۃ اُردو قالب میں

از

( جناب احمد الدین صاحب مارہروی )

[ یہ مضمون ایک مختصر تمہید و تشریح کا طالب ہے ]

تقریباً پانچ سال کا عرصہ ہوا کہ الہ آباد میں چند علم دوست نوجوانوں نے نالج آفس کے نام سے ایک دارالاشاعت قائم کیا جس کا مقصد اردو زبان میں چند نایاب چیزوں کا اضافہ کرنا تھا - لیکن اس وقت خود ان لوگوں کو بھی ' جو اس دارالاشاعت کے بانی تھے ' معلوم نہ تھا کہ یہ " بیش بہا اضافہ " کیا ہوگا ' اور انجمن کا نصب العین مرتب کرتے وقت اس قدر متضاد تجاویز پیش کی گئیں کہ اگر ایک فہمی امداد نہ مل جاتی تو نالج آفس کام کرنے سے قبل ہی کالعدم ہو جاتا ' قصہ مختصر انجمن نے اپنی تگ و دو کو تین امور تک محدود رکھا ( ۱ ) ' ایک ماہوار رسالے کا اجراء جس کے ذریعہ سے پبلک کو سلیس زبان اور سادہ عبارت میں تمام علوم اور خصوصاً سائنس کے مسائل سے روشناس کیا جائے ' چنانچہ یہ رسالہ ( معلومات ) جنوری سنہ ۱۹۳۰ ع سے جاری کر دیا گیا ( ۲ ) پچاس جلدوں میں ایک فرہنگ اسمیہ شائع کرنا ' جس میں دنیا کے تمام مشہور مرد اور عورتوں کے خواہ وہ کسی ملک کسی زمانے کسی طبقے اور کسی فن سے تعلق رکھتے ہوں ' سوانح حیات بحساب حروف تہجی درج ہوں اور ( ۳ ) مصنفین انگلستان کی روش پر مصنفین اُردو کی سوانح ( English Man OF Letters ) عمریاں معہ تبصرہ کلام شائع کرنا —

دارالاشاعت کی تاریخ بیان کرنا چونکہ میرے موضوع سے باہر ہے اس لئے میں صرف دوسری شق کو لیتا ہوں اس فرہنگ کی تدوین کا کام میرے سپرد ہے اور چار سال کی مسلسل محنت کے بعد میں نے اپنے معاونوں کی مدد سے ایک جلد مرتب

کرلی ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے * - جس وقت اس کام کو شروع کیا گیا تو ہمکو ان دقتوں کا مطلق اندازہ نہ تھا جو اس سلسلے میں پیش آئیں ' اسماء کی جستجو اور حالات کی تلاش جوئے شیر کے لانے سے کم نہ تھی اور بعض اوقات تمام رات و دو کوہ کندن و کاہ بر آوردن یا سعی لاحاصل ثابت ہوتی اور ہم لوگ کام کی نوعیت سے گھبرا اُٹھتے - تدوین کا کام بھی آسان نہ تھا اور اُس وقت سب سے بڑی دقت جو پیش آئی وہ مغربی اسماء معرفہ کو اُردو قالب میں ڈھالنا اور اسکے واسطے کوئی مستقل اور یکساں اصول مقرر کرنا تھا - بہترین صورت تو یہ ہوسکتی تھی کہ تمام ناموں کو انگریزی تلفظ کے مطابق اختیار کرلیا جاتا ' لیکن اس زبان میں تلفظ کے اصول اول تو مقرر نہیں اور اگر معدودے چند ہیں بھی تو اُن میں مستثنیات اس قدر ہیں کہ " المشاہیر " جیسی کتاب میں اس سے استفادہ کرنا تمام محنت کو ضائع کرنے کے برابر ہے —

اس گتھی کو سلجھانے کی صرف دو صورتیں تھیں ' ایک تو یہ کہ ہر لاطینی حرف کے واسطے ایک حرف مقرر کرلیا جائے اور جملہ یوروپین اور امریکن ناموں کو یکساں طور پر اُردو میں ترجمہ کرلیا جائے لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ بعض نام اس طرح مسخ ہو جاتے کہ اُن کا سمجھنا دشوار ہوتا ' مثلاً ( George ) جو انگریزی میں " جے آر جے ( ے ) " اور فرانسیسی میں ژے آر ژ ( ے ) ہے اس اصول کی رو سے گھارگی بن جاتا اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ در اصل کیا نام ہے - اسی طرح ( Churchill ) جس کو انگریز چرچل کہتے ہیں تھار تھیلّ ہوجاتا - مگر سنتے ہیں اس میں ایک آسانی بھی تھی وہ یہ کہ تمام ناموں کے واسطے یکساں اصول مقرر ہوجاتا - اور انگریزی دان طبقہ کو اس میں کچھ زیادہ دشواری نہ ہوتی —

---

* پبلک اور خصوصاً پروفیسروں کے بیحد اصرار سے انجمن نے اس کا ایک انگریزی ایڈیشن شائع کرنا بھی منظور کرلیا ہے اور ہندی میں ترجمہ کی تجویز بھی پیش نظر ہے المشاہیر کے متعلق جملہ حالات نائب آفس الہ آباد سے معلوم ہوسکتے ہیں —

برخلاف اس کے دوسری تجویز یہ تھی کہ تمام اسماء معرفہ کو اسی طرح لکھا جائے جس طرح وہ اُس زبان کے قواعد کی رو سے متلفظ ہوتے ہیں۔ جہاں تک صحت تلفظ کا تعلق ہے یہ تجویز بہت معقول تھی مگر اس میں ایک دقت یہ پیش آنے والی تھی کہ اُردو دان طبقہ، جو ہر چیز کو انگریزی عینک سے دیکھتا ہے بعض ناموں کو غلط پڑھتا اور جب فرہنگ میں ان کو اس جگہہ نہ پاتا تو سخت مایوس اور ناراض ہوتا۔ مثلاً (Jean) انگریزی میں تو جین ہے لیکن فرانسیسی میں ژے وَنْ پڑھا جاتا ہے۔ اور بجائے ج کے ژ کے تحت میں لکھا جائیگا۔ یا (خ Viscle) وسچر، وسکر، یا وشر نہیں لکھہ "ف ی ش (ے) ر" ہے اور بجائے و کے ف کے تحت میں ملے گا

یہ ایک اصولی فرق تھا اور چونکہ مجھہ کو پبلک کے سامنے ایک نئی مگر مستقل چیز پیش کرنا تھی اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ملک کے مشہور اہل الرائے حضرات سے اس کے متعلق مشورہ کر لیا جائے۔ چنانچہ میں نے دونوں تجاویز کو ایک گشتی خط کے ذریعہ سے ڈاکٹر سر محمد اقبال (لاہور) مولوی عبدالحق صاحب (انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد) نواز فتحپوری (لکھنؤ) ڈاکٹر ذاکر حسین (جامعہ ملیہ دہلی) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد یونیورسٹی) سید سلیمان ندوی (دارالمصنفین، اعظم گڑہ) مولوی نعیم الرحمان (ہندوستانی اکیڈیمی اور دیگر حضرات کے سامنے پیش کرکے ان کی رائے سے اس جواب حاصل کیا، ان میں سے بعض نے تو (غالباً مصروفیت کی وجہ سے باوجود دو بارہ سہ بارہ یاد دہانی کے جواب نہ دیا، لیکن جو جوابات موصول ہوئے ان کی تقسیم اس طرح کی جا سکتی ہے :-

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، اور نواز فتحپوری نے اصول ثانی سے اتفاق کیا، مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اسی کو ترجیح دی اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی اگر جواب دیتے تو اس سے اتفاق کرتے

ڈاکٹر زبید احمد ( الہ آباد یونیورسٹی ) نے پہلی تجویز کو پسند فرمایا
سید سلیمان ندوی نے مجھ کو ڈاکٹر صدیقی کے مشورے پر کار بند
ہونے کی صلاح دی —

مولوی نعیم الرحمن صاحب نے پہلی تجویز کو نا ممکن القبول کہا ۔
یعنی دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے اصول ثانی
کو ترجیح دی —

اس طرح گویا ملک کے زیادہ تر اہل الرائے اصحاب نے مغربی
ناموں کو اردو قالب میں ڈھالنے کے لئے اس اصول کو پسند کیا کہ
جہاں تک ممکن ہو سکے ان کو اہل زبان کی طرح مقلنط کیا جائے
یہ بھی بذات خود ایک دقت طلب امر تھا اور اگر ڈاکٹر عبدالستار
صدیقی جو علاوہ السنہ شرقیہ کے انگریزی ' جرمن اور فرانسیسی
زبانوں میں ید طولیٰ رکھتے اور لسانیات ( فلالوجی ) کے ماہر ہیں اپنے
قیمتی مشوروں سے میری مدد نہ فرماتے تو معلوم نہیں اس
اسکیم کا کیا حشر ہوتا ]

اہل ہند نے چونکہ ایسے ماحول میں تعلیم پائی ہے ' جہاں علاوہ
انگریزی کے اور کوئی مغربی زبان بولنے یا سننے میں نہیں آتی ' اس لئے
وہ تمام چیزوں کو انگریزی کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں '
اس وقت بھی جب کہ سیاسات عام ہو گئی ہے اور اہل ہند کا ایک بڑا
طبقہ پولٹکل مسائل سمجھنے اور بولنے لگا ہے ' آپ کو ایسے لوگوں سے ملنے کا
اتفاق ہوا ہو گا جو " یورپین " کو انگریز اور " برٹش گورنمنٹ " کو گورنمنٹ
کا مترادف سمجھتے ہیں ' اور یہی وجہ ہے کہ ہم تمام مغربی ناموں کو

اسی طریقہ پر لیتے ہیں جس طرح ایک انگریز ان کا تلفظ کرتا ہے' لیکن قباحت یہ ہے کہ انگریزی ایک بے اصول زبان ہے اور پھر تمام انگریز بھی ایک نام کا یکساں طور پر تلفظ نہیں کرتے —

مثلاً ( Vienna ) کو کوئی انگریز ویانا کہتا ہے اور کوئی وائنا' حالانکہ اس کا اصل تلفظ وی ء ن ہے —

یا بواونیا کو بعض انگریز بولونا کہتے ہیں' بعض بلونا اور اکثر بولگنا بھی کہتے ہیں ( Bologna ) خود اپنے ہی ناموں میں ان کو اختلاف ہے' مثلاً ( Chelmsford ) کو کوئی چیمسفرڈ کہتا ہے کوئی چیلمسفرڈ کوئی کوئی شیمسفرڈ' اور آپ کو غالباً خیال ہوگا کہ یہ نام اُردو صحافت میں ایک عرصے تک زیر بحث رہا ہے —

یورپ کو جہاں تک السنہ کا تعلق ہے' دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے' (۱) وہ ممالک جنھوں نے لاطینی حروف تہجی کو اختیار کر لیا ہے' اس زمرے میں یورپ اور امریکہ کے تمام بڑے بڑے ممالک جاتے ہیں - (۲) وہ ممالک جنھوں نے ابھی تک اس طرف توجہ نہیں کی اور وہ اپنی پرانی روش پر قائم ہیں - مثلاً روس و یونان وغیرہ —

جن ممالک نے لاطینی حروف کو اختیار کر لیا ہے ان کے تلفظ میں چنداں قباحت نہیں ہوتی' کیونکہ ان سب میں حروف کی آوازیں قریب قریب یکساں ہیں اور ہر زبان کے قواعد نہایت جامع طور پر مرتب کر لئے گئے ہیں - لیکن یونانی اور روسی الفاظ کے تلفظ میں غلطی ہو جانے کا احتمال ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان زبانوں کے حروف تہجی سے بعض نا آشنا ہیں - علاوہ ازیں ان میں چند کی آوازیں ایسی ہیں کہ ہماری زبان ان کا ٹھیک طور پر اعادہ نہیں کر سکتی اور ہمارے واسطے

بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ان کو اس طرح اختیار کرلیں جس طرح وہ انگریزی قالب میں ڈھلے ہوے ہم تک پہنچتے ہیں - اس کا البتہ خیال رکھنا چاہئے کہ ان کا تلفظ انگریزی کے بے اصول قواعد کے مطابق نہ کیا جاے بلکہ یورپین اصول کو پیش نظر رکھکر کران کے واسطے جداگانہ طریقہ بنایا جائے مثال کے طور پر ( Ivan ) کا تلفظ انگریزی میں تواءون ہوگا لیکن جامع اصول کے مطابق اس کو اِیوآن پڑھا جاے گا اور یہی صحیح ہے —

اسی طرح ( Cerigo ) کو ہم لوگ سیریگو کہیں گے لیکن یہ دراصل "چری گو" ہے اب میں ان اصولوں سے اعتنا کرتا ہوں جن کو میں نے اپنے مقصد کے واسطے اختیار کیا ہے - قبل اس کے کہ میں اصل موضوع کی طرف راجع ہوں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حروف ہجا کی اہل قواعد نے تین قسمیں کی ہیں - ( ۱ ) حروف صحیح جس کو انگریزی میں ( Consonant ) کہتے ہیں ( ۲ ) حروف علت یا ( Vowel ) اور لطیف مقرون یا ( Diphthong ) حروف صحیح وہ ہیں جو بلا حروف علت کے تحریک میں نہ آسکیں ' جس طرح لاطینی ( b, d, f, g, h, j, k, ) اور اُردو ب ' پ ' چ ' ف ' وغیرہا حروف علت وہ حروف ہیں جو ا و یا ی و سے زیادہ تر حروف صحیح کو ساتھ ملا کر پڑھنے میں مدد دیتے ہیں - لاطینی میں یہ حروف ( a, e, i, o, u, w, y, ) ہیں اور اُردو میں آ ' او ' ی ' کے علاوہ اعراب بھی یہی کام کرتے ہیں - لطیف مقرون بھی چونکہ دو حروف علت کے اتصال سے بنتا ہے اس لئے اس کو بھی حرف علت سمجھنا چاہئے —

کسی زبان کے اسماء معرفہ کو اُردو قالب میں ڈھالنے وقت

سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہوگی کہ اس کے حروف علت اور لطیف مقروں کے مقابلہ میں مترادف الصوت اردو حروف کا تعین کرلیا جائے - اور پھر اسی طرح تمام حروف صحیح کو یکے بعد دیگرے لکھ لیا جائے —

جگہہ کی قلت مانع ہے کہ ہم تمام زبانوں کے قواعد کو فرداً فرداً سپرد قلم کریں اسلئے اس مختصر مقالہ میں صرف فرانسیسی حربت ہجا سے اعتنا کیا جاتا ہے - فرانسیسی چونکہ یورپ کی مشترکہ زبان متصور ہوتی ہے اس لئے اہل یورپ عام طور پر ان اصولوں سے واقف ہیں اور اسی کے مطابق الفاظ کا تلفظ کرتے ہیں - البتہ انگریز اپنی قدیمہ ایجاد کی مستحسن الگ بنا تا ہے - مثلاً ( george ) بجز انگلستان کے کہ وہاں تو اس کو جارج کہیں گے ہر جگہہ ژے آژ ( ے ) بولا جائیگا -

سہولت اور صحت دونوں اس کے مقتضی ہیں کہ جو الفاظ اردو قالب میں ڈھالے جائیں ان کو ملا کر نہ لکھا جائے ' بلکہ تمام حروف کو الگ الگ لکھیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کونسا حرف ما قبل ہے اور کونسا بعد میں آتا ہے اور تلفظ میں دشواری نہ ہو - ساکن حروف لکھکر قلمزد کر دئے جائیں - کیونکہ اس قسم کے الفاظ مثلاً ( Dnieper ) یا ( ptolemy ) کو عموماً د اور پ کے تحت میں تلاش کیا جائیگا اس لئے ان کو " ( د ) ن ی پ ( ے ) ر " اور " ( پ ) ت آ ل ے م ی " لکھنا زیادہ موزوں ہوگا —

اسکی بھی ضرورت ہے کہ اردو حروف علت کی مختلف آوازوں کا تعین کرلیا جائے - مثلاً جس طرح لاطینی کا ( a ) چار مختلف آوازیں دیتا ہے ( آ - آ - اے - اے ) اسی طرح اردو حروف علت کی بھی مختلف آوازیں ہوتی

ہیں - مثال کے طور پر " واؤ " کو لیجئے - سودا ' سود - صوّر دیوار '
میں ہر واؤ ایک جدا گانہ آواز دیتی ہے —

چنانچہ میلے حروف علت کی آوازوں کا تعین اس طرح کیا ہے —

الف - آ ہندی ( अ ) مثلاً آسیر - توآم

آ - ہندی ( आ ) مثلاً آم - کام - جاتا

اِ - ہندی ( इ ) مثلاً اِتاوہ - اِلعام

اُ - ہندی ( उ ) مثلاً اُس - اُن - بعض لوگ اوس اور اون لکھتے
ہیں مگر یہ صحیح نہیں -

ا - ہندی ( उ ) اس کو اُردو میں او کے لفیف فقروں سے ظاہر
کیا جاتا ہے مثلاً اونٹ ' حالانکہ ہم اس لفظ کو بلا واؤ کے بھی درست لکھہ
اور پڑہ سکتے تھے - اُنٹ

اسیطرح ا - ہندی ( ऊ ) ہے - اسکو اُردو میں ای کی متحدہ آواز سے
ظاہر کیا جاتا ہے - مثلاً ایران حالانکہ ہم " اِرآن " بھی لکھہ کر
درست پڑہ سکتے تھے

واؤ - ساکن و جو دراصل پیش ( ُ ) کی مترادف ہوتی ہے ' مثلاً خرد -
خورد ' جو پڑھنے میں خد اور خرد ہو جاتا ہے

و - جو اوّ - آ کی آواز دیتی ہے مثلاً موّد - بہبود - ہوّد وغیرہ

و - جو او کی آواز دیتی ہے - مثلاً موتی - گرمتی وغیرہ

و — مثلاً کون - جونپور وغیرہ

و - یہ دراصل وّ ہے اور عموماً حروف کے آخر میں آتی ہے -
مثلاً دیو - دیوار -

وِ - مثلاً - وِقار - وِلایت

یاء - ای - ي هندی ( ۓ ) مثلاً سیر -

اِی - ی هندی ( ۓ ) مثلاً میزان - گھوڑے -

آے - ے - مثلاً گیند - بھیرا —

اِے - ے مثلاً کیلا - جیب - سیب - وغیرہ

لفیف مقرون دو حروف علت کی ملی ہوئی آواز ہے - جس طرح لاطینی میں ان کی مختلف اجتماع سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں اسی طرح اردو میں بھی ان کے مرکب بنائے جا سکتے ہیں - لیکن چونکہ ہمارے ہاں اعراب موجود ہیں اس لئے حروف کو ملانے کی زیادہ ضرورت نہ ہوگی —

فرانسیسی زبان کے قواعد تلفظ مندرجہ ذیل طریقہ پر منضبط ہو سکتے ہیں —

حروف علت و لفیف مقرون

( a ) خواہ لفظ کے شروع میں ہو یا درمیان میں آ کی آواز دیتا ہے - مثلاً ( Bonaparte ) بونآپآرت ( ی ) اور ( Agost ) آگوس ( ت ) لکھا جاے گا —

( a ) کے بعد اگر m یا n ہو تو اس کی آواز اؤ ہوجاتی ہے مثلاً ( Ambois ) اؤنبوا ( ز ) یا ( Andre ) اؤندرے

( ae ) بھی آ کی آواز دیتا ہے مثلاً ( Stael ) ستآل

( ai ) اِے کی آواز دیتا ہے مثلاً ( Calais ) کالے ( س )

( ao ) = آؤ مثلاً ( Paoli ) پآؤلی -

( au ) = او مثلاً ( Auch ) اوش

(Ay) اے ۔ مثلاً (D' Arablay) د ا ر ب ل ے

(e) = اے مثلاً (Bezier) ب ے ز ی ے (ر) مگر جب کسی حرت کے آخر میں ہو تو ساکن ہوتا ہے ، مثلاً (Gironde) ژ ی ر و ن ڈ (ے)

(ē, é, e) اے ۔ ے کی آواز دیتا ہے اور کسی حالت میں ساکن نہیں ہوتا ۔ مثلاً (Fécomp) ف ے ک و ن پ یا (Andre) اؤن د رے

(eau) = او مثلاً = (Kousseau) ر و س

(ea) = اِے آ ۔ مثلاً (Orlean) او ر ل ے ا و ن یا ( )

(i) = ای ۔ مثلاً (Diderot) د ی د (ے) ر و (ت)

(ie) ای مثلاً (Amiens) آ م ی آ ن (س)

(o) = آو مثلاً (Condercet) ک و ن د و ر س ے (ت)

(oi) وآ مثلاً (Soissons) س و آ س و ن (س)

(oy) = وآی مثلاً (Royer) ر و آ ی ے (ر)

(ou) = ا ُو مثلاً (Rousseau) ر و س و

(u) = یُو مثلاً (Urlant) اِرلَن و ں (ت) یا (Dumas) د یُو م ا (س)

حروف صحیح کی آوازوں کا بھی اسی طریقہ سے تعین کرنا چاہئے ۔

(b) بَ کی آواز دیتا ہے لیکن جب اس سے پہلے (m) ہو تو ساکن ہوجاتا ہے ۔ مثلاً (Coulon.b) ک و ل و ن (ب)

(c) کے بعد اگر a , o , u یا کوئی حرت صحیح ہو تو اس کی آواز سخت یعنی ک کی ہوگی مثلاً (Fecamp) ف ے ک و ن پ

لیکن اگر وہ e , i , y سے قبل ہو تو س کی آواز دے گا مثلاً (Annecy) آ ن (ے) س ی

جب لفظ کے آخر میں آے تو ساکن رہتا ہے ، مثلاً (Blanc) ب ل و ن (ک)

(cc) کے بعد جب e یا i ہو تو پہلا c 'ک' اور دوسرا 'س' کی آواز دیتا ہے مثلاً (Acce) آک س سے پڑھا جائے گا —

(ch) ش مثلاً (Auch) اوش

(d) د کی آواز دیتا ہے مگر لفظ کے آخر میں ساکن ہوتا ہے - مثلاً (Ronald) رون آل (د)

(g) a, o, u, سے قبل سخت یعنی 'گ' کی آواز دیتا ہے اور e, i, y, سے قبل 'ژ' کی مثلاً (Orange) اورونژ (ے)

لفظ کے آخر میں ساکن ہوجاتا ہے مثلاً (Long) نل و (گ)

(gn) یہ مرکب بہت دلچسپ ہے، کیوں کہ اس میں n کی آواز ما قبل نکلتی ہے اور ی میں تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً (Bologna) بولنیا اور (Digne) دی نی سے متلفظ ہوتا ہے —

(h) عموماً ساکن ہوتا ہے مثلاً (Rouber) رُو(ہ) ے ر یا (Havre) (ہ)اور (ے) لکھا جائے گا —

(j) ژ مثلاً (Janin) ژانی ن - (Majorca) مآژورک آ —

(l) ل

(ll) یہ دوسرا دلچسپ مرکب ہے، کیوں کہ اس میں (ll) ی کی آواز دیتا ہے - مثلاً (Fille) فی ی ے یا (Marseille) مآرس ی ی ے - اس مرکب کے بعد (e) ضرور آتا ہے اور خواہ وہ حرف کے آخر میں ہو یا درمیان میں کبھی ساکن نہیں ہوتا —

m — م
n — ن
} لیکن حروف یا کسی ٹکڑے Syllable کے آخر میں ہوں تو غنہ ہو جاتے ہیں، جن کو علی الترتیب 'م' 'ن' لکھا جائے گا —

(P) = پ لیکن جب (t) سے قبل ہو تو ساکن ہوگا، مثلاً (Prompt)
پ ر و م (پ) (ت)

(q) } = ک
(qu)

(r) = ر

(s) = س لیکن جب دو حروف علت کے درمیان ہو تو ز کی آواز دیتا ہے۔ مثلاً (Casale) ک آ ز آ ل (ے)—

حروف کے آخر میں ساکت ہوتا ہے، مثلاً (Orleans) او ر ل ے ا و ن (س)

(ss) = س۔ (Rousseau) روس و

(sc) = ک، لیکن اگر اس کے بعد e, i, y, ہو تو 'س' کی آواز دیتا ہے۔ مثلاً (Scioto) س ی و ت و

(t) = ت، لیکن حروف یا ٹکڑے کے آخر میں ساکن ہوتا ہے، مثلاً
(Rochefort) ر و ش (ے) ف و ر (ت)

(th) = ت، کیوں کہ t عموماً ساکن ہوتا ہے، مثلاً (Thiers) ت ی ے ر (س)

V } = و۔ مثلاً (Weber) و ے ب ے ر—
W

(x) = کس، لیکن جب a سے ماقبل ہو تو گز کی آواز دیگا۔ مثلاً
(Alexander) آ ل ی گز ن ڈ ے ر—

(y) = ی

(z) = ز

اسی طرح دوسری زبانوں کے قواعد مرتب کئے جا سکتے ہیں، البتہ اُن زبانوں کے واسطے، کوئی معلوی اصول قائم کرنا مشکل ہے، جو یا تو مردہ

ہوچکی ہیں یا انہوں نے ابھی تک لاطینی زبان کے حروف تہجی کو اختیار نہیں کیا۔ اس کے متعلق میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ ہمارے واسطے سہل ترین نسخہ یہی ہے کہ ہم بجائے اصل کی طرف دوڑنے کے ان کی لاطینی شکل سے اعتنا کریں اور اِن کے قواعد جہاں تک ممکن ہوسکے اصل کے مطابق مرتب کر لیں، تاکہ تلفظ میں خامی نہ رہ جائے —

آئندہ اشاعت میں کوشش کی جائے گی کہ فرانسیسی کی طرح دوسری السنہ کے قواعد تلفظ کو بھی مشرح طور پر بتا دیا جائے اور اگر ملک اس اسکیم کو منظور کر لے تو گویا ہماری زبان میں ایک بیش بہا اضافہ ہوجائے گا۔ جہاں تک مجھ کو علم ہے کسی مشرقی زبان نے اس قسم کا اصول ایجاد نہیں کیا، حتیٰ کہ مصر بھی با وجود اس قدر ترقی یافتہ ہونے کے، اس بارے میں دوسرے ممالک کے دوش بدوش ہے، اور ان کے ہاں بھی مغربی ناموں کو معرب کرنے کا کوئی ایک اصول مقرر نہیں—

اب میں چند فرانسیسی نام بطور مثال کے پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ ان کو اُردو سانچے میں کس طرح ڈھالا جائے —

۱ Louis le Blanc یوں لکھا جائے گا۔ "ل وُ ی (س) - لُ - ب ل و نْ (ک)
کیوں کہ l = ل ou = وُ i = ی و = ساکن، Le = لُ b = ب
l = ل an = و ن c = ساکن

۲ Count de Maurepas = ک وُ نْ (ت) ڈ م و ر (ے) پ آ (س)
چونکہ c سے قبل ہے اس لئے ک کی آواز دے گا۔ ou = وُ
n = نْ t چونکہ آخری ساکن ہے۔ t = ساکن de = ڈ m = م

---

* de le کو غلطی سے بعض لوگ ل ے اور ڈ ے اور بعض ل و اور ڈ و لکھتے ہیں لیکن یہ زیادہ صحیح نہیں —

au = و r = ر e = ے p = پ a = ا s = ساکن

۳ (Chateauroux) = ش آ ت و ر وٗ (کس) ch = ش a = آ t = ت

eau = و r = ر ou = وٗ x ..... کس، لیکن چونکہ آخر میں ہے

اس لئے ساکن ہوگا —

۴ Queret Demery = کے ر ے (ت) د ے م ے ر ی - qu = ک

e = ے r = ر e = ے t = (ت) (ساکن) d = د e = ے

m = م e = ے r = ر y = ی —

[ باقی آئندہ ]

# مرزا غالب کا ایک غیر مطبوعہ رقعہ

(یہ رقعہ ہمیں جناب سید فرخ حیدر صاحب بی - اے ' ایل ایل - بی (علیگ) شمس آباد ضلع فرخ آباد نے عنایت فرمایا ہے جس کے لئے ہم صاحب موصوف کے بہت شکر گزار ہیں - اس میں حروف تہجی وغیرہ کی تذکیر و تانیث اور بعض اور ادبی نکات سے بحث ہے - خط میں تاریخ درج نہیں ہے - اڈیٹر)

سعادت و اقبال نشاں مرزا یوسف علی خان کو بعد دعا کے دل نشین ہو کہ تانیث و تذکیر ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں - اے لو "لفظ" اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے ' اہل پورب اس کو مونث بولتے ہیں - خیر جو میری زبان پر ہے وہ میں لکھہ دیتا ہوں ' اس باب میں کسی کا کلام حجت و برہان نہیں ہے - ایک گروہ نے کچھہ مان لیا ایک جماعت نے کچھہ جان لیا ' اس کا قاعدہ منضبط نہیں - الف مذکر ' ب ت ث مونث - ج مذکر ' ح خ مونث - دال ذال مونث ' رے زے مونث - سین شین مذکر ' ص ض ط ظ مونث - عین غین مذکر ' ف مونث - قاف کاف لام میم نون مذکر - واو ہے ی مونث ' ہمزہ مذکر - لام الف حروف مفردہ میں نہیں مگر بولنے میں مذکر بولا جاے گا ' لام الف کیا خوب لکھا ہے کہیں گے ' کیا خوب لکھی ہے نہ کہیں گے —

خزادہ خداوند زادہ کا مخفف ہے ' لیکن فارسی نہیں عربی نہیں ' اردو کا روزمرہ تھا ؛ خزادہ خزاہ ی مرادف صاحبزادہ صاحبزادی ہے ' مگر فی زمانہ متروک ہے ۔ "فق" فارسی لغت نہیں ہوسکتا عربی بھی نہیں ' روزمرہ اردو ہے جیسا کہ میر حسن کہتا ہے —

کہ رستم جسے دیکھہ رہ جاے فق

شعراے حال کے کلام میں نظر آتا ۔ "تکیہ" لفظ عربی الاصل ' فارسی اردو میں مستعمل ' دونوں زبانوں میں ہم بمعنی بالش اور ہم بمعنی مکان فقیر آتا ہے ' ایران میں تکیہ صائب مشہور ہے ۔ "گل تکیہ" لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے ۔ گل مخفف گال کا اور تکیہ بمعنی بالش ۔ وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں ' گل تکیہ کہلاتا ہے ۔ گل بمعنے پھانسی انگریزی لغت ہے انگریزی زبان سے بنگالہ میں سو برس سے اور دلی اکبر آباد میں ساٹھہ برس سے رواج پایا ہے ۔ گل تکیہ وضع کیا ہوا نورجہان بیگم کا ہے ۔ جہانگیر کے عہد میں اہل ہند کیا جانتے تھے کہ گل کیا چیز ہے —

"معنی مفرد بہ تلفظ جمع" اس جملے کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا ۔ معنی مفرد معانی جمع ۔ اور یہ جو اردو کے محاورے میں تقریر کرتے ہیں کہ اس شعر کے معنے کیا ہیں یا اس شعر کے معنے کیا خوب ہیں ' اس میں دخل نہیں کیا جاتا ' خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے ' معانی کی جگہہ معنے بولتے ہیں ۔ "رت" لفظ ہندالاصل رتھہ ہے بہ ہائے مضمرہ ' بعض مذکر بولتے ہیں بعض مونث ۱۲ شعر بہت اچھا ہے صاف و ہموار —

راقم غالب

# جنگ نامۂ سید عالم علی خاں

از

ادیتر

فرخ سیر کے عہد سے لیکر محمد شاہ بادشاہ کے کچھ زمانے تک سید عبداللہ خاں (قطب الملک) اور سید حسین علی خاں (امیر الامرا) سادات بارہ سلطنت کے مالک و مختار تھے۔ یہ بادشاہ گر تھے اور بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی تھے۔ نواب نظام الملک (آصف جاہ) سے ان کی ان بن ہوگئی تھی۔ اس لئے دربار شاہی سے دور رکھنے کے لئے رفیع الدرجات کے عہد میں ان کو صوبہ داری مالوہ پر مامور کیا گیا۔ نظام الملک بہادر نے انکار میں مصلحت نہ دیکھی اور با دل ناخواستہ تعمیل حکم کی اور وہاں کے نظم و نسق میں مصروف رہ کر اس خطے کو مفسدوں سے پاک کیا۔ چونکہ سادات کو نظام الملک بہادر کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور کثرت فوج کی وجہ سے اندیشہ ہوگیا تھا، حسین علی خاں نے نظام الملک کو لکھا کہ دکن کے صوبوں کے انتظام کے لئے ہمارا ارادہ ہے کہ ہم صوبۂ مالوہ میں رہیں آپ اپنے لئے اکبر آباد، الہ آباد، ملتان، برہانپور کے صوبوں میں سے کوئی ایک صوبہ انتخاب کر لیں۔ نظام الملک اس سے بہت مکدر ہوئے اور اس کا جواب کسی قدر درشتی کے ساتھ دیا۔ امیر الامرا اور قطب الملک نے نظام الملک کے وکیل کو خلوت میں بلاکر سخت سست کہا۔ جب اس کی خبر نظام الملک کو پہنچی تو وہ آمادۂ پیکار ہوگئے۔ کہتے ہیں کہ اس میں محمد امین خاں کے توسط سے شاہی اشارہ بھی تھا۔ غرض انہوں نے اپنے رفقا کو ساتھ لیکر دکن کی جانب کوچ کیا اور نربدا کو عبور کیا۔ (وسط جمادی الآخر سنہ ۱۱۳۲ ھ مطابق مئی سنہ ۱۷۲۰ ع)۔ جب امیر الامرا کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے

دلاور علی خاں بخشی ' راجہ بھیم سنگھ اور راجہ گنجک سنگھ (فلعدار) کو نظام الملک کے تعاقب کے لئے بھوجا - نظام الملک کا ستارہ عروج پر تھا قلعۂ اسیر اور قلعۂ برھانپور بغیر جنگ و جدال کے ھاتھ آے اور انور خاں صوبیدار برھانپور اور عوض خاں صوبیدار برار اور رنبھا سردار مرھٹہ اور بہت سے زمیندار اور پٹھان اُن کے شریک حال ھوگئے - جب دلاور علی خاں کا لشکر کوچ کرتا ھوا برھانپور سے جانب مشرق چودہ کوس پر پہنچا تو نظام الملک نے اپنا لشکر اس کے مقابلے کے لئے غیاث خاں کی سرکردگی میں روانہ کیا - لڑائی میں دلاور علی خاں اور اس کے دونوں راجہ رفیق مارے گئے (۱۹ جون سنہ ۱۷۲۰ ع) —

سید عالم خاں بارہ جس کی عمر بیس سال کی تھی (دیکھو شعر ۳۶) فرخ سیر کے وزیر سید عبداللہ قطب الملک کا بھتیجا اور متبنیٰ تھا - وہ اپنے دوسرے چچا سید حسین علی خاں کے دھلی چلے جانے پر (دسمبر سنہ ۱۷۱۸ ع) دکن کے چھ صوبوں کا صوبیدار یا نائب صوبیدار مقرر کیا گیا تھا (شعر ۳۶) - اسے نظام الملک کے مقابلے کے لئے احکام پہنچے تو وہ فوج لے کر فردا پور میں جو اورنگ آباد سے ۶۰ میل کے فاصلے پر برھانپور اور اورنگ آباد کے درمیان واقع ھے ' خیمہ زن ھوا - نظام الملک برھانپور سے مقابلے کے لئے روانہ ھوے - جب نظام الملک کے لشکر نے دریاے پورنا سے عبور کیا (۲۰ جولائی سنہ ۱۷۲۰ ع) تو عالم علی خاں ۵ شوال سنہ ۱۱۳۲ ھ کو مع اپنے رفقا متھور خاں (دیکھو شعر ۳۱۶) ' غالب خاں (شعر ۲۵۳ ' ۳۰۵) عمر خاں (شعر ۱۶۸ ' ۲۶۳ ' ۳۷۴) میتھے خاں (شعر ۱۶۸ ' ۲۵۳ ' ۴۰۷) محمد بیگ (شعر ۱۶۸ ' ۲۵۴) ' امین خاں (۱۲۵ ' ۲۵۶ ' ۲۵۹) غیاث الدین خاں ' خواجہ رحمت اللہ ' فدوی خاں وغیرہ اور سرداران دکن و مرھٹہ مقابلے کے لئے آگے بڑھا - نظام الملک نے مرحمت خاں کو اپنے فرزند غازی الدین خاں کی معیت میں ھراول کیا اور عبدالرحیم خاں ' وھابت خاں ' غیاث خاں ' اختصاص خاں وغیرہ کو میمنہ و میسرہ پر

مقرر کرکے خود مع عوض خاں قول لشکر میں متمکن ہوے —

عالم علی خاں بڑی مردانگی اور شجاعت سے لڑا اور اگرچہ اس کا سارا بدن زخموں سے چور تھا مگر اُس کا ہر قدم آگے ہی بڑھتا تھا - آخر اسی طرح لڑتے لڑتے یہ بہادر نوجوان اس دنیا سے کوچ کر گیا —

اس کے بعد سیدوں کے خاندان نے دولت آباد میں پناہ لی (دیکھو شعر ۴۰۱) خافی خاں کی تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے -

مجھے اس جنگ نامے کے تین نسخے دستیاب ہوے - ایک نسخہ میرا ذاتی ہے اسے (ا) سے تعبیر کیا گیا ہے - دوسرا نسخہ مجھے مولوی عبدالحمید صاحب وکیل کلو نے عنایت فرمایا جو (ب) سے موسوم ہے - اور تیسرا وہ نسخہ ہے جو مسٹر ولیم آروِن (William Irvine) نے مہاراجہ بنارس کے کتب خانہ سے حاصل کیا اور رسالہ انڈین اینٹی کیوری (Indian Antiquary) بابت ماہ جنوری و مارچ سنہ ۱۹۰۴ ع میں مع انگریزی ترجمے کے شایع کیا - یہ نسخہ (ج) ہے —

مسٹر آروِن کا نسخہ اول و آخر سے ناقص ہے - عبدالحمید صاحب کے نسخے میں شروع کے کچھ اشعار غائب ہیں - میرا نسخہ مکمل ہے اور اس کی ترتیب اور تحریر دوسرے نسخوں سے بہتر ہے - اس لئے میں نے اس نسخے کو بنیاد قرار دیا ہے - البتہ دو ایک جگہ ایک ایک مصرع غائب ہے اور بعض مقامات پر کوئی کوئی لفظ رہ گیا ہے - کہیں کہیں مصرع پورا کرنے کے لئے قیاس سے جو لفظ بڑھا دئے ہیں انہیں قوسین میں لکھ دیا ہے - دوسرے نسخوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی ظاہر کردیا ہے - تینوں نسخوں میں اشعار کی کمی بیشی بھی پائی جاتی ہے - جو اشعار نسخہ (ا) میں نہیں اور دوسرے نسخوں سے اضافہ کئے گئے ہیں ان پر علامت + لگا دی گئی ہے اور جن اشعار پر × نشان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دوسرے نسخوں میں نہیں ہیں —

مسٹر ولیم آروِن نے اس کا مصنف "سودشت" بتایا ہے - انہیں اپنے نسخے کے ایک شعر سے دھوکا ہوا ہے - ملاحظہ ہو شعر ۴۱۴ ان کے

نسخے میں اس شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے —

سو دشتا یہ کیا کیا ستم ہا ے ہا ے

" سود شتا " الف ندائیہ اور " سودشت " تخلص قرار دیا ہے - یہ صحیح نہیں ہے یہ لفظ " دشتا " ہو گا کاتب نے غلط لکھہ دیا - دوسرے نسخوں میں یہ مصرع اس طرح ہے —

سو ایسا ستم پو ستم ہا ے ہا ے

یا یہ ممکن ہے کہ ایسا کو کاتب دشتا لکھہ گیا - کاتبوں سے یہ بعید نہیں - اب انھیں یہ فکر ہوی کہ اس نظم میں فارسی عربی کے لفظ بکثرت ہیں یہ ضرور کسی مسلمان کی لکھی ہوی ہے اور " سودشت " ہندی لفظ ہے تو انھوں نے یہ تاویل کی کہ اکثر مسلمان مصنف جب کوی چھوٹ ہندی میں لکھتے تھے تو اس میں تخلص بھی ہندی رکھتے تھے —

آرون صاحب کے منشی نے مصنف کو پنجابی بتایا ہے مگر خود وہ اسے بالای دواب کا خیال کرتے ہیں جہاں کے سادات بارہ رہنے والے تھے - لیکن اندرونی شہادت پر غور کرنے کے بعد انہوں نے یہ قیاس قائم کیا کہ مصنف دکنی ہے اور چونکہ ولی اس زمانے میں زندہ تھا اور ۱۱۳۲ ھ میں دہلی میں تھا اور یہ واقعات بھی اسی سنہ میں واقع ہوے اس لئے غالباً اس کا مصنف ولی ہے -

مسٹر آرون کا یہ قیاس بالکل صحیح ہے کہ مصنف دکنی ہے ' زبان صاف بتاتی ہے - لیکن مصنف کے متعلق ان کا قیاس غلط ہے - اس میں وہ مجبور تھے وہ اپنے نسخے کو کامل سمجھے ہوے تھے ' حالانکہ آخر سے کئی شعر غائب تھے - مصنف نے خود آخر میں اپنا نام بتادیا ہے - اگر یہ شعر ان کے نسخے میں ہوتا تو انھیں یہ الجھن نہ ہوتی —

یہ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے - اس میں جو نام اور سنین آئے ہیں وہ تاریخ کے رو سے بالکل صحیح ہیں - مصنف کو عالم علی خاں سے ہمدردی معلوم ہوتی ہے- اور وہ حق بجانب ہے- اس سن میں جس دلیری اور جھوٹ سے لڑ کر اس نے جان دی ہے وہ بے شبہ

لائق تعریف ہے ۔ یہاں تک کہ نظام الملک کے طرف دار مورخوں نے بھی اس کی بہادری کی تعریف کی ہے ۔ نظم سادہ ہے اور کہیں تصنع اور تکلف سے کام نہیں لیا ۔ بعضے اشعار موثر بھی ہیں خصوصاً جب عالم علی خاں ماں سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں اور رخصت ہوتے ہیں یا جب عالم علی خاں کے مرنے کی خبر آتی ہے اور ماں اس کا ماتم کرتی ہے —

## یافتاح بخشندہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱) اول حمد واجب ہے کرتار کا
دو عالم کے وارث خریدار کا

(۲) قضا اور قدر جس کے ہے ہاتھ میں
نہیں شک شبہہ کچھہ کسی بات میں

(۳) حکم ہات اوس کے ہے حاکم ہے وہ
سگل عیش و عشرت کا عالم ہے وہ

(۴) نرنجن نرا دھار سبحان ہے
خدا وند برحق سہر بان ہے

(۵) ہے خداوند قدرت کا قادر ہے وہ
نہیں دور ہر حال حاضر ہے وہ

(۶) کہ دیدے سرو پاے جلوہ سپہر
دیوے راج سر پر رکھے تاج سر

شروع کے بیس شعر نسخہ (ب) سے لئے گئے ہیں نسخہ (ا) میں یہ موجود نہیں نسخہ (ج) میں بھی ابتدائی حصہ غائب ہے اور ۴۳ ویں شعر سے شروع ہوتا ہے —

( ۷ ) اچھے کس کوں حافظ رکھے ہر قرار
خطا بخش مہر باں پروردگار
( ۸ ) خرابی میں جس کے اشارہ کرے
اُوسے ایک پل میں اوارہ کرے
( ۹ ) کرے لطف کی جس کے اوپر نظر
دیوے راج سر پر پھراوے چھتر
( ۱۰ ) کرے ملک سب اس کی تسخیر میں
گھماوے حکو مت کی زنجیر میں
( ۱۱ ) رکھے عمر دولت کا روشن چراغ
کرے دل کوں ہر غم سوں اوس کے فراغ
( ۱۲ ) رکھے رنگ قدرت کا انساں میں
مکرم کیا اس کوں جس شان میں
( ۱۳ ) جو کچھہ کھیل کھیلے سزاوار ہے
مزا حم نکوی اس کا اظہار ہے
( ۱۴ ) کیا کن کے کہنے میں سارا ظہور
کفر ہو راسلام ظلمات نور
( ۱۵ ) جو واقف ہے وحدت کے میداں کا
ہے غالب ہو عالم کے سبحان کا
( ۱۶ ) لیجانے لگے جس کے ایماں کوں
مسلط کرے نفس شیطاں کوں
( ۱۷ ) رکھے تابد اوس کوں گمراہ کر
سعادت کے راہاں سوں بیراہ کر

(۱۸) جبھے بے خبر حق سوں ہے حال میں
گرفتار دنیا میں جنجال میں
(۱۹) نجانے خدا کوں نجانے رسول
کرے عاقبت اپنی سب خاک دھول
(۲۰) اوسے ہے خبر جس کوں محرم کیا
دنیا کی محبت سوں بے غم کیا
(۲۱) یو دیکھو (ن) شیراں (ن) کوں سرکھاے ہیں (ن) - ہے (ن) - شیروں کے
انک اس کے پیالے میں پیتاے ہیں
(۲۲) غنیمت سمجھ عمر کیا شور ہے
انکھیاں کھول کر دیکھ انگے گور ہے
(۲۳) یو دھن مال آخر کوں رہ جائیگا
جو کچھ یہاں کیا ہے سو واں پائیگا

در نعت محمد مصطفیٰ علیہ السلام

(۲۴) محمد نبی پر درود (ن) اور سلام — ن / ب و
(ن) جتے اہل اصحاب سب پر مدام — ن / ب جتے آل اصحاب یو نت مدام
(۲۵) شفیع ہے خلائق کے کردار کا
مقرب خدا کے سو دربار کا
+ (۲۶) اول ہیں ابا بکر روشن ہلال
صدق اور بزرگی میں ہیں بے مثال
+ (۲۷) دوجے ہیں عمر یار صاحب وقار
کہ دائم نبی سوں رہے یار غار

(۲۸) + تیجے یا رعنما ن اہل جاں
جنو کہا جمع سا را قرآن
(۲۹) + کہ چوتھے علی شاہ عادل سوار
جنو کی کمر میں رہی ذوالفقار
(۳۰) + سبھی چار یاراں میں اہل قدر
حشر کے ہیں مسندکےصاحب صدر
(۳۱) زہے پنجتن ہیں خدا کے ولی
ہراں سو ہوا دین روشن جلی
(۳۲) کہا یوں حکایت غنیمت بیاں (ن) (ن/ب) سنو اس حکیمت کا کیا ہے بیاں
سنو جاں دل سے تمیں بے گماں
(۳۳) عزیزاں! یو قصہ ہے طوفان کا
اس عالم علی صاحب شان کا
(۳۴) قضا نے سو ہر حال آخر زماں
کہے ہیں نبی سوچ دستا عیاں
(۳۵) عزیزاں یو سب ہیچ در ہیچ ہے
یو قصہ عجب پیچ در پیچ ہے
(۳۶) سنو دوستاں! ابتدا جنگ کا
زمانے کی گردش و نیرنگ کا
(۳۷) ہے عالم علی سید نام دار
دکھن کے چھےصوبوں میں صاحب مدار
(۳۸) X نہ دشمن کسی کا نہ کس سوں فساد
و سیہ جواں مرد عالی نژاد

(۳۹) رہے شہر میں صوبہ‌داری کرے
تماشے کوں سواری شکاری کرے
(۴۰) X رہے رات دن سب سے اخلاص سوں
نہ دھوکا دھمک کس کے وسواس سوں
(۴۱) نیت خوب صورت و صاحب جمال
کہ دنیاں میں کوئی نہیں اوس کے مثال (ن) ـــ ب ـــ ن کہ ثانی نہیں کوئی اسکے مثال -
(۴۲) عجب قد و قامت بڑی بہار کا
قد راضی اتھا کس کے آزار کا
(۴۳) لٹکتا چلے جب نکل ناز سوں
امیری کے پوشاک اور (ن) ساز سوں ـــ ن ـــ ہور شان -
(۴۴) دسے کل پیاراں میں پیارا لگے (ن) ـــ ن ب ـــ شکل جس کی تھا روں میں نہارا لگے
چلن چال اوس کا سو نیارا لگے چلن چال سکلیاں بھی نہارا لگے
(۴۵) جوانی میں (وہ) ریش آغاز تھا
نہنی عمر میں صاحب راز تھا
(۴۶) بڑا قد دسے جوں برس تیس کا
ولے عمر تھا بیس اکیس کا
(۴۷) رہے سب سوں ہل مل کے آرام سوں
نہیں کام کچھہ صبح اور شام سوں
(۴۸) یکا یک خبر آشکا را ہوا
گھر ے گھر یو غل اور پکارا ہوا
(۴۹) کہ لے کر نظام‌الملک فوج سات
چل آتا ہے سیدھا دکھن کیچ بات

(۵۰) سو ایتے میں آ کوئی خبر یوں سنیا
کہ اوترا نظام الملک نر بدا

(۵۱) تمن سات ہے جنگ ہشیاری کرو
لڑای کی بیگی تیاری کرو

(۵۲) X سنا ہور رہا دل میں اپنے عجب
لڑای ہمن سات کیا ہے سبب

(۵۳) ہوی بات سید پہ تحقیق جب
بلا بھیج ارکان دولت کوں سب

(۵۴) (ن) دعایاں اسم سب پڑھانے لگے — ن/ب — نذر جا بجا جب چڑھانے لگے
کہ نذراں بزرگاں چڑھانے لگے — دعایاں اسم تب پڑھانے لگے

(۵۵) X پکانے لگے ہر جنس کے طعام
کھلانے لگے دم بدم صبح شام

(۵۶) (ن) ہتی ہور گھوڑے تصدق سے — ن/ب — ہتی اونٹھ گھوڑے تصدق کئے
جو کچھہ لازماں تھا یوسب کچھہ گئے — جو کچھہ جگ میں کرناسوان سب کئے

(۵۷) تصدق دعایاں اتارن لگے
روپے اشرفیاں اتارن لگے (ن) — ن/ج — روپے خوان بھر بھر کے وارن لگے

(۵۸) جہاں (لگ) قطب غوث اور پیر تھے
جہاں لگ ولی خاص گنبھیر (ن) تھے — ن/م — خاطر

(۵۹) جہاں لگ جو کوئی صاحب ہوش تھے
زمانے کی گردش (ن) کے سرپوش تھے — ن/ب ج — آفت

(۶۰) X جہاں لگ مقرب تھے درگاہ کے
جہاں لگ ولی خاص اس راہ کے (ن) — ن/م — جہاں تک جو تھے خاص اس راہ کے

(۶۱) سدد سانگ سب (ن) سوں کیتا سوال
جہاں اگ قلندر تھے اھل کمال

ن
ب ج سکلیاں

(۶۲) میں فرزند علی کا ھوں آل رسول
کرو عرض میری تم ایتی قبول (ن)

ن
ب ج کرو عرض میرا تم اتنا قبول

(۶۳) پڑی ھے مجھے آ کے مشکل محال
تمہیں مل کے سب لیو مجکوں سنبھال (ن)

ن اچھے جھو ..... الخ
ب ن اچھے جان جب تگیں الخ
ج

(۶۴) رکھو لاج مردوں کے میدان میں
اچھے جان جب لگ میری جان میں (ن)

(۶۵) خدا باج نا کوئی مجھے یار ھے
اسی کے کرم کا مجھہ آدھار ھے

(۶۶) بلا پھر نجومی کھلایا نجوم
کہو غلغہ کیا ھے کیا دھام دھوم (ن)

ن
ب ج کہو کیا ھے یہ غلغہ کیا ھجوم

(۶۷) کہو دن یو کیا ھے ستارہ ھے کون (ن)
تم کس کی ھے اور آوارہ ھے کون

ن
ج کہو دن ھے کیسے ستارہ ھے کون

(۶۸) X وو آیا ھے کیوں کس طرف چال ھے
کہو عاقبت کوں سو کیا حال ھے

(۶۹) x ھے غالب ھمنا پر یا مغلوب ھے
سنا دو شتابی جو کچھہ خوب ھے

(۷۰) اچھے کا رمل میں سو سب بول دیو
بھلا اور برا ایک بیک کھول دیو

(۷۱) X بنوازونگا تم کوں کرونگا نہال
اڑھاؤنگا تمنا موھالے و شال

(۷۲) کہے تب نجومیاں نے (ن) سب خیر ہے — ن/ج کہے سب نجو میاں نپٹ خیر ہے
ستاروں کی گردش تک پھیر ہے

(۷۳) یقیں ہے ہمں کوں فتح پاؤگے
فتح پاکے بیگی سوں پھر آؤگے (ن) — ن/ب فتح پا کے بیگی سوں گھر آؤگے

(۷۴) پوچھا بات بعضے فقیراں بلا
تمھاری اس بات میں کیا صلا (ن) — ن/ب سلا

(۷۵) کہے سب فقیراں سن اے نواب (ن) — ن/ب کہیں تب فقیروں نے سن اے نواب
شہر چھوڑ جانا نہیں ہے ثواب — شہر چھوڑ جانے میں نہیں کچھ صواب

(۷۶) نجومی کہے ہیں خوش آمد کی بات
کہاں علم کامل ہے ان (ن) بیچ ہات — ن/ب کہواں کے

(۷۷) نہ امرا کو کوئی صاحب فوج ہے
سپاہی نہ کوئی صاحب اوج ہے (ن) — ن/ج شتابی کے کرنے میں کیا بوجھ ہے

(۷۸) نوی فوج ، لشکر نوا ہے (ن) سپاہ — ن/ب ج کل
دغا ہے دغا ہے دغا خواہ مخواہ

(۷۹) اٹھے ہول یاراں سبھی اور شاہ
یو کیا باب ہے تمدا بوجھو صلاح

(۸۰) X اچھیں خیر خواہی میں مستقیم
اوسے بس کفایت کریگا علیم

(۸۱) سپاہی نجانوں (ن) کہ کل باگ ہیں — س/ب نہ ہو جو
صف جنگ سیں ایک سوں (ن) یک آگ ہیں — س/ب سے ، ن/ج تیں

(۸۲) سکت کیا جو کوئی روبرو ہوسکے (ن) — ن/ج سکت کیا جو کوئی روبرو ہو کھڑا
زمین چھانڈ کے کوئی نہ ہرگز ٹلے — ج کھڑا ہو تو چھڑیوں سیں دینگا اُڑا

(۸۳) شجاعت میں (ن) ایک زور (ن) بازو کریں سوں، تیں
پہاڑاں اچھیں تو (ن) تراز و کریں گر

(۸۴) کہ یو فوج ہے آج دشمن شکن
اگر ہوے جمع ہند سارا دکھن (ن) اگر ہو جمع ہند، اگر سبھہ دکھن

(۸۵) کریں تل اوپر مار تلوار سوں
سکل فوج لشکر کے سردار کوں (ن) سکل فوج اور ان کے سردار کوں

(۸۶) لڑیکا وو ہی سرہ میدان میں
شجاعت ہے جس سرہ کی شان میں

(۸۷) قدیموں کی اپنے کرو دلبری
یو ہے بات بھاری نہیں سر سری

(۸۸) قدیماں کا اس واسطے مان ہے
سمجھیا ہے وو جس میں کچھہ گیان ہے

(۸۹) رہے ہو کے تم شاہ اندیشہ ناک (ن) رہے شاہ تب ہو کے الخ
تمہارا ہے حافظ وو اب ذات پاک تمہارا ہے حافظ وہی ذات پاک

(۹۰) یوں کر (ن) دل میں مت لاؤ (ن) اس بات کا برا لینا
بھروسہ نہیں کوں ہے اس سات کا بھروسہ نہیں ہم کوں اس سات کا

(۹۱) فتح ہے فتح پر فتح کار ہے (ن) فتح ہو فتح ان اڑا مار ہے
عزیزاں تمہارا خدا یار ہے (ن) فتح ہی فتح ہے سہری یار ہے

(۹۲) کہے سن کے نواب نے ایتی (ن) بات اتنی
کہ مرنا و جینا ہے سب رب کے ہات

(۹۳) جو یاری دے ہمنا نکل جاے گا (ن) جو بازی دی ہمنا کو مل جاے گا
جئے تک وو دنیاں میں بچتا رہے گا جئے تک وہ دنیا سوں بچ آے گا

(۹۴) مجھے عار ھے عار انکار ھے ن
کہ تحقیق مرنا سزا وار (ن) ھے ج سو یک بار

(۹۵) کروں گا جو کچھہ مجھہ سوں ھوآوے گا
یہی نام مردوں کا رہ جائے (ن) گا ن/ب یہی نام دنیاں میں رہ جائے گا

(۹۶) نکاہ داشت کی خوبی کرنی کئے (ن) ن اندیشہ سوں کل دل کو خالی کیا
نکلنے کی بیگی اوتاولی کئے ب کہ چلنے کی بیگی شتابی کیا

(۹۷) X کسب چھوڑ بہوتوں نے گھوڑے لئے
سپر پا نک بہوتوں نے توڑے لئے

(۹۸) X یونہی دیکھنے کے لڑن ھار نہیں
یو ھے مار کا * سخت بیوپار نہیں * معرکہ

(۹۹) کرو گے جو کچھہ سو سمجھہ کر کرو
ھماری نصیحت یو دل میں دھرو

(۱۰۰) اتھے بیگ بیگی سوں گھر میں گئے
اتب سوں کھڑے پاس ماں کوں کہے

(۱۰۱) کہ تم ماں میں فرزند بڑے ماں کا (ن) ن/ب تمن ماں میں فرزند ھوں لاڑ کا
بڑے پیار (کا) ھور بڑے (ما) ن کا بڑے ماں کا ھور بڑے پیار کا

(۱۰۲) سنو تم کہ دلی بہت دور ھے
ھمارا اسم جگ میں مشہور ھے

(۱۰۳) نظام الملک کی خبر ھے گرم
نہیں اب تو رھتی نہ دستی شرم

(۱۰۴) حکم ھو وے تو بہار ڈیرا کروں
برھان پور لگ ایک پھیرا کروں

(۱۰۵) میں پوتا ہوں اس شیر مردان کا
ہوں فرزند نورالدین علی خان کا

(۱۰۶) مجھے بیٹھنا شہر (ن) میں ننگ ہے　　ب ن ج رہنا برا - بیٹھ رہنا برا
اگر آج رستم ستی جنگ ہے

(۱۰۷) یو سن کے کہیں گے سو قطب الملک (ن)　　ب ن ہنسیں گے مجھ اُپر آں قطب الملک
دکن میں گیا تھا نظام الملک

(۱۰۸) یو سن کے تعجب کریں گے نواب
کہ فرزند عالم علی کا میا ب

(۱۰۹) ذرا جیو کوں اور نکل نا سکا
شجاعت کا ناموس کچھہ نا رکھا (ن)　　ب ن نا کیا

(۱۱۰) دنیاں میں دوبارا کچھہ آنا نہیں
یو دنیا جلم لگ تھانا (ن) نہیں　　ج ن ٹھکانا

(۱۱۱) اگر ہے حیاتی تو پھر آویں گے
فتح پاے کے پھر موہ کوں دکھلاویں گے(ن)　　م ن فتح ہو تو مکھ آگے دکھلاویں گے

(۱۱۲) اپس دل میں ہمنا بسارو (ن) نکو　　ج ب اتارو
دعا میں اچھو نت بسارو نکو

(۱۱۳) پکڑ ہات سونپو خداوند کوں
رہو عیش آرام (ن) آنند سوں　　ج ب و

(۱۱۴) کہی ماں نے کیوں کر رضا دیوں تجھے
دکھن میں تیرے باج نہیں کوئی (ن) مجھے　　ن ہے کون

(۱۱۵) خدا باج ہم کوئی سنگاتی نہیں (ن)　　ج ب خدا باج کو تجھہ کوں ساتھی نہیں
مجھے مصلحت یو کچھہ بھاتی نہیں

(۱۱۶) نہنا بڑا کوئی نہیں سات ہے
تولڑنے کوں جاتا یو (کہا) گھات ہے (ن)

(۱۱۷) X قسم ہے تجھے سیر نواب کا
ہے سوگند تجھے میرے ماں باپ کا

(۱۱۸) X میرے دل ملے و ہم و سو اس ہے
میرے پاس ... ... ... ... ... ... *

(۱۱۹) X مجھے چھوڑ توں جا اکیلا نکو
یو جانے کا دل میں فکر نا کرو

(۱۲۰) بجد (ن) ہو بجد ماں کوں راضی کئے (ن ا)
بہر حال چلنے کی رخصت لئے (ن ا)

(۱۲۱) X میری ننگ و ناموس اور لاج کا
کہا ہے قسم تجھہ کوں معراج کا

(۱۲۲) X تیرا ملک تجھہ کوں مبارک اچھو
مدد تجھہ کوں ... ... † مبارک اچھو

(۱۲۳) چھہ سردار اس وقت سید کے پاس ن
سپاہی قدیم تھے و گھر کے خواص

(۱۲۴) توکل کیا اور کیا دل کوں تھیت
میں سید ہوں اب کیا دکھاؤنگا پیٹ

(۱۲۵) بلاے شتابی سوں دیوان کوں
کہا تم لکھو خط علی خان کوں (ن)

(۱۲۶) دکھن میں تمی مرد ہینگے مشہور (ن)
شتابی سے ہم پاس آنا ضرور

ن — توں جاتا ہے لڑنے یہ کیا بات ہے
ج

* نسخہ ا میں یہ شعر ناتمام ہے بقیہ دونوں نسخوں بھی موجود نہیں —

ن ا
ن — بہ جد و جہد — کیا - لیا
ج

ن — کیا اب لکھو خط امین خان کوں
ج ن دکھن میں تمین مرد ہوکے مشہور
ج شتابی ہمن پاس آنا ضرور

† نسخہ ا میں یہ شعر ناتمام ہے بقیہ دونوں نسخوں میں بھی موجود نہیں —

ن — چھہ سوار اس وقت سید کے پاس
ج سپاہی و چیلا و کل عام و خاص
(پہلے مصرع میں کچھہ غلطی ہوگئی ہے)

(۱۲۷) جلد آؤ اور مہر بانی کرو
رفاقت سوں مل جانفشانی کرو
(۱۲۸) کہ یو وقت ہے وقت اب کام کا
تمہاری شجاعت کے ننگ نام کا (ن) — ن / ب تمہاری شجاعت و ننگ نام کا
(۱۲۹) جو کچھہ تم کہوگے یہ سب ہے قبول
ہے شاہد ہمارا خدا کا (ن) رسول — ن / ب و
(۱۳۰) چلانے لگے جا بجا تھانہ تھانہ
روانہ کئے قاصداں ایک بارہ
(۱۳۱) نگہ داشت (ن) کا خوب گرمی کئے — ن / ب نگہہ داش
جنے جو منگیا سوئچ اس کوں دیے
(۱۳۲) اتھا بارواں ن ماہ رجب کا چاند — ن / ب اتھی بارویں
چلیا گھر سے شمشیر بکتر کوں باندھ
(۱۳۳) X زرہ بکتراں پاک کرنے لگے
جہاں کے تہاں خوب مرنے لگے
(۱۳۴) X کمانا و ترکش منگا بے شمار
لگے باٹنے فوج میں ایک بار
(۱۳۵) X شہر میں ڈھنڈورا پھرایا تمام
جہاں لگ سپاہی اچھے نیک نام
(۱۳۶) X پنجارے قصابی و سبزی فروش
اتھے دیکھہ دل میں ہرا سب کوں جوش
(۱۳۷) X کہ کلجڑے بھٹیارے و دھوبی حجام
بھڑاوی بہشتی لہار کئے آسلام

(۱۳۸) X کمر باندھہ تٹو پر ہو سوار ہو
لے نعل بند ... ... ... ہات دھو * * نسخہ ا میں یہ شعر ناتمام ہے '

(۱۳۹) کہا جا کے تیرا دیو میدان میں
محمدی باغ (ن ا) کے خوب اوچان (ن ۲) میں — ا نزک محمدی باغ — انچان

(۱۴۰) نقارے دمامے بجاتے چلے
روپے اشرفیاں (ن) لٹاتے چلے — لئی

(۱۴۱) X ب دسیوں سردار ساراں منے (ن) — دسے ہوں اوہ سردار ساریاں منے
دسے چاند سارا ستارا ں منے — کہ جیون چاند ہے کل ستاریاں منے

(۱۴۲) کیا جاکے ڈیرے میں وو دو (ن) مقام — بارہ ' — چار ایک
کرے ملک (ن) تدبیر ہر صبح شام — فکر

(۱۴۳) جہاں لگ تھے نوکر سپاہی امیر (ن) — جہان لگ تھے سردار ' جودھان ' بلی
بلا کر کہے خان روشن ضمیر — بلا کر کہا سید عالم علی

(۱۴۴) شہر چھوڑ تیرا میں باہر دیا (ن) — دیا
توکل خدا مصطفے پر کیا

(۱۴۵) کہ تم ہو سپاہی میں سردار ہوں
بھلے اور برے کامیں غمخوار ہوں (ن) — بھلا ' یا برا سب کا غم خوار ہوں

(۱۴۶) کہاں ہند یاراں کہاں ہے دکھن — بارہا
کہاں خویش قربت کہاں ہے وطن (ن) — کہاں خویش قریب (اور) کہاں ہیں ہمن

(۱۴۷) X ب کہاں سوں کہاں (ن) اور کدھر سوں کہاں — سوں
کہ بارے (ن ا) سوں قسمت نے لائی (ن ۲) یہاں — لے اوں — ا رہے

(۱۴۸) عزیزاں ! میں عالم علی خان ہوں
جوانی میں سگلیاں میں باجان ہوں

( ۱۴۹ ) جوانی کا کچھہ ڈل میں غم نہیں مجھے
مرن اور جیون کا وہم نہیں مجھے

( ۱۵۰ X ب میرے دل کوں رحمت سوں شاباش ہے
جوانی میں جیو کا ( ن ) بڑی آس ہے — جیونا ن ج

( ۱۵۱ ) جیوں وو بھلا جو انگے لاج ہے
وگر نہیں تو کیا تخت اور تاج ہے

( ۱۵۲ ) جئے لگ ہو یاراں میرے سات میں (ن) — جو لگ ہیں یاراں میرے ہات میں ب ج
رہو وقت جن (جنگ) کے میرے ہات میں اچھو وقت جنگ کے میرے سات میں

( ۱۵۳ ) جدھر مار کا آ پڑیگا وہاں ( ن ) — جدھر معر کہ آ پڑیگا ندان ن
( ن ) جدھر کے تدھر بار کرتا وہاں — وو ہر ایک ہو کر سو کرنا اوڑان ب ن ادھر ایک دل ہو کے کرنا ندان

( ۱۵۴ ) کرو مرد سی دل کوں مردانگی — نردو ہو ن ج
ہے مشہور مردوں کی مردانگی ج

( ۱۵۵ ) * ہے یاراں (ن) کا کل جگ منے ننگ نام — ہے بارے کا ل ہند میں نیک نام ن ب
میں منگتا خدا سوں یہی صبح شام میں منگتا ہوں نت آبرو صبح شام

(۱۵۶ ) جو آیا ہے وو پھر کے مرجائیگا ( ن ) — جو آیا ہے سو پھر وہ مر جائیگا ن ب ج
نہ کچھہ سات لایا نہ لے جائیگا

(۱۵۷ )X ب خبر سن مقاماں کی ماں مہربان
ترپنے لگے دیکھنے جھو پران ( ن ) ( ن ) ترپنا لگا جھو اور سبھہ پران

(۱۵۸ ) (ب) ج) گئی شہر کے باہر جا کر ملی (ن) — گئی شہر کے باہر ے جا ی ملی ن
نپت آرزو سوں لگا ے لگی ج نپت آرزو سوں لگایا گلی

(۱۵۹ ) کہے ماں سوں میں پھر تم کوں کہاں پاؤنگا
اگر جنگ میں سوں میں پھر آؤنگا — اگر جگ موں سو باز پھر آوں گا ن ج

---

* ہے کی بجاے غالباً رہے زیادہ موزوں ہو گا

(۱۶۰) عبث پھر کے تصدیع کیے تمن
پھر آتے تھے بیگی شتابی ہمن

(۱۶۱) نکو دل کوں تم بیقراری کرو
شہر کی طرف اب سواری کرو

(۱۶۲) کہی ماں نے نہیں چین دل کوں مجھے
میں دیکھوں گی پھر کر سو کس دن تجھے

(۱۶۳) کروں کیا مجھے صبر آتا نہیں
تیرے باج مجھ کچھہ سوبھاتا نہیں

(۱۶۴) یک یک دن مجھے ہے اک اک سال کا
خدا کوں خبر ہے میرے حال کا

(۱۶۵) نصیباں میں کیا ہے نہیں کچھہ خبر
کہ جیوناں ہوا ہے مجھے جیوں زہر

(۱۶۶) سنگا و سر و پا و دستار یو
میرے روبرو جواب دیو سب کوں

(۱۶۷) لے (ن) آئے سرو پا و بڑے مول کی
زر زر کشی و صاف لئی مول کی

(۱۶۸) ہولاے لطیف خان (ن) عمر خان کوں
محمد بیگ کوں او متھے خان کوں

(۱۶۹) زاہد خان جہاں لگ آتے اس پاس (ن)
پھر اے ... ... ... ... ... ... ...

(۱۷۰) سروپا و ہر یک کوں سو دینے لگے
سلام اور تسلیم لینے لگے (ن)

(ن) بلا کر

ن / ج — لطف خان

ن / ج — جہاں لگ تھے سردار تے روشناس
بلا بھیج کر سب کے آئیں پاس

ن / ج — بجالاے تسلیم، لینے لگے

(۱۷۱) کہی بعد ازاں سب کوں سوگند ہے
کہ عالم علی سبکوں دلبند ہے

(۱۷۲) نمک کی شرط سب بجا لاو گے
سوو ہیں پھر کے سب مرتبا پاوگے (ن) — ن — تو دل سا چھہ پھر ... ...
ج

(۱۷۳) خدا تم سبھوں کا نگہبان ہے
بڑی بست و نیا میں ایمان ہے

(۱۷۴) کئے عہد ساریاں نے سوگند کہا
کہ مالک ہمارا دلوں کا خدا

(۱۷۵) جب لگ * تن منے جیوہے دمبدم (ن) ن — * جلگ ہونا چاہئے
اچھیں گے حضوری میں ثابت قدم ج جب لگ جیوتن سوں ہے او دم میں دم

۱۷۹۶ قہ سوں قدم ہات سوں ہات جور ن کریں گے جب لگ ہوگی دشمن کی سوز
رہیں گے کہ جب ہووے دشمن کا زور (ن) ج (کریں گے کی جگہہ لڑیں گے اور جب لگ جگہہ جلگ ہونا چاہئے

(۱۷۷) ہمن دل سوں قربان ہیں جان نثار
رکھو دل کوں صاحب تمیں برقرار

(۱۷۸) کہی آفریں تم نمک خوار ہو
وفادار بے شک و غم خوار (ن) ہو — ن — دلدار

(۱۷۹) کیے ساں کوں تسلیم دینی سلام (ن) ج — ن — وداع ہو پراں ساں کو کہنا سلام
کیے کوچ بیگی سوں بس والسلام ج (پراں کی جگہہ بزاں ہونا چاہئے

(۱۸۰) چلے ہو کہ بیگی اوتر گھات کوں
لے کر لاو لشکر بڑے ٹھات سوں

(۱۸۱) گیے ایدلا باہ ڈیرا کیے
نمی دیکھہ کر پور سستی کئے

(۱۸۲) کہے فوج اپنی کا کیا ہے شمار
جو دیکھے تو موجود چالیس ہزار

(۱۸۳) تھے اتنے شتر نال گنج زبان
سنے کوئی شلک تو جاوے پران

(۱۸۴) تھے توپاں اتنے رھکلے بے شمار (ن) — ن رھکلے و توپاں تھے اتنے سنکات
ج کہے کیا نہیں کرئی کہنے کی بات

(۱۸۵) نظام الملک پر ہوا جب یقین
کہ اب جنگ ثابت ہے بے کات وشین

(۱۸۶) کہلا کر جو بھیجا سلام اور دعا (ن) — ن کہا یا سلام اور کہا یا دعا
لڑائی میرے سات کیا ہے نفا ج کہ لڑنا مرے ساتھہ کچھہ نہیں نفا

(۱۸۷) کہے میں دکھن میں مجھے عہدہ دار
لڑائی کا ست دیو دل سوں بچا

(۱۸۸) چلے جا و سیدھے ہندوستان کوں
چچا پاس اپنے تم آپان سوں

(۱۸۹) میں لڑکے سوں کیا تیغ بازی کروں
بھلا ہے جو کچھہ کا رسازی کروں

(۱۹۰) سنا جب خبر سید عالی جناب
کہا دیو بیگی سو اس کا جواب

(۱۹۱) ننھی عمر ہے پن میں لڑکا نہیں
کسی بات کا دل میں دھڑکا نہیں

(۱۹۲) میں سیدھوں تم دل میں کیا لائے ہو
میرے ملک پر چلکے کیوں آئے ہو

(۱۹۳) مجھے عار ھے عار انکار ننگ (ن) — مجھے عاری عار ھے عار ننگ
ج
چلے آو بیگی نہ لاؤ درنگ

(۱۹۴) اگر لاکھہ دو لاکھہ فرجاں ملیں
کہ (جس سے) طبق اسب زمیں کے ھلیں

(۱۹۵) میں وہ شخص ھوں جو کل ھار نہیں
شجاعت میری کس پر اظہار نہیں

(۱۹۶) اگر ھے حیاتی تو غم نہیں مجھے
اگر موت ھے تو وھم نہیں مجھے

(۱۹۷) جو مارا ھے قسمت میں میرے قلم
نہووے زیادہ و ناں ھووے کم (ن) — نہو گا زیادہ نہووے گا کم
ج

(۱۹۸) رضا پر میں راضی ھوں جو ھے رضا (ن) — میں راضی رضا پر ھوں جو کچھہ رضا
ج
وھی ھو ئیگا جو کریگا خدا ج وھی خوب ھے جو کرے گا خدا

(۱۹۹) میں راضی رضا پر ھو بندھا کمر
رکھا ھوں میں القصہ حق پر نظر

(۲۰۰) خدا کا کرم مصطفے کی پناہ
میں رکھتا ھوں اس بات پر سب نگاہ

(۲۰۱) بہر حال لے فوج اُتر یا نہی (ن) — بہر حال اوہ فوج اتری نہی
ج
پکڑ دل میں دعوی وو دنہی ہی پکڑ دل منے دنہ دعوی ہی

(۲۰۲) ایدھر سوں یو لشکر اودھر سوں وو فوج

(۲۰۳) پڑی آکر جس میں سمندر کی فوج (ن) — پڑے ا نزک جوں سمندر کی فوج
ج
تفاوت رہا کوس دو چار کا
حکم تب ھوا اس جو کرتار کا

(۲۰۴) حکم تب ہوا صاحب ذوالجلال (ن) — ن ج نپت داب آپی لگے تب ابھال
برسنے لگیا رات دن برشگال

(۲۰۵) کتیک دن سو گزرے اسی بات کوں
دیا کوئی خبر آ ادھی رات کوں

(۲۰۶) صبا جنگ ہوئیگا یو ہے خبر
یہی ذکر لشکر میں ہے گھر بہ گھر

(۲۰۷) کہا جھوٹ ہے کر کیا اعتبار (ن) — ن کہا جھوٹ ہے یا نہیں کیا اعتبار
ہمارے ہیں جاسوس ہر ٹھار ٹھار ج ہمارے ہوں جاسوس ہوی ہوشیار

(۲۰۸) نجانے کہ جاسوس و قاصد تمام
ہوے ہیں نظام الملک کے غلام

(۲۰۹) تھی تاریخ چھٹی ماہ شوال کی
بڑی نحس تر سخت جنجال کی

(۲۱۰) اتھا روز ایتوار کا نا بکار
گھڑی تھی وو مریخ کی آشکار (ن) — ن اشکبار
ج

(۲۱۱) تھی ساعت اوساعت بہت خوں فشاں
ستارہ زحل کا اتھا بے گماں

(۲۱۲) صبح کے وقت سیہ نیک کام
اوتھا بولتا ہوا بے خوش کلام (ن) — ن اتھا اوز لکا بولنے خوش کلام

(۲۱۳) کہو کیا خبر آج ہے دوستاں
اُتھا بول بھگی سے عباس خاں

(۲۱۴) خبر جنگ کی آج ہے ٹھار ٹھار
یہی غل ہے سب فوج مہیں آشکار

(۲۱۵) سو جاسوس ایسے مہیں آیا شتاب
پسینے میں دستا ہے جیوں غرق آب

(۲۱۶) کھڑا ہوکے بولیا کہ اے دستگیر
نظام الملک فوج لے کر کثیر

(۲۱۷) نقارا کرایا ہے اے قبلہ گاہ
حکم کر جو تیار ہووے سپاہ

(۲۱۸) وو عالم علی سید مہرباں
شجاعت کا ظاہر ہے جس میں نشاں

(۲۱۹) سنا سوئچہ بکتر منگایا شتاب
ہوا مستعد خاں عالی جناب

(۲۲۰) کہا لاؤ میرا جو کچھہ ساج ہے
مجھے کام دشمن ستی آج ہے

(۲۲۱) کٹاری و نیزہ و شمشیر لاؤ
جو ترکش ہیں خاصے سو بیگی منگاؤ

(۲۲۲) منگاؤ میرا خود توڑا منگاؤ
میرے خاص گھوڑوں کوں پاکھر لگاؤ

(۲۲۳) منگاؤ کمانیں میری سات کیاں
کہ ہیں رات دن وو میری ہات کیاں

(۲۲۴) منگاؤ سپر آہنی پھول دار
کہ رہتے ہیں وونت میرے گلے میں ہار

(۲۲۵) منگاؤ میرا بانک خنجر منگاؤ
میری خاص پالکی کوں جھالر لگاؤ

(۲۲۶) میرے ہاتی کوں جاکے صندل لگاؤ
وقت لٹی ہوا ہے درنگ مت لگاو
(۲۲۷) کیا جا غسل کر اوٹھایا دو ہات
کہا یا نبی سرور کائنات
(۲۲۸) تمن کوں میری آج یو لاج ہے
مدد کوی تم بن نہیں آج ہے
(۲۲۹) کمربانده بہاتا اشکوں پنہال (ن) ن کمربانده هتیار اس کو سنبہال
لگیا پونچھنے سوکوں دے دے رومال ج
(۲۳۰) کہا لا وحقا دو دم ذرق ہے
کہ حقے سوں ہمنا بڑا شوق ہے
(۲۳۱) خبردار اتنے میں لایا خبر
کہ بیٹھے ہو کیا سید شیر نر
(۲۳۲) نظام الملک فوج کل سات لے
تمہارے امیراں کے دل ہات لے
(۲۳۳) کیا ہیکا سب فوج بلندی سوپہال (ن) ن کہا تم اوپر فوج بلندی سوں چال
فتح دیوے تمناں کوں رب ذوالجلال ج
(۲۳۴) اگر نہیں خبر کس کوں کچھ علم غیب
سبوں کا سودستا ہے دل (ن) پرفریب ن بالکل قریب
(۲۳۵) سنا سوئیچھ قاصد کوں جھڑکا دیا ج
حقا سامنے تیا سو سر کا دیا
(۲۳۶) کہا لوگ میرے وفادار ہیں
میں چاکر سمجھتا نہیں یار ہیں

(۲۳۷) سبھی ایک جیو ہیں وسب ایک تن
شجاعت ملے ہینگے یک یک رتن

(۲۳۸) یو دانے تسبیح کے میں امام
رہیں ایک ہو کر سو ہل مل مدام (ن)

(۲۳۹) میرے سات کیونکر جدائی کریں
مجھے چھوڑ کیوں روسیاہی کریں

(۲۴۰) لڑتا یا ہوں اون پر یو سب ملک مال
نظام الملک کیا کر یگا نہال

(۲۴۱) اوٹھا بول سب کوں سواری کرو
دنیا سہل ہے دل سوں یاری کرو

(۲۴۲) رفاقت کرو زندگی سہل ہے (ن)
شرافت میں نامردمی جہل ہے

(۲۴۳) خدا کے کرم کا ہوں امید وار
رکھے لاج میری سو پر وردگار

(۲۴۴) میں سیدھوں اُن دل، یں کیا لائے ہیں (ن)
میرے گھر پہ ناحق خلل لائے ہیں

(۲۴۵) خدا ذات انصاف مانو تمیں
فتح ہے ہماری سو جانوں تمیں

(۲۴۶) یکا ایک انہ کار (ن) پیدا ہوا
نظا ماں کا لشکر ہو یدا ہوا

(۲۴۷) ہوی ہانک لشکر میں چاروں کنی
زمیں تھر تھری اور لرزا گگن

س — رہیں ایک ہو کاگے میں مل مل مدام
ج

ن — ہنسا مت کرو زندگی ہے سہل
ج شرافت میں مت لیو اپنے خلل

ن میں سیدھوں او مجھہ پہ چل آئے ہیں
ج مرے گھر پہ ناحق بلا لائے ہیں

ن — ہو نمو کار
ج

(۲۴۸)کھڑا اڑھکے ہودے کماں کوں سمہال(ن) — کھڑا ہو جذبی سیتا نکال
کہا جوش میں یوں انکھیاں کرکے لال ج

(۲۴۹)نپٹ کر کر شوخی یو چل آے ہیں
سبھے کہا سگر سوم کا پاے ہیں

(۲۵۰)زمیں دھس کے غرقاب ہو جاے گا
گگن ٹوٹ کر سر اُپر آوے گا

(۲۵۱) لڑوں یا مروں یار فوجاں چلاؤں • نسخہ (ج)میں چلاؤں اور بہاؤں کی جگہ چلاؤ اور بہاؤ ہے اور دوسرے مصرعے میں میں کی جگہ تو ہے —
میں عالم علی لہو کی ندیاں بہاؤں

(۲۵۲) بحق خدا وند پروردگار
جب *انگ تی جیو ہے کروں کارزار

(۲۵۳) ہراول کیا ہے غالب خان (ن)کوں * تینوں نسخوں میں جب انگ ہے لیکن میری راے میں جنگ ہونا چاہئے ۔
ڈیا سا تھہ سلیم خاں متھے خاں کوں — ملور خاں ن — متھور خاں ن
ج ج

(۲۵۴)دلیل خاں، محمدی بیگ مرزا علی
جہاں لگ تھے سردار جو ڈھاہاں

(۲۵۵) کہا تم ہراول کے سب سا تھہ جاؤ
ہراول کوں ان سات بیگی ملاؤ

(۲۵۶) امیں خاں کوں بولے کہ سن لیو بات
تمیں فوج کا مل لے جاو سنگات

(۲۵۷) چلو مہربانی سوں سیدھی طرف
تمہاری شجاعت میں کچھہ نہیں حرف

(۲۵۸) نہیں کوئی ثانی تمہاری مثال (ن) — تمیں مرد دکھی میں ہو بے مثال
یہی بات تحقیق بے قیل و قال ج

(۲۵۹) امیں خاں کہے رہ میں دستا خلل (ن) — کوڑے ہو کے رہلے ہون دستا خلل
ج
گیا ہ و ر ہمارا ہر اول نکل

(۲۶۰) سدہ کو ہو آئے تو کچھہ کر دکھاؤ
ہو بےشک اپس دل میں کھانڈا چلاؤ

(۲۶۱) ٹلوگے تو سب فوج ٹل جا ئیگی
بلا مجھہ اکیلے اوپر آ ئیگی

(۲۶۲) وہی ہو ئیگا جو ہے اب کی رضا (ن) — میں ہوں سب عزیزاں ستیں باوفا
ب
کہ میں ہوں عزیزاں میں سینے صفا

(۲۶۳) ہمرخاں کوں بولے رہو دست چپ
رہتے کو لے فوج کوں سات سب

(۲۶۴) تمارے میرے کچھہ جدائی نہیں
تمہیں خویش ہو کچھہ سپاہی نہیں

(۲۶۵) تمہارے میرے شرم سب ایک ہے
کروگے وہی جس میں جو نیک ہے

(۲۶۶) دنیاں میں دوبارا کچھہ آنا نہیں * — * یہ شعر اس سے پہلے آچکا ہے
یو دنیا جنم لگ ٹھکانا نہیں — صرف ٹھکانے اور رتھانے کا فرق ہے نسخہ (ب) میں یہ شعر اس مقام پر نہیں نسخہ (ج) میں اس طرح ہے۔ دنیا دوبارہ کی یہ جوں چھاؤں ہے جنم لگ کسی کا نہ اب ٹھاؤں ہے

(۲۶۷) اگر ہے شرم سو بیچ جینا بھلا
وگر نہیں زہر کھا کے مرنا بھلا

(۲۶۸) خبردار ہو دل میں کچھہ ترنہ لاؤ
کہ جیوں شرط ہے خوب ہاتاں چلاؤ

(۲۶۹) لئے سات اپنے سوہانے (ن) رکھہ — رہا سو شم ن / ج
چلے خوش ہو رکھہ (ن) رکھہ کے یک یک قدم — آہستہ

(۲۷۰) سو ایسے میں آکر کہا کوی سوار
ہراول پہ بھاری پڑی ہے جو پار (ن)

(۲۷۱) رہی فوج جاں کی تہاں سب ٹھٹک
(۲۷۲) چلے ہیں جدھر کے تدھر سب ٹھٹک
(۲۷۳) ہزاراں سوں جودھا آگ نسگ * (ن)
سنا ارر چلا جیوں دیوے پر پتنگ
(۲۷۴) جو ہوتا اگر رستم افراسیاب
تو ہرگز نکرتا وہ ایتا شتاب
(۲۷۵) پڑیا تُرت ایسا ہوا سار کڑک (ن)
کسی بات کا دل منے نہیں تھا دھڑک
(۲۷۶) اوٹھا فوج لشکر کا گرد و غبار
کہ جانو قیامت ہوا آشکار
(۲۷۷) ہوا شور و غل غلغلا فوج میں
سیادت کے دریا رہے موج میں
(۲۷۸) مقابل ہوا اور کہا ہا نک سار
وطن ہے سپاہی کا کھانڈے کی دھار
(۲۷۹) عجب دن عجب وقت ہے آج کا
بھلے مرد کی قدر معراج کا
(۲۸۰) کہا کاں ہے سردار اس فوج کا
جو دیکھے تماشا میری موج کا
(۲۸۱) X تمہارے بن کاسپ اڑاں ہے (ن)
تلوست یو مرداں کا میداں ہے

ہ — ہراول پہ صاحب کے ہے روز گار
ج

ن — * ایسا سنگ
ب — بڑا شور دھودھا بڑا پر تھٹک
ج — سنا اور چلایا جیسے بجلی کڑک

ن — پڑیا تُرت اسماں سوں بجلی کڑک
ب
ج — کسے ماجنی جو سمبھالے دھڑک

ن — ملیں ہم و تم ہم کو ارمان ہے
ج

(۲۸۲) مجھے بان گولے سوں کوئی (ن) مت ڈراؤ — ن تم
نشا ہے تو ہووے سوں ہودا بھڑاؤ — ج

(۲۸۳) لگا مارنے تیر گولی چلاؤ (ن) — ن لگا مارنے تیر کر کوں پیا
کہا فوج کوں سب کی گودی اٹھاؤ — ج دیا فوج یکبارگی سب ہلا

(۲۸۴) چلانے لگے تیر پر تھر کوں
ہزار آفریں مرد (ن) کے دھیر کوں — ن مرد رنھیر کوں
(۲۸۵) گزر جاے بکتر و چلتہ کوں پھوڑ — ج
زرہ کی کڑیاں تھال کے پھول توڑ

(۲۸۶) جسے تھر ماریں ترازو کریں (ن)
سکت کیا تھی جو زور بازو کریں

(۲۸۷) ہوا دوگھڑی لگ بڑا رن کھنڈل (ن) — ن ہوا دوگھڑی لگ ہزاروں کا ڈھل
چلی فوج سوں پر سے ساری نکل — ج

(۲۸۸) جو ہودے کے سوں پر سے سب ٹل گئے
پھرا پیٹھہ یکبارگی چل گئے

(۲۸۹) نہیں ہے عزیزاں یو عالم علی
مگر آج حاضر ہوے ہیں علی

(۲۹۰) الٰہی یو کس نور کا نور ہے
جہاں یو شجاعت سوں معمور ہے

(۲۹۱) کیا تب حکم بیگ نوبت بجاؤ
رکھو دل قوی اور گھڑے چلاؤ

(۲۹۲) رہے کیوں کھڑے جا بجا تھار تھار (ن) — ن رہو دیوں کے تیوں ہو کھڑے تھار تھار
نھنے اور بڑے سب پیادے سوار — ج

(۲۹۳) چلا کوئی مشرق چلا کوئی غروب
چلا کوئی شمال اور چلا کوئی جنوب

(۲۹۴) بلانے لگے فوج کوں آو رے
فتح ہے فتح کوی مت جاو رے

(۲۹۵) پھرو رے پھرو ننگ سوں دور ہے
نمک کھا کے بھاگے سو مزدور (ن) ہے

ن
— مقہور
ب ج

(۲۹۶) یو سن کر کہا سید پاک باز
اِتا بس ہے دھنا مدد کار ساز

(۲۹۷) X جو بھاگا سو کیا اس کی پھر آس ہے
یہ مرنا شہادت مجھے خاص ہے

(۲۹۸) کھڑا رن میں سید اپس ذات سوں
گئی فوج ساری نکل ہات سوں

(۲۹۹) مہاوت کوں بولا کہ ہاتی چلاؤ
کہا تب غالب خاں کوں بھگی بلاؤ

(۳۰۰) ہزار آفریں خان عالی قدر
تمہاری ہے مجھہ پر مہر کی نظر

(۳۰۱) میں اس فوج کوں ازمایا نہیں
کپٹ اون کے دل کا میں پایا نہیں

(۳۰۲) دغا دے کے مجکوں نکالے شتاب
قیامت میں کیا دیں گے حق کوں جواب

(۳۰۳) محبت کی کچھہ کس سنے باس نہیں
دیکھو دوستاں کوی میرے پاس نہیں

(۳۰۴) بہر حال دنیا یہ گزران ہے
لگا رکھہ اب موت سوں دھیان ہے

(۳۰۵) غالب خاں نے بولے کہ سید انام (ن) — ن
نکو کچھہ کرو فکر اب دل میں خام — اسام ب ج

(۳۰۶) جب لگ دم میں دم ہے کریں کارزار (ں) — ن
رہیگا جو عالم ملے یادگار — لڑیں جانثار ج

(۳۰۷) سہر خان (ن) غوری نے بولیا نواب — ن ب — ن
سلے سل (ن) گے سب یو خا نے خراب — ناصر خاں ج — نواب

پلے پل
تلے تل

(۳۰۸) کیا شیخ اکبر نے (ن) آکر عرض — ن ب — ن ج
کہ ہر خاں ہمیں اب ہوا ہے فرض — شیخ فیض — فیضو

(۳۰۹) مقرر ہوا ہے جو تقدیر سوں
مٹا نا سکے کوی تدبیر سوں

(۳۱۰) نواب اب رہا شہر کا دیکھنا
لڑای نہیں اب ہوا پیکھنا

(۳۱۱) اسی گفتگو میں کہ تھا یو بھار
چڑی فوج سید کی کل ایکبار

(۳۱۲) پڑا مار کا * تیر اور بان کا — * معرکہ
پڑا رن کھنڈل خوب گھمسان کا

(۳۱۳) کئے قصد ایک دل ہو اہل غرور
کہ چڑیا ہے جیوں آکے دریا کوں پرر

(۳۱۴) ہزار آفریں تجکوں عالم علی
کہوں سور ما بیر یا کوی بای (ن) — ن ج — کہوں سور ما بیر جو دھا بلی

(۳۱۵) مہاوت پڑیا فیل سیتی نکل (ن) ن بڑا چوٹ آسن سوں مہاوت نکل
لگا پانوں اپنے کوں دھکلنے اگل ج لگا پانوں ہاتھی دھکا یا اگل
(۳۱۶) تہورخاں (ن)کوں اتنے میں گولا لگا ب ج عنایت ن غیاث خاں
( لگا سویچ ہاتھی اوپر تے دھلا (ن) ن دھکا
(۳۱۷) گریا سو چھل ہات سوں چھوٹ کر ج
رہا دیکھہ سید لہو کھونٹ کر
(۳۱۸) رہے تھے کم و بیش کل سو جواں
ہوے گرد سید کے سب خونفشاں
(۳۱۹) اپے تھا ہتی تھا و یک تھا خدا (ن) ن ہتی تھا وہ تھا آپ یا تھا خدا
ہوے شاہ سوں سب سنگا تی جدا ج
(۳۲۰) دو ترکش لے ایسے میں خالی کیا
سگل تن کو زخماں سوں جالی کیا
(۳۲۱) لگے تیر بھرنے اسی تیر کوں
چلا کر بھرا کر بڑی دھیر سوں
(۳۲۲) لگا وے جسے تیر کہہ کر کماں (ن) ن لگا کر چلے کوں بھی کھینچے کماں
وو لاگے جسے سو کئے لا مکاں ب لگا وے جسے تو نرھے کچھہ نشاں
( لگا وے جسے سور بھی الا ماں ج )
(۳۲۳) یکا یک لگے موں اوپر پنج تیر
ہوے پارکلاں سوں پردے کور چیر
(۳۲۴) لیا کھینچ کر اور کیا خوب زور
آہستہ سٹیا تیر پیکاں مرور (ن) ن رہا سو سٹیا پانچہ کو ادا مرور
(۳۲۵) X لگے تیر پر تیر اوس شیر کوں ج
چلا وے پورا کر اُسی تیر کوں

(۳۲۶) لگا تیر چلے کون کھینچے کماں
لگا وے جسے سب کئے وو جہاں
(۳۲۷) لگا تیر پھر آ بنا گوش میں
سنّیاکاڑ بھی اس کوں آ ہوش میں
(۳۲۸) فزک آکے اس فوج کا کوئی امیر
لگا یا پیشانی پر آ سخت تیر
(۳۲۹) نکالے تو ہر گز نکلتا نہیں
کیا زور پر زور چلتا نہیں
(۳۳۰) سنّیاچ اور بھار کاڑ وھاں کا وھاں
دیا جواب اوس تیر کا در زماں
(۳۳۱) پڑا آکے گھوڑے سے جب کھاکے تیر
کہا کیا امیروں میں تھا بے نظیر (ن)
ج — کہا کیا جوانمرد تھا بے نظیر
(۳۳۲) سو ایتے میں کوئی اور ھودے سوار
وو آ سامنے دل کوں کر استوار
(۳۳۳) لگا یا اوسے تیر ایسا شتاب
جو دے نا سکا پھر کر اوس کا جواب
(۳۳۴) یہی ایسے میں آ کوئی نیزہ سنبھال
غروری سے سید پو مارا نکال
(۳۳۵) X جو دیکھا اسے تیر مارا اچھل
پڑا پھر کر گھوڑے اوپر سے نکل (ن)
ج — پڑا نیچے گھوڑے اوپر تیں نکل
(۳۳۶) زرا مورچنا کھاے گردن پر آے
دکھا سر نہہ جھکاوے نکا ھوں پھراے
ھتی کو اشارت سوں انگے چلاے

(۳۳۷) جو ایسے میں کوی پیرزادہ فقیر
بہوت خو بصورت وصاحب نظیر

ن مت مانگ ھاتی میں صاحب سریر
ج نیمت بانک پٹے موں تھا بے نظیر

(۳۳۸) ھتی ھول آکر ھوا رو برو
کہ جا نو نظام الملک ھیکا تو

(۳۳۹) کہ جلدی سوں دو تیر ایسا جڑا (ن)
سو ھودے میں بے ھرش ھوکر گرا

ن یکا یک اسے تیر ایسا جڑا
ج

(۳۴۰) زخم پر زخم جب لگے بے حساب
ھوا سست (ن) تب سید عالی جناب

ن تنگ
ب

(۳۴۱) ھر آن آپڑی مار تلوار کی
بڑے زور کی اور بڑے مار کی

(۳۴۲) عزیزاں گئے چھوڑ سارے نکل
نمک کی شرط نا رکھے گئے نکل (ن)

ن نہ سید ھے بغل نہ داوین بغل
ب ج

(۳۴۳) جدھو دیکھتا ھے اودھر مار مار
کہا جو رضا پاک پروردگار

(۳۴۴) سٹیا ھات ھمت سوں شمشیر پر
سو مارے دیکھو جھٹکہ ھودے اوپر (ن)

ن تو ھر کر لگا جس کے ھودے اوپر
ب

(۳۴۵) لہو لال موں کے اوپر بہہ چلا
اودھر کا اودھر جا بجا بہہ چلا

(۳۴۶) لئے ڈھال موں پر اپس کو چپاے (ن)
ایدھر کا اودھر مار کوں موں چکاے

ن لئے ڈھال ھودے کو تلواریاں کوں کاٹ
ج لگے جہاں تہاں کھول دے چوکھات

(۳۴۷) سٹے آے ھودے کو ھودوں سے کھیر (ن)
ھوا تب ھر اساں کیا دل دلیر

ن لئے آکے جرہ ھن نے ھر دے کو گھیر
ج رکھا جیونات بہت ھیا دل دلیر (ج)

(۳۴۸) سبھی مغل اوربان کے دندناں کوں کاٹ (ن) سنے دھاں ہودے کی دندیاں کوں کاٹ (ب)
لگے ہودے پر چڑھنے رسیاں کوں کاٹ لگے جہاں تہاں کھول رہے چواہ ہاٹ

(۳۴۹) دو ہاتاں سے تلوار بازی کری
مگر کربلا پھر کے تازی کری

(۳۵۰) سو ایسے میں ایک آ کے گولی لگی
وہ گولی نہیں بلکہ ہولی لگی

(۳۵۱) کہا کوی نفر ہے تو پانی پلاو
کہا آبدار ہو تو بیگی بولاو

(۳۵۲) نہ پانی اتھا وہاں ناتھا آبدار
لگیا وو ہیں لڑنے کیتئں پیاس سار

(۳۵۳) جسے ہات سارے کرے چور چور
جب لگ جیو میں جیو تھا تن پر نور (ن) جب لگ تن میں جیو تھا وہ تب لگ معمور (ج)

(۳۵۴) انکھیاں پرتے لہو چلیا بے شمار
لگیا پونچھتے پونچھتے اپنی رومال کار

(۳۵۵) بوندان لہو کے سوں پرپو نچھا تمام (ن) بلہ ہی منہ پہ جالی لہو کی تمام (ج)
رہا دیکھنے سے وو سید انام رہا دیکھنے سوں وہ سید امام

(۳۵۶) سنو اے عزیزان روشن ضمیر
لگے ایک تن پر سو چھتیس (ن) تیر چالیس (ج)

(۳۵۷) تھے تو وار نیزے و تلوار کے (ن) اتے وار نیزوں کے تلوار کے (ب)
وہم نا کیا کچھہ اس آزار کے

(۳۵۸) فوارے لہو کے او چھلنے لگے
نکل بہار ہودے سوں چلنے لگے

(۳۵۹) اوٹھے ایک تن پر ہزاروں کے غول
ہوا مار کے موں جدا سر سوں خول
(۳۶۰) لگیا جب سیلے آ کے گولا ندان
نکل روح تن سوں گیا جیوں بوان
(۳۶۱) جگر ٹوٹ لہو ہو کر آیا اوبل
چلے حیف تن پر تے گردن پے تھل
(۳۶۲) مغل آ چڑھے ٹوٹ ہودے اوپر
موئے پر لگے مارنے پھر خنجر
(۳۶۳) دیے قتل ہوے تلے خان کوں
سو اُس کوں بھرے لعل بے جان کوں (ن) کہ دل سے پرے لال بے جان کوں
(۳۶۴) نہ جیوتھا نہ کچھہ روح تھا کچھہ نشان
نہ دم تھا نہ کچھہ نور تھا جیو بجان
(۳۶۵) وو اقبال ناصر کے گھر کا غلام
ہوا چور زخماں سے لہو کے تمام
(۳۶۶) سو بے ہوش ہو کر پڑیا کھیت میں
اوٹھا یا سپاہی افسوس میں
(۳۶۷) تہی تاریخ چھٹی ماہ شوال کی (ن) تہی تاریخ نو یں جو شوال کی
بڑی سخت تر نحس جنجال کی ہوی شہر میں خبر اس حال کی
(۳۶۸) خبر ہوئی شہر میں سواس حال سوں
لئے مار کر جنت کے اس لال کوں
(۳۶۹) محل میں کیا جا کے کوئی یو خبر
کہ تل مل (ن) ہوا آج سارا شہر تل اوپر ہے

(۳۷۰) لئے مار عالم علی خان کوں
سیادت کے مسند کے سلطان کوں
(۳۷۱) لئے مار لشکر آوا را ہوا
امامت کے گھر کا اندھارا ہوا
(۳۷۲) گیا (ن) جگ ستی وو معارک بدن — چھپا (ن ج)
علی کے خزانے کا خاصا رتن
(۳۷۳) اوتھی ماں نے افسوس کھا آہ مار
کہی عمر خاں کوں کہ اب کیا بچار
(۳۷۴) زمین سخت اور آسمان دور ہے
ور ونا دیکھو جان کل چور ہے
(۳۷۵) لے جانے کی بیگی اوتاولی کئے
لے جا کر دیکھو کیا خرابی کئے
(۳۷۶) ہوا غل بڑا کل محل میں تمام
جو کھانا و پانی ہوا سب حرام
(۳۷۷) کہی ماں نے فرزند میرے تو نہال
ہوا دیکھنا مجکوں تیرا محال
(۳۷۸) کہاں ہے وو فرزند عالم علی
تورے دیکھہ سور سر پانوں لگ میں جای
(۳۷۹) فلک بے مہر نے کیا کیا ستم
گنوایا میری دھکد ھکی کا پدم
(۳۸۰) اوجالا میرے جیو کے ایوان کا
ستارا میرے ملک میدان کا

(۳۸۱) میرے زیب زینت کا تھا گل گلاب
تڑا کر کیا سب چمن کوں خراب
(۳۸۲) ہوا عیش آرام میں کیا خلل
عجب جیوتن سوں نجاوے نکل (ن) — قیا ست لگوں تب رہے گا یہ مثل (ج)
(۳۸۳) ہزار آرزو اور ارمان سوں ج
میں پائی تھی عالم علی خاں کوں
(۳۸۴) کہاں او کہاں اوس کی خانی گئی
سگل خاک میں اوس کی جوانی گئی
(۳۸۵) کہوں کیا جو پوچھینگے مجکوں نواب
کہاں ہے وو فرزند مہارک نقاب
(۳۸۶) اپس ہات سوں کیوں گنوائی اوسے
نہنی عمر میں کیوں کٹائی (ن) اوسے — کوپائی
(۳۸۷) منانا کیئے کیوں تم اس بات سوں ج
گنوائی بہادر میرے ہات سوں
(۳۸۸) نہ کھاوے نہ پیوے روے زار زار
میرا جیوپیت بن یوں ہے بے قرار (ن) — مچھی جیوں ترپتی ہے تیوں بے قرار
(۳۸۹) پکڑ ہات کوں میں نکالی تجھے ج
پھر آ کر تو مکھہ نہیں دکھایا مجھے
(۳۹۰) کہے تھے فتح پا کے گھر آئینگے
یو صورت نورانی کوں دکھلا ئینگے
(۱۹۱) کہ سہراں روپے بھر کے خیرات کی
خبر کچھہ نہ تھی مجکوں اس بات کی

(۳۹۲) کہیں سدہ میں آوے کہیں سدہ گنوائے
نینا ں سے انجھو ڈھال موتی بہائے
(۳۹۳) ہوے خود کہی تلملا ہانک مار
اے حافظ ! اے ناصر ! اے پرور دگار
(۳۹۴) پکڑ ہات سونپی تھی یا رب تجے
سبب کیا سو پھر نا دکھایا مجھے
(۳۹۵) تھی امید یہ دل میں دیدار کی
میرے فو ج لشکر کے سردار کی
(۳۹۶) پھر اون کی خبراں میں خیرات کی
خبرکچھہ نہ تھی مجھہ کوں اس بات کی
(۳۹۷) ارے کوئی اس غم کی دارو بتاؤ
مجھے اس عزا باں سوں بیگی چھڑ ؤ
(۳۹۸) ہو بے ہوش سو بار یک با ر با ر
انکھیاں تے لہو روے و و زار زار
(۳۹۹) محل کے جنے لوگ زیر و زبر
بڑے حیف کہا کہا کے ہو بے خبر
(۴۰۰) تیرے باج پیارے اندھارا دسے (ن) ن کہیں کیوں محل میں اندھارا دسے
خدا باج پیارا نہیں کوئی دسے ج خدا باج کوئی نہیں کہیں اب کسے (ج)
(۴۰۱) نہ فریاد کوں کوئی نہ کوئی داد کوں
بھر حال جانا دولت آباد کوں (ن) ن گئے ہر طرح دولت آباد کوں
ج
(۴۰۲) شہر ملک تھا جس کے فرمان میں
سو وو جا پڑے کوہ و ویران میں

(۴۰۳) هزاراں سپاهی هزاراں غلام
کریں آ کے تسلیم هر صبح شام
(۴۰۴) هزاراں سوں گهو ڑے هتهی بےشمار
هزاراں چهڑی دار چیلے هزا ر
(۴۰۲) هزاراں امیراں رهیں نت سلام
چهه صوبوں میں عزت تهاازبس تمام
(۴۰۶) نهیں فکرکچهه مجکوں سلسار کی
تهی امید واری سو دیدار کی
(۴۰۷) گیا لوٹ میں مال اسباب سب
یو قصا نهیں هے حکایت عجب
(۴۰۸) نه تهازورکس کوں نه کس کوں سجال(ن) ـــن نه تهاکس کوں زور نه کس کوں سجال(ج)
سکے مار دم اور کرے کچهه سوال
+ ج (۴۰۹) چهڑاوے لے جا پل سوں افلاک پر
سٹے پل منے خاک کا خاک پر
+ ج (۴۱۰) تلا رام دیوان کا یتهه قدیم
اتها ساتهه اس جائے میں خدیم
(۴۱۱) پرندے کوں طاقت نه پنکهه مارنے
نه یارا تها وهاں کس کوں بچهارنے
(۴۱۲) جو بولے بچن سوے دستور تها
کرم رات دن جن کا مشهور تها
(۴۳۱) انگے حوض لبریز اور گل بهار
صدر مسندان جا بجا تهار تهار

(۴۱۴) سوایسا ستم بو ستم ہائے ہائے (ن) سو دشتا یہ کیا کیا ستم ہائے ہائے
ج یہ دنیا ہے ایسے کوں کیا کوئی نہ پائے

(۴۱۵) کہاں و و نقارے دما مے نشان
کہاں و و عرابا کہاں توپ بان

(۴۱۶) کہاں و و صلابت کہاں و و حکم
کہاں فوج لشکر کہاں و و حشم

(۴۱۷) کہاں ہے و و دولت کہاں ہے وہ مال
عجب قدرتاں ہیں تیری ذوالجلال

+ ج (۴۱۸) کہے مل اپس سوں اپن اہل واز
سیادت کا نادق تو با یا جہاز

+ ج (۴۱۹) نبوت کی انگشتری کانگین
جگر گوشۂ فاطمہ با لیقین

+ ج (۴۲۰) پڑا گرد او ہو ملے لال ہو
گرا ایکلا رن سوں بے حال ہو

+ ج (۴۲۱) ننھی عمر سوں کیوں کیا یا اسے
لے جاکر دیکھو دکھہ دکھا یا اسے

+ ج (۴۲۲) نہ آرام دل کوں نہ خاطر قرار
جگر جل دھڑکتا ہے جیسے انگار

+ ج (۴۲۳) بھئے لگ نہ اب کس تیں یاریں کریں
یہ غم دل سوں رکھہ بردباری کریں

+ ج (۴۲۴) دنیا دغا باز فانی مقام
ہے دل باندھنا اس سوں بالکل حرام

(۴۲۵) جسے پائداری سو نایاب ہے
یو دنیا دیکھو سر بسر خواب ہے

(۴۲۶) یو غم جگ منے (ن) آشکارا ہوا — ن/ج — سوں جب
جگر ٹوٹ عالم کا پارا ہوا

(۴۲۷) ہزار آہ و افسوس ہے دوستاں
چھپا حیف دنیا سوں وو نوجواں

(۴۲۸) عجب سید عالی نسب خان تھا
فراست کے دفتر میں سلطان تھا

(۴۲۹) کہاں ڈھونڈنا اب کہو خان کوں
فراست کے موتی و مرجان کوں (ن) — ن/ج — رسالت کے موتی پریشان کوں

(۴۳۰) قلعہ میں قاعدا ر عالی قدر
سیادت کے رکھہ نام اوپر نظر

(۴۳۱) گیا قلعہ میں اور کہا آشکار
میں مومن مسلمان ہوں دین دار

(۴۳۲) تمہاری میری لاج سب ایک ہے (ن) — ج/ج — تمہاری میری لاج اک لاج ہے
میرا بول تمنا ستی نیک ہے — مرا قول تمنا ستی اج ہے

(۴۳۳) رفاقت تمہاری ہے جیوکے سنگات
میں جاگیر سوں منصب سے دھویا ہوں ہات

ج-ا (۴۳۴) دو کچھہ ہو تمہارا کرے کاسوہو
میں بیٹھا ہوں سب بات سے ہات دھو

(۴۳۵) رکھوں دل کوں صاحب تمیں برقرار
لڑونگا جو چل آئے یک لکھہ سوار

(۴۳۶) جو کچھہ ہو نہا را سو ہو ٹیکا وو
میں بیٹھا ہوں سب سوں ہات دھو

(۴۳۷) ہ لا سا د یا ا و ر کہلا یا سلا م
د یا خو ب ر ھنے کو ں عا لی مقام

(۴۳۸) مبارک تیرا تاج (ں) تجھہ پر اچھو
یو ہمت (ں) تیری تجکو رہبر اچھو

(۴۳۹) شجاعت کے زور (ں) میں توں فرد ہے
بہا د ر شجاع صاحب د ر د ہے

(۴۴۰) مراتب میں سرداں کے توں بے نظیر
نہی تست اچھو تجھہ اوپر دستگیر

(۴۴۱) جو بو لیا بچن سو رکھیا برقرار
اچھوہاء سرداں کا تجکوں (ں) ادھار

(۴۴۲) ووجگ میں نتیجا برا پائیگا (ں)
د نیا سہل ہے نا توں ر ہ جا ئیگا

(۴۴۳) ہوا بعد ازاں غل ہندوستان میں
ہوا جنگ بڑا مغل ا و ر خا ں میں (ں)

(۴۴۴) شہادت کئے خاں نے اختیار
کرے مغفرت خاں کوں پروردگار

(۴۴۵) ہوی جب خبر جاکے نواب کوں
سیادت کی مسند کے محراب کوں

(۴۴۶) کہ عا لم علی سید با خبر
کیا عا لم معنوی پر سفر

ج — ناتوں
ج — نیت
ج — طورے

نس ہ ں
ن — دو جگ سوں نتیجا برا پاے گا
ج دنیا سہل ہے نا توں رہ جاے گا

ن — ہوا جنگ مغل اور میاں خان میں
ج

(۴۴۷) سنیا اور سنگیا غم کی جا آگ میں ن — بیراگ
ج
یو عالم علی‌خاں کے ویتاگ (ن) میں

(۴۴۸) کہا کھود تاروں دکھن کی زمیں
یہ کیا بات ہمنا پہ آوے کہیں

(۴۴۹) بحق خدا وند کون و مکاں
نہ مغلاں کوں چھوڑوں کا میں در اماں

(۴۵۰) منگا توپخانہ بڑے دھاب (ن) کا ن — تاب
ج
بنگالا پورب اور پنجاب کا

(۴۵۱) منگا ئے گو مک (ن) بان سب ہند کے ن — کہک

ولے جا بجا اور سر ہند کے (ن) ن ب — دلی ج آگرا شہر ہور سہند کے

(۴۵۲) جزائل شتر ناں ہزارا ں ہزا ر
رکھے صاف دھو دھو کر سب ایکبار

(۴۵۳) غلاماں کئے سرخ بانات کے (ن) ن — غلاما ں کئے سب کوں بانات کے
ج سرخ، سبز اور زرد کے بھانت کے
زرد اور سبز رنگ کئی ذات کے

(۴۵۴) ہزاراں جواں مرد شمشیر زن

(۴۵۵) ملے آ کر بارہ سے سب ہم وطن (ن) ن — ملے آ کے بارہ سوں ست دے وطن

(۴۵۶) لئے سات اسشا م چو سٹھہ ہزار (ن) ن ب — بست ہزار، یہ تعداد صحیح نہیں ج
ب پچاس ہزار کی تعداد تاریخوں
میں درج ہے
یک یک کس شجاعت میں سب نامدار (ن) ن — آپس تھا شجاعت میں اک نامدار

(۴۵۷) بڑے خاں سٹھے خاں اوٹھے بول کر (ن) ن ج — اوٹھے بول اگر ہے میری جان میں جان
ب بڑھکر چھڑ کہ گنگا کرونگا رواں
کہ یک یک کوں پکڑو .....

(۴۵۸) اوٹھے شے اکبر لے لوں کر پکار
کہ یک یک کوں پکڑونگا در کار زار

(۴۵۹) کہے اے خدا یا مجھے ایکبار
نظاماں ستی اُس لڑای کی بہار

(۴۶۰) اوتھے بول اگر ہے مرے تن میں جان
کہ ایکبار سب ہم کوں کرنا وتھان (ن)

(۴۶۱) بحق خدا وند پروردگار (ن)
نظام الملک سوں ملا ایکبار

(۴۶۲) اگر میں صدو اپنا پاؤنگا تو (ن)
نکل جاؤں جو سامنے ہو

(۴۶۳) زمیں دندنا نے لگی خوف کھا
پڑا دھاک ملک میں ہوا جابجا (ن)

(۴۶۴) امیراں وامراولا کہاں کوں لے (ن)
چلا ہے دکن پر دہا ہے کوں دے

(۴۶۵) چلے ہیں دو منزل دکھن کے رہے (ن)

ہوا وو تپہ تقدیر ہک دک رہے

(۴۶۶) دغے سے لئے مار نواب کوں
لئے لوٹ سامان و اسباب کوں

(۴۶۷) عزیزاں جو کچھہ ہے سو تقدیر ہے
بغیر از رضا کچھہ نہ تدبیر ہے

(۴۶۸) یو دنیا دغا باز و مکار ہے
ہوس اب جتانے میں ایار (عیار) ہے (ن)

(۴۶۹) فہم (ن) بے خبر عقل حیران ہے
دیکھو دوستاں ! کیا یو طوفان ہے

ن — لگا کر للکا لگ کروں کا اُدا ن
ج

ب ج ن — کہا جذب سوں اے خداوند کار
نظاماں سوں مجھکو ملا ایک بار

ن — اگر مجھکوں دشمن میرا پاے تو
ب ج نکل جاں یوں سامنے آے تو
(نکل جاویں جو سامنے آئے تو)

ن — پڑا دھاک ملکوں ملک جابجا
ب ن چلے دو منزل دکھن کے کدھن
— امیراں سرا فوج سب ساتھہ لے
ن ج

— ہوا اس میں تقدیر کا آگے لکھن
ب چلے تھے دو منزل دکھن کے کدھن

ن — ہوا اس میں تقدیر کا ایک فن
ج

ب ج ن — و ہی ہو جتا جو ہوا ہوشیار ہے
ن — و ہم
ج

(۴۷۰) دنیا کی محبت ہے بالکل خراب
یو دستا ہے پانی اوپر جیوں حباب

(۴۷۱) اگر مال دھن لاکھہ کر لاکھہ ہے
سمجھہ دیکھہ آخر وطن خاک ہے (ن)

(۴۷۲) یو جیونا جنم ہے نہ دولت جنم (ن)
ارے خاک سونا ہے کیا ہے وہم (ن)

(۴۷۳) جسے کچھہ سمجھہ بوجھہ ادراک ہے
دنیا کی آلائش سوں وہ پاک ہے

(۴۷۴) مرے کا مرے کا رے مرجاے کا
جوکچھہ یہاں کیا ہے سو وہاں پاے کا

(۴۷۵) اگر بادشاہ ہے وگر ہے فقیر
اجل کے دنداں (ن) ہیں وہ دونوں اسپر

(۴۷۶) نہ گھر کام آوے نہ گھر (ن) چار آے
نہ ما باپ بھائی نہ کوئی یار آے

(۴۷۷) جو آیا ہے جگ میں سو مہمان ہے
یہ جیونا سو جیوں پھول ہور پان ہے

(۴۷۸) خبردار اچھہ نہیں تو اکیلاے کا
جھاتی کے دم سوں نکل جاے کا

(۴۷۹) کہاں گئے کہاں گئے کہاں ہیں بتا
اتھا مال دھن جن کا لا انتہا

(۴۸۰) اتھے شہر شرزے جنو کے غلام
ہوا خاک میں دیکھہ ان کا مقام

ن ب — سمجھہ دیکھہ آخر کوں تن خاک ہے
ن — ختم
ج ب — ارے خاک سوتا ہے کیا ہے وہم
ج — پھیوں
ج — ج

(۴۸۱) کسے دل میں اپنے رو لیاتے نہ تھے
منم میں اپس کے رو ماتے * نہ تھے　　* سالا بھلی سما نا

(۴۸۲) سمجھ یہ وجود بس گیو مل تیرا حساب
تیرے سار کے کئی پڑے ہیں خراب

(۴۸۳) نہ دفتر میں چھوا نہ گھر کوں ٹھکان
کیا فلک کرے گا تو اب ویران

(۴۸۴) نہ گھر کام آوے نہ فرزند رہے
نہ ما باپ آوے نہ دلبند رہے

(۴۸۵) ہزار ہجور سو تیس تھے ۱۱۳۰ سنہ دو اُپر
محمد کی ہجرت کوں سن کان دھر

(۴۸۶) پر ایا چا ند ربیع الاول کا آیا نظر
ہوا آخرت کا یو حکایت خبر

(۴۸۷) تھا دن عزیزاں جمعرات کا
ہوا شہر وا ختم اس بات کا

(۴۸۸) اگر کوئی پوچھے یہ تجکوں حساب
سمجھ کر اسے بات کا دے جواب

(۴۸۹) محمد نبی پر درود ہور سلام
جتے ان کے اصحاب پر نت مدام

(۴۹۰) نہ ہے دل کوں راحت نہ خاطر کوں چین　　ن قصہ یو کہا ہے غضنفر حسین
کہا ہے یو قصہ غضنفر حسین　　ب نہ راحت ہے دل کوں نہیں جیو کوں چین

(۴۹۱) یو دنیا مدت تک چلی جاے گی
سفیدی پو سیاہی سو رہ جاے گی

# اردو کے اَن پڑھ شاعر

از

جناب مرزا فدا علی صاحب 'خنجر' لکھنوی

— * * * —

## ضامن

ضامن حسین خاں ولد حسین خاں - لکھنؤ میں پیدا ہوئے - اُن دنوں حسین خاں ریاست بلرام پور میں ملازم تھے - کبھی کبھی رخصت لے کر وطن آتے اور بال بچوں کو دیکھ کر ملازمت پر واپس جاتے - ضامن کا بچپن لکھنؤ میں بسر ہوا - ہنوز خورد سال ہی تھے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور ان کے حقیقی ماموؤں نے جایداد کے واسطے لڑنا جھگڑنا شروع کیا انہیں خاندانی مناقشوں کی وجہ سے ضامن کی تربیت اور تحصیل علم کا زمانہ غفلت میں گزرنے لگا -

حسین خاں کی دو بیویاں تھیں - اُن کی زندگی میں تو جو کچھ بھی جلن یا تاؤ ہو لیکن حسین خاں کی آنکھ بند ہوتے ہی آپس میں میل جول قائم ہو گیا اور سوتا پے کی کوئی خلش باقی نہ رہی' مگر گھر میں کوئی مرد نہ ہونے کی وجہ سے ضامن کی علمی تعلیم نہ ہو سکی - اگرچہ رسم و رواج کے موافق پڑھنے بٹھائے گئے' درسیات کی کتابیں بستے میں باندھ

کر مکتب گئے لیکن نتیجہ کچھہ نہ نکلا —

کوئی نگران حال موجود نہ تھا ' گھر سے مکتب خانے کا بہانہ کر کے جاتے اور جناب رشید مرحوم کی بغیہ واقع دال منڈی میں ہم عمر بچوں کے ساتھہ طفلانہ اشغال چھلی چھلیا ' اونچا نیچا ٹیلا ' میر جی کی گدھیا ۔ انڈھا بھینسہ وغیرہ میں مبتلا ہو کر دن کاٹ دیتے ۔ کتابوں کا بستہ کسی درخت کی جڑ میں رکھا رہتا ' شام کو جو وقت مکتبوں میں چھٹی کا ہوتا ہے ' بستہ بغل میں داب کر مکان واپس آتے ۔ محبت والی ماں سمجھتی کہ بھہ پڑہ کر آیا ہے ۔ مامتا کے جوش میں چٹ چٹ بلائیں لیتی ' گلے لگا کر بھولا بھولا محبت سے تھپکایا ہوا منہ ' چومتی ناشتہ لا کر سامنے رکھتی پنکھا جھل جھل کر کھلاتی اور پیاری پیاری صورت دیکھہ کر کلیجہ ٹھنڈا کرتی ۔ اُس غریب کو خبر تک نہ ہوتی کہ صاحبزادے نے سارا دن کس مکتب میں گزارا اور کیا سبق حاصل کیا ؟

ماموؤں کی جانب سے عدالتی عدالتی کا سلسلہ جاری تھا ۔ اول تو کچھہ زیادہ پونجی نہ تھی اور جو کچھہ تھی بھی وہ اس مثل کے مطابق ' "تو کو نہ موکو لے چولہے میں جھونکو" باھمی نزاع کی نذر ہو گئی قصہ مختصر یہ کہ ضامن ایسے ہی ایسے وجوہ سے بے علم رہ گئے ۔ البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ جناب رشید مرحوم کے بیٹھکے میں شعر و شاعری کے جو چرچے ہوا کرتے تھے وہ وقتاً فوقتاً گوش گزار ہوتے اور ان کی ذرق آشنا طبیعت اثر پذیر ہوتی رہتی ۔ رفتہ رفتہ کم سنی ہی کے عالم میں طبع موزوں نے ضامن کو نظم کے قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا لیکن طفلانہ حجاب شاعری کے اظہار سے مانع رہا —

ان کے پڑوس میں ایک ضعیف العمر بیوہ رہتی تھیں جن کی نیک

طبیعتیں، رحیم المزاجی اور سن و سال کے لحاظ سے جانے والے "بی اماں" کے لقب سے یاد کرتے اور پکارتے - چونکہ یہ مسماۃ ضامن کے پڑوس میں رہتی تھیں کھیلتے ہوئے ضامن اُن کے یہاں بھی نکل جاتے اور بی اماں کی فطرت نسائی بچے سے محبت کرنے پر مجبور کرتی اور وہ اکثر بچے کی بھولی بھالی باتوں سے لطف اندوز ہوا کرتیں - پڑوس کا رشتہ تھا آنا جانا ہوا ہی کرتا تھا دونوں گھروں میں نہایت صحبت و خلوص تھا - جس کا انجام یہ ہوا کہ اُنھوں نے ضامن کی والدہ سے کہہ سن کر ضامن کو اپنے نام کا کرلیا اور حقیقی اولاد کی طرح محبت و دل جوئی کرنے لگیں —

ضامن کی ددھیال میں سب سنی المذہب تھے لیکن ننھیال والے مشرب اما یہ کے پیرو تھے - بی اماں بھی شیعہ تھیں - اُن کی تربیت نے بچپن ہی سے ضامن کے خیالات مذہبی کو شیعیت کے رنگ میں رنگنا شروع کیا - جب دس بارہ برس کا سن ہوا تو محلے کے لڑکوں میں کھیلنے کودنے لگے - یہ بچے بھی اکثر اثناء عشریہ تھے اس ملا ملا اور میل جول نے ضامن کے خیالات کی کایا پلٹ دی اور وہ آبائی مذہب کی قیود سے آزاد ہو کر امامیہ طریقت میں داخل ہوگئے چنانچہ اب نہایت راسخ العقیدہ شیعہ ہیں —

جب ان کے بزرگوں کو پڑھنے کی طرف سے قطعی مایوسی ہو گئی تو صنعت و حرفت کی جانب توجہ پھیری - اس زمانے میں ایک شخص میر کاظم حسین زر دوزی کا کام کرتے تھے اور مشہور کاریگر تھے اُن کا کارخانہ کامیابی کے ساتھ جاری تھا - آدمی بھی بھلے خواہ اور نیک خو تھے - ضامن اُن کے سپرد کئے گئے - اُنھوں نے بھی کام سکھانے میں بخل نہ کیا - کچھ مدت میں اُنھیں اِس کام میں خاصی مہارت ہوگئی اس درمیان میں شوق شاعری بھی بڑھتا رہا اور مخفی طریقے پر مشق

سخن جاری رہی اس مراسلت سے نسبتاً کلام میں پختگی بھی پیدا ہوئی
انہیں ایام میں سید ببن صاحب زرز دوز سے راہ و رسم دوستانہ بڑھی
موصوف الذکر جناب رشید کے متصل مکان میں سکونت پذیر تھے - ضامن اکثر
ان کے یہاں جایا کرتے اور غایت بے تکلفی کی وجہ سے اپنے تصنیف کئے ہوئے
اشعار دل کش لحن اور دل نشین لب و لہجہ سے پڑھ پڑھ کے سنایا کرتے انہوں
نے ان کا بڑھتا ہوا شوق دیکھ کر جناب رشید کی شاگردی کا مشورہ دیا اور
ان کا عندیہ پاکر ایک روز جناب رشید کی خدمت میں
حاضر کردیا —

رشید مرحوم کے صدہا شاگرد تھے - صبح سے شام تک شعر و سخن کا
مشغلہ رہتا - ان کے ان پڑھ شاگردوں میں جناب شفیق لکھنؤی نے خاص
شہرت و امتیاز حاصل کیا ہے - ضامن بھی رشید کے فیضان سخن سے محروم
نہ رہے - درخواست پیش ہوتے ہی شفیق استاد نے پشت پر دست شفقت رکھ
دیا اور ضامن حلقہ تلامذہ میں شامل ہونے کا افتخار حاصل کرکے ان کی شاگردگی
کا دم بھرنے لگے - اب کیا تھا ؟ شعر گوئی کا شوق دونا بلکہ چوگنا ہو گیا -
مولوی گنج میں ماہانہ مشاعروں کی بنا ڈالی گئی اور مہینے کی ابتدائی
تاریخوں میں بزم سخن سرائی آراستہ ہونے لگی - از بسکہ ضامن میں
اتنی استطاعت نہ تھی کہ ماہ بماہ حضرات شعراء کی خدمت گذاری کا
بار اٹھا سکتے اور ان کے ہم مشقوں نے بھی ایک ذات واحد کا زیر بار
ہونا گوارا نہ کیا اس لئے ایک بے قاعدہ انجمن ترتیب دی گئی جس کے
معجز ، ذاکر ، مفید ، ظفر ، قادر ، بعید ، وغیرہم رکن قرار پائے اور
چندے کی رقم سے جملہ سامان فراہم کرکے مشاعرے کئے جانے لگے اور یہ
سلسلہ کئی سال تک قائم رہا —

ضامن خود بھی شعرا کو دعوت دے کر بلاتے اور اُن کے مشاعروں میں بھی نہایت ذوق و شوق کے ساتھہ شریک ہوتے - برسوں یہ سلسلۂ آمد و رفت بر قرار رہا - تقریباً ۱۱ - ۱۲ برس ہوئے ایک نا خوشگوار واقعہ پیش انے کی وجہ سے مشاعروں کی شرکت یک قلم موقوف ہوگئی اور ضامن کی دنیائے شاعری میں انقلاب عظیم رو نما ہوا - واقعہ یہ ہے کہ جناب جاوید مرحوم جو اساتذۂ فن اور مشہور شاعر تھے ' ان کے کسی شاگرد نے کثرۂ ابو تراب خاں میں صحبت مشاعرہ منعقد کی - شعراء کی خدمت میں اطلاعی کارڈ اور رقعے ارسال کئے گئے اور مشاعرے کو کامیاب بنانے کی سعی شروع ہوی - مصرعہ طرح یہ تھا - ع —

بام پر آتے ہیں اپنی زلف بکھراتے ہوئے

شعراء نے محنت سے غزلیں تصنیف کیں - ضامن نے بھی اپنی استعداد اور مشق کے موافق غزل کہی اور مشاعرے میں شریک ہوئے - جب شمع سامنے آئی تو کلام پڑھہ کر سنایا - اتفاق سے ایک شعر کا مضمون جناب جاوید کے کسی شعر سے لڑگیا تھا - جاوید مرحوم کے بعض پرجوش شاگردوں نے اس اتفاقیہ توارد کو سرقے سے تعبیر کرتے ہوئے سرگوشیاں شروع کیں - ضامن کو یہ امر شاق گذرا اور جوش غضب میں معرکۂ شعری آراستہ کرنے پر آمادہ ہوگئے لیکن چند صلح جو حضرات نے درمیان میں پڑ کر قضیہ رفع دفع کردیا لیکن ضامن دل برداشتہ ہو کر محفل سے اٹھہ آئے -- ان کے ساتھہ ان کے مخصوص احباب بھی چلے آئے صبح سے یہ خبر حلقۂ شعراء میں مشہور ہونا شروع ہوئی - شدہ شدہ جناب رشید تک پہنچی ' انہوں نے اپنے خاص ملازم عزت علی کو بھیج کر ضامن کو طلب کیا - یہ فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوئے - انہوں نے واقعہ دریافت کیا - انہوں نے جو کیفیت گذری تھی بلا کم و بیش بیان کردی - سن کر

فرمایا ۔ " شکر کرو کہ تمہارے شعر کا مضمون کسی اور سے نہیں بلکہ جاوید سے لڑا لیکن اس واقعہ سے لوگوں کو تمہاری افتاد طبیعت کا اندازہ ہوگیا ۔ اب میری صلاح یہ ہے کہ آئندہ مشاعروں کی شرکت سے احتراز کرو ۔ جتنی غزل گوئی کرنا تھی کرچکے اب مرثیہ ۔ نوحہ ۔ سلام کہا کرو کہ عاقبت میں ثواب حاصل ہو ۔ فرمان بردار شاگرد نے سر تسلیم خم کر دیا اور اُستاد کے احکام کی حرف بحرف تعمیل کی ۔ اس دن سے مشاعروں کی شرکت موقوف اور غزل گوئی کا سلسلہ قطع ہو گیا ۔ نوحہ و سلام کی مشق جاری ہوئی چنانچہ اب تک وہی سلسلہ قائم ہے ۔

غزلیں کہتے ہیں لیکن کلام کا اکثر حصہ نعتیہ ہوتا ہے ۔ عرصے سے مشق سخن جاری ہونے کی وجہ سے نوحہ وسلام تصنیف کرنے کی خوب مہارت ہے شہر کی ساتھی انجمنوں میں ان کا کلام ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے " انجمن آل عبا کے رکن اور انجمن اکبریہ گولہ گنج کے سکریٹری ہیں کلام سبکی ہوتا ہے ۔ چالیس بیالیس برس کی عمر ہے اکہرے بدن کے کشیدہ قامت آدمی ہیں ۔ اکثر چشمہ لگائے رہتے ہیں ۔ گیہواں رنگت اور طباقی چہرہ ہے زمانہ حال کے موافق لباس پہنتے ہیں ۔ مزاج میں سادگی اور بے تکلفی کا عنصر زیادہ ہے مولوی گنج میں زردوزی کا کارخانہ ہے فوجی وردیوں پر کلابتو کے نمبر بناتے اور متوسط حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں ۔ نوحوں اور سلاموں کا کافی ذخیرہ جمع ہے ۔ اگر ترتیب دیا جائے تو دو بیاضیں تیار ہو سکتی ہیں ۔ ائمہ طاہرین علیہم السلام کی مدح میں چند قصائد بھی تصنیف کئے ہیں جو ان کی بے علمی پر نگاہ کرتے ہوئے بہت خوب ہیں ۔ غزلوں میں عبرت آموز اور حسرت زا مضامین نظم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ تصوف کی طرف بھی طبیعت کا میلان ہے لیکن مزاج کا فطری

لگاؤ عاشقانہ مضامین کی جانب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس رنگ میں بہت صاف و برجستہ شعر نکال لیتے ہیں زبان میں لوچ اور شیرینی ہے جسے اُستاد کا فیض کہنا چاہئے - بعض بحور کے نام اور اوزان یاد کر لئے ہیں ان کے ذریعہ سے وزن کرلیتے شعر دریافت ہیں- جب تک جناب رشید حیات رہے اُن کو غزلیں سنا سنا کر اصلاح لیا کئے - اُن کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی سید باقر صاحب حمید مغفور سے مشورۂ سخن کرنے لگے اور اب جناب حمید کے برادر زادے جناب افضل کو کلام دکھاتے ہیں - غزلیں جمع کرنے کا شوق بالکل نہیں - خود کہتے ہیں "اگر میں اپنی غزلیں جمع کرنا چاہتا تو اب تک ضخیم دیوان جمع ہو جاتا لیکن میں نے کبھی کلام عاشقانہ محفوظ کرنے کا خیال نہیں کیا - ضرورت کے وقت غزل کہی اور اس کے بعد ضایع کر دی مطلع کے لڑنے یا بے تکلف احباب اسرار کرتے ہیں تو دس بارہ شعر کہہ دیتا ہوں چنانچہ وہی کلام راقم الحروف کو اندراج تذکرہ کے واسطے عنایت کیا ہے ملاحظہ ہو —

نہ زائل دل سے عشق مصطفےٰ بعد فنا ہوگا
اندھیرے میں لحد کے ماہ جاوہ نما ہوگا

نبی حامی، علی ساقی، بہشت آراستا ہوگا
یہ ساماں عاشوں کے واسطے روز جزا ہوگا

خدا شاہد، ازل کے دن سے اُس گل کا ہوں شیدائی
نہ جس کا کوئی ہمسر خلق میں اب دوسرا ہوگا

مسیحا سے نہ ہوگی چارہ سازی حشر میں کچھ بھی
کرم تیرا ہمارے درد عصیاں کی دوا ہوگا

کسی اہل وفا نے ظلم سہ کر اس لئے جاں دی
گنہگاران اُمت کا اسی صورت بھلا ہوگا

جہاں میں جاؤں گا اس طرح میدان قیامت سے
سرے ہاتھوں میں دامان علی مرتضیٰ ہوگا

رقم جو کچھ ہے پیشانی میں وہ پیش آئے گا ضامن
غلط اک حرف بھی ہرگز نہ قسمت کا لکھا ہوگا

اسیر زلف ہوں صورت ذرا دکھا دینا پھر اختیار ہے، جو چاہے وہ سزا دینا
یہ کہہ کے سوئے لحد میں ترے فراق نصیب
صدائے صور! ہمیں حشر میں جگا دینا

سکھائی آپ کو کس نے جفا کی یہ رفتار
کہ ٹھوکروں سے نشان لحد مٹا دینا

جفا، وفا کا طریقہ اسی سے ثابت ہے
تمہارا کوسنا مجکو، مرا دعا دینا

عبث ہے عشق میں ضامن کو سوز غم کا گلہ
وہ شعلہ رو جو ہے عادت ہے دل جلا دینا

---

پردۂ چشم جو مسکن ترا ایجاں ہوتا شعلۂ حسن چراغ تہہ داماں ہوتا
حشر میں عفو گلہ کی کوئی صورت ہی نہ تھی
مجکو ضامن جو نہ عشق شہ مرداں ہوتا

---

سوئے مژگاں دیکھ کر سمجھا یہ رخساروں کے پاس
پھول ہیں وہ بوستان حسن میں خاروں کے پاس

چشم پرنم بال بکھرائے ہوئے، چہرہ اداس
یوں نہیں آتے ہیں میری جان بیماروں کے پاس

یوں چھپایا ہم نے اُس پردہ نشیں کا سوز عشق
کب جگر واقف ہوا سینے میں گو تھا دل کے پاس
عمر دو آخر میں ساکن ہوں کھلا ضامن یہ راز
فکر کے ناخن جو پہنچے عقدۂ مشکل کے پاس

---

گھائل ہوے ہیں یار کی بانکی ادا سے ہم
تیغ نگاہ ناز تریں کیا قضا سے ہم
کیوں ہم کو دل دیا، اُنہیں کیوں دلربا کیا
ترک ادب نہ ہوتا تو کہتے خدا سے ہم
بستر لگا کے خوش نہ ہوں، کیوں کوئے یار میں
منزل پر آج پہنچے ہیں فضل خدا سے ہم
ضامن یہی وسیلۂ بخشش ہے روز حشر
لپٹے رہیں گے دامن خیرالورا سے ہم

---

میں اپنا دل ناداں بیچتا ہوں
خریدو تو جان جہاں بیچتا ہوں
حسیں مول لے کر جو صدقہ اُتاریں
ابھی طائر دل میں ہاں بیچتا ہوں
یہ ہے نقد جاں کا مری جان سودا
میں بے سمجھے بوجھے کہاں بیچتا ہوں

تمنائیں ہیں ساتھہ اے یوسف دل
نہ گھبرا مع کار رواں بیچتا ہوں
خموشی جو اُس بت کی ہو مجھہ سے خواہاں
سخن بیچتا ہوں، زباں بیچتا ہوں
ہے ضامن عجب چیز سچی محبت
نہیں میں یہ جنس گراں بیچتا ہوں

---

ترس کھاتے نہیں عاشق پہ جتنے حسن والے ہیں
وہ باطن میں ستمگر ہیں جو ظاہر بھولے بھالے ہیں
جو آہیں بے اثر میری ہیں، بے تاثیر نالے ہیں
بتائیں آپ پھر ہاتھوں سے کیوں دل کو سنبھالے ہیں
نہ آتا ہو یقیں تم کو اگر اے جاں قسم لے لو
تمہیں پر جان دیتے ہیں تمہیں پر مرنے والے ہیں
خدا اس درجہ بخشی ہے کسی کے سوز الفت نے
ستاروں سے سوا روشن ہمارے دل کے چھالے ہیں
ہر اک جا پردہ ظاہر ہے، نظر سے ہوکے پوشیدہ
کرشمے یار کی قدرت کے اے ضامن نرالے ہیں

---

یہ سرائے دھر ہے غافلو! کسی کو بھی جائے اماں نہیں
کوئی آج جاتا ہے کل کوی، کوئی رہنے والا یہاں نہیں
نہ سکندر اب ہے کہیں نہ جم، ملا خاک میں نہ رہا حشم
فقط اب ہے نام جہاں میں، کسی جا پہ اُن کا نشاں نہیں

تجھے ضامن اوروں سے کام کیا ، جو خدا سے مانگے وہ پائے گا
اُسے ذرہ ذرہ کی ہے خبر ، کوی راز اُس سے نہاں نہیں

---

ترے صدقہ جلوہ دکھا دینے والے
مری بگڑی قسمت بنا دینے والے

تمنا ہے ، ہو غش پہ غش یو نہیں طاری
او دامن سے مجھہ کو ہوا دینے والے

کہاں ایسی قسمت ،کہیں سن کے نالہ
کدھر ہے ، ادھر آ صدا دینے والے

مرایض محبت کی اپنی خبر لے
ارے درد دل کی دوا دینے والے

خدا جانے کیا ہو اگر تم کہے تو
اشارے سے مردے جلا دینے والے

ملیں گے تجھے جام کوثر کے ضامن
وہاں ہوں گے مشکل کشا دینے والے

اُنھیں ضد ہے کہ ہلکے رنگ کی کلیاں ہوں کنگن کی
تقاضا کمسنی کا ہے ابھی باتیں ہیں بچپن کی

تصور میں ہمیشہ سامنے رہتا تھا جو اے دل
قیامت ہے وہ بیٹھے آج میں اب آکے چلمن کی

کیا ہرباہ بعد مرگ مجکو، ضد کوی دیکھے
اڑائی ٹھوکروں سے خاک آکر میرے مدفن کی

مجکو عادت نہیں پر بزم میں تیری ساقی  تھوڑی پی لیتا ہوں جس وقت گھٹا ہوتی ہے
ہاتھ میں کیوں نہ ملے خون ہمارا قاتل  تجھ پہ میں شوخی یہ کہاں رنگ حنا ہوتی ہے
دم میں ہشیار کو دیوانہ بنا دیتی ہے  نگہ مست عجب ہوشربا ہوتی ہے

صدمۂ ہجر سے ضامن نہ ہو کیوں دل نڈھال
ٹھیس جب شیشے میں لگتی ہے صدا ہوتی ہے

---

برائے نمونہ ایک سلام بھی لکھا جاتا ہے ملاحظہ ہو —

سلام

ایسا تھا شوق وغا شہ کے عزا داروں کو  صبح سے کھینچ لیا میاں سے تلواروں کو
رلقا شاہ کے باندھے تھے کمر مرنے پر  صبح کب ہوتی ہے دیکھا کئے وہ تاروں کو
کہتے تھے خون و محمد کہ نہ ہو کچھ فرق  دیکھ لو انگلیوں پر نیمچوں کے دھاروں کو
گل زہرا جو رواں دشت میں تھا برہنہ پا  سوکھے کے کانٹا ہوئے غم یہ ہوا خاروں کو

اب مشرف کرے ضامن کو زیارت سے خدا
حج کا ملتا ہے شرف شاہ کے زواروں کو

---

## طالب

ان کا نام شیخ سبحان علی تھا ۔ حنفی المذہب اور طریقہ نقشبندیہ کے پیرو تھے ۔ بد نصیبی سے بالکل بے علم رہے ۔ اگرچہ اپنی بے علمی کا کمال افسوس تھا مگر لکھنے پڑھنے کی جانب کبھی توجہ نہ ہوئی ! روز مرہ کے عبارت لکھنے کے بڑے شائق تھے ۔ محض اس شوق کی تکمیل کے لئے ہر وقت پنسل اور نوٹ بک جیب میں رہتی ۔ حساب لکھنے کا طریقہ بھی انوکھا تھا ۔

روپیہ کے لئے گول دائرہ ( ○ ) اس شکل کا بناتے ۔ 'آنہ' کے واسطے ( ◦ ) یہ نشان تجویز کیا تھا اور پیسہ کے لئے اس صورت کی ( — ) پڑی لکیر اختیار کی تھی ۔ اسی عنوان سے بھی کھاتہ تیار کرلیا تھا اور حساب میں کبھی غلطی نہ کرتے ۔ شاید مبداء فیاض نے ریاضی داں قلب و دماغ عنایت کیا تھا ۔ مُشکل مُشکل ریاضی کے سوال اُنگلیوں کی پوروں پر شمار کرکے حل کردیتے شاعری کا بھی شوق تھا ۔ عاشقانہ غزلیں تصنیف کرتے تھے ۔ لیکن وارستہ مزاجی نے تدوین کلام کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا ۔ اشعار نظم کئے ، احباب کو سنائے ، اُن کو خوش کیا ، آپ مسرور ہوے اور بس ! اگر کسی نے کوئی شعر نوٹ کر لیا توخیر ورنہ چند روز بعد حافظہ کا ورق سادہ اور کلام فنا ہو گیا ۔ یہی سبب ہے کہ آج دنیائے سخن میں طالب کی غزلیں عنقا کا حکم رکھتی ہیں ۔ایک مشفق ( شفیع صاحب ) نے ان کے چند اشعار لکھوا دئے تھے جو ترتیب تذکرہ کے وقت کام آئے —

طالب کا وطن شاید بنارس یا مضافات بنارس ہے ۔ مختلف مقامات کا دورہ کرکے بنارسی اشیا کی تجارت ذریعۂ معاش تھی ۔ مغلوب‌الغضب اور مخمورالمزاج آدمی تھے ۔ ذرا ذرا میں خفا ہونا ، روٹھ جانا جزو عادت تھا ۔ اپنے اشعار گا ، گا کر پڑھتے ۔ کبھی کبھی چشم و آبرو کی گردش اور ہاتھوں کی حرکت سے کام لے کر مفہوم شعر ذہن نشین کرنے کی سعی کرتے ۔ تلمذ کا حال دریافت نہ ہوسکا ۔ کلام یہ ہے —

لعد مٹے تو مٹے ، اس کا غم نہیں طالب کہ ہم تو یار کا زور شباب دیکھتے ہیں

چین لیتا نہیں پہلو میں یہ بجلی کی طرح　　وہ چلے آئیں تو اس دل کو قرار آ جائے
باتیں اغیار کی سننا نہ مریجاں ' دل سے　　کہیں ایسا نہ ہو شیشہ پہ غبار آ جائے
باغ سے نکلے ہو ' پھولوں کی بلا کر ڈالی　　اور رستے میں جو طالب کا مزار آ جائے

---

اُف ! اُن کے شباب کا عالم　　ہر ادا قہر ہے ' قیامت ہے
سیکڑوں فکریں ' سیکڑوں آلام　　زندگانی بڑی مصیبت ہے
آ چکا ہے قریب وقت سفر　　بس! گھڑی دو گھڑی کی زحمت ہے
پھر کہاں طالب شکستہ جگر
اُس کا جو دم ہے وہ غنیمت ہے

---

## ظہیر

حافظ مولیٰ بخش نام اور ظہیر تخلص تھا - غریب کور مادر زاد تھے - اندھے پن کی بدولت اکتساب علوم سے محروم رہے لیکن کلام پاک حفظ کرکے حافظ بن گئے تھے - میرٹھہ اِن کا مولد و مسکن ہے - عنفوان شباب سے شعر سخن کا شوق پیدا ہوا اور بطور خود کچھہ کچھہ نظم کرنے لگے - اُن دنوں دھلی کی سمت سے آنے والی ہواؤں نے اہل میرٹھہ کو شاعری کے رنگ میں رنگ دیا تھا - ہفتہ وار اور ماہوار مشاعرے منعقد ہوا کرتے اور مقامی شعرا کامل انہماک کے ساتھہ داد سخن دینے میں مصروف رہتے دھلی سے کچھہ زیادہ فاصلہ بھی نہ تھا - وہاں کے خوش گو شعرا کو بھی دعوت شعر و سخن دی جاتی اور وہ بڑے ذوق و شوق سے شریک مشاعرہ ہو کر خوش کلامی و شیریں مقالی سے میزبانوں کی ضیافت طبع کرتے -

یہی زمانہ ظہیر کی ابتدائے شاعری کا ہے - بعض سہولتوں کے خیال سے اصلاح کلام امداد حسین ظہور کے سپرد کی - اُنہوں نے اس ادبی خدمت کو قبول کرتے ہوئے اپنے تخلص (ظہور) کی رعایت سے ظہیر تخلص تجویز کیا اور غزلوں پر اصلاح دینے لگے -

ظہیر گاہ بگاہ مقامی مشاعروں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے - نام و نمود اور شہرت کی مطلق طلب نہ تھی - گمنامی کی حالت میں زندگی گذار دی - ترتیب تذکرۂ سخن الشعرا کے وقت حیات تھے مولوی عبد الغفور خاں نساخ نے ان کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے - نمونہ کلام حاضر ہے —

کیا گلہ چرخ سفلہ پرور کا بخت واژوں ہے اہل جوہر کا
در دنداں کی آب کے آگے شرم سے زرد منھ ہے گوہر کا
مجکو دفنا کے قبر میں احباب ساتھ چھوڑیں گے زندگی بھر کا
کیا گزرتی ہے جان پر دیکھوں سامنا ہے پھر اک ستمگر کا

دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں ظہیر
لطف معبود بندہ پرور کا

## عابد

اس شاعر اُمی کا نام عابد حسین اور عابد تخلص تھا - لکھنؤ جائے ولادت و قیام ہے - فن سخن میں سید عباس حسین فصاحت سے استفادہ کرتے تھے - افلاس و تنگ دستی جو شاعروں کی میراث ہے نسبتاً اِن کے حصہ میں زیادہ آئی تھی ابتدا سے انتہا تک فلاکت و نکبت نے ساتھ نہ چھوڑا - انجام کار قبر میں جا سلایا —

اس غریب شاعر کا ذریعۂ معاش دست کاری تھا۔ تمام دن کلّی (کرنی) بسولی بناتے اور پھر نخاس میں لاکر دو تین آنے کو فروخت کرتے۔ لاگت منہا کرکے چار چھ پیسے بچتے جس میں بمشکل بسر کرتے اور اسی گاڑھی کمائی میں سے پیسہ دھیلا پس انداز کرتے جاتے۔ جب کچھ جمع ہو جاتا تو مشاعرہ منعقد کرکے شعرا کی دعوت کردیتے —

مجھ سے جناب محشر فرماتے تھے کہ عابد کو شاعری سے بے حد اُنس تھا۔ خود فاقے کرنا اور پیٹ کاٹنا گوارا تھا لیکن مقدور بھر مشاعرہ ناغہ نہ ہونے پاتا۔ غربت و پریشانی کا حال تو بیان ہی ہوچکا ہے، اس حالت میں شاعروں کی خاطر و تواضع معلوم، اور مشاعروں کے انعقاد و انصرام میں خاطر خواہ صرف کرنے کی ضرورت! لیکن عابد کی حالت چھپی ہوئی نہ تھی۔ شعرائے لکھنؤ اُن کی مفلسی اور ذوق و شوق سے بخوبی واقف تھے۔ یہ ہی سبب ہے کہ عابد کی دعوت مشاعرہ کبھی رد نہ ہوتی۔ تمام شاعر خوشی خوشی آتے اور بزم سخن میں شریک ہوکر نادار شاعر کی عزت افزائی کرتے —

مشاعرے کا انتظام بھی عجیب تھا! کسی نہ کسی ذی استطاعت کی طرف سے فرش کا اہتمام ہو جاتا۔ اگر روپیہ پیسہ ہوا تو خود عابد مرحوم کرائے کی دری چاندنی لاکر بچھا دیتے۔ روشنی کے لئے مٹی کے چراغ کام آتے اور شعرائے نازک خیال و شیریں مقال تیلیوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں غزلیں پڑھ پڑھ کر بزم مشاعرہ کو رشک گلزار بنا دیتے۔ اُن کے دل نشین نغموں پر ترانۂ بلبل کا دھوکا ہوتا! ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ شرکائے بزم کسی امر میں تکلف نہ فرماتے حقہ نہیں آیا تو شکایت نہیں، پانوں میں کمی ہوی تو ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ خلوص سے ملنے والی پان کی ایک ٹلوری کو ع —

برگ سبز است تحفۂ درویش

کا مصداق تصور فرماتے تھے - اللہ اللہ ! یہ شوق تھا اور یہ لوگ جنہوں نے عالم عسرت کی منتہا میں رہ کر اپنی شاعری کی خدمات سے غفلت نہیں کی - جب تک زندہ رہے ترقی زبان کے کوشاں رہے - اب نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ زمانہ - مجلس احباب میں ذکر ہی ذکر باقی ہے - عرصہ ہوا کہ عابد مرحوم نے اپنے مکان مسکونہ واقع مولوی گنج میں وفات پائی اور پس ماندوں میں اپنا ذکر خیر چھوڑ گئے —

ان کا کلام تلف ہوگیا - لاکھہ تلاش کی سراغ نہ ملا - منتہائے کوشش سے جو چند اشعار دستیاب ہوے یادگار کی طور پر درج تذکرہ کئے جاتے ہیں —

ہجر کی رات ' کوی رہ رہ کر دونوں ہاتھوں سے دل مسلتا ہے
اپنے بیمار کی خبر لینا اب کوی دم میں دم نکلتا ہے
دل بے تاب کا خدا حافظ ناوک چشم یار چلتا ہے
شانہ کش لاکھہ ہو دل صد چاک کہیں زلفوں کا خم نکلتا ہے
پیچ در پیچ ہے رہ کاکل اس کا بھٹکا بھی کم نکلتا ہے
پھروں قابو میں دل نہیں آتا یوں مچلتا ہے ' جب مچلتا ہے

---

ماہتابی پہ ہے وہ رشک قمر شرم سے چاند چھپتا پھرتا ہے
زلف پر خم کی یاد میں شب بھر آپ سے آپ دم الجھتا ہے

---

## غریب

غریب داس نام غریب تخلص - یہ شاعر بھی ہندوستان کا مایۂ ناز اور کبیر داس سے دوسرے درجہ پر ہے - اس کی ولادت سنہ ۱۷۱۷ ع میں

چوڑانی نام ایک گاؤں میں ہوئی جو نواح دھلی میں واقع ہے۔ قوم کا جاٹ تھا۔ باپ کا نام بلرام ہے۔ اس کی نسبت اہل ہنود کا خیال ہے کہ کبیر داس نے دوسری دفعہ اس کے کالبد میں جنم لیا ہے اور تصدیق میں ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کرتے ہیں جو اُن کی خوش اعتقادی اور ارادت مندی کی روشن دلیل ہے —

غریب داس کو خزانۂ قدرت سے جو دل و دماغ عطا ہوا تھا، اُس کی بدولت نہایت معزز و ممتاز تسلیم کیا گیا، خصوصاً پنجاب میں تو پوجا جاتا ہے۔ اِس کی بانیوں اور دوہوں کی اُتنی ہی قدر و منزلت کی جاتی ہے جتنی گرو نانک جی کی کتاب کی—

گھر والے چوٹپن میں اُسے پیار سے غریبا کہا کرتے تھے۔ یہ نام اس درجہ مشہور ہوا کہ سارا گاؤں اسی لقب سے یاد کرنے لگا۔ اِس کی نسبت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ گاؤں کے چرواہوں کے ساتھ جنگل میں گیا، چونکہ کبیر داس کے ارادت مندوں میں تھا اِس لئے اکثر اُن کا دھیان گیان کیا کرتا۔ اُس روز بھی وہ کبیر داس کے تصور میں غرق تھا۔ استغراق نے محویت کا درجہ حاصل کیا تھا۔ دفعتاً کبیر داس ظاہر ہوے۔ اُن کے جلوۂ ہوش ربا کے نظارے سے غریب داس پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ہوئی اور اُسی خود رفتگی کے عالم میں اُس نے ادب و آداب سے کنارہ کرتے ہوے ضیافت قبول کرنے کی استدعا پیش کی۔ چونکہ کبیر داس قیود جسم سے آزاد ہوکر ملائے اعلیٰ کے ساکن ہو چکے تھے اور رابستگان حیات و پیکر کی طرح خواہشات کے پتلے نہ تھے جنہیں کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے اس لئے اُنہوں نے انکار کیا لیکن غریب داس کا اصرار حد سے گذر گیا اور اِنہیں اُس کی تسلی کے واسطے کہنا پڑا کہ بچوڑے کا دردہ پیونگا" جواب سنتے ہی غریب داس

بہت سے بچھوڑے پکڑ لایا اور عرض کی جس بچھوڑے کو آپ پسند کریں اُس کا دودھ دوھدوں ؟ کبیر داس نے ایک بچھوڑے پر ہاتھہ رکھہ دیا جو غریب داس کی ملک تھا اِس ہاتھہ کی برکت سے بچھوڑے کے تھنوں میں دودھ اُتر آیا اور غریب داس نے ایک ظرف میں تھوڑا دودھ دوہ کر کبیرداس کے سامنے پیش کیا - انہوں نے برائے نام وہ ظرف لبوں سے لگاکر واپس کرتے ہوئے غریب داس کو وہ جوٹا دودھ پی جانے کا حکم دیا - اِس حکم کی تعمیل تو فوراً ہوئی لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ غریب داس غش کھاکر زمین پر گر پڑا اور کبیر داس غائب ہو گئے - ساتھیوں نے غریب داس کی یہ حالت دیکھہ کر ہوشیار کرنا چاہا - جب کسی طرح ہوش نہ آیا تو بہت گھبرائے اور اُس کے مکان جا کر اُس کے مرنے کی اطلاع کی ! اس حادثہ جاں فرسا کو سن کر اُس کے گھر والے بیتاب ہو گئے - مضطرب و سراسیمہ جنگل میں آئے اور غریب داس کی حالت دیکھہ کر اُس کی موت کا یقین کر لیا - آن واحد میں یہ خبر عام ہوگئی - اہل برادری جمع ہوئے - آرتھی تیار کی گئی - جملہ رسوم ادا ہوئے میت اُٹھا کر مسان لائی گئی - چتا تیار ہوئی ' آرتھی چتا پر رکھہ کر آگ دینے کی تیاری ہوئی - ہنوز آگ نہیں دی گئی تھی کہ آپ سے آپ ارتھی کی تمام بندشیں ٹوٹ گئیں اور غریب داس " ست کبیر " اور " بندی چھوڑ ' کے نعرے لگاتا ہوا اُٹھہ بیٹھا —

یہ شاعر بھی علم سے نا آشنا تھا - لیکن ذہن رسا اور فکر بلند کی مدد سے ایسے ایسے نادر مضامین نظم کئے ہیں جو آسمان سخن پر آفتاب کی طرح روشن وضوفشاں ہیں کلام شایع ہو چکا ہے - اِس کی تصنیف کی ہوئی بانیاں چوبیس ہزار سے بھی متجاوز ہیں - اس نے سنہ ۱۷۸۲ ع میں وفات پائی - کلام کا نمونہ یہ ہے جو کبیر داس کی مدح میں کہا ہے —

پانی سے پیدا نہیں ' شواسا نہیں سریر
پانچ تتب جا کے نہیں تا کا نام کبیر
آنلت کوٹ برھما نڈ میں ' بندی چھوڑ کہائے
سو تو پورکھہ کبیر ھیں جلنی جنانہ مائے

---

لگن منڈل سے اُترے ، ست گرو پورکھہ کبیر
جل ماں ھی پوڑھن گئے ' سب پیرن کے پیر

# اساتذہ کی اصلاحیں

از

( حضرت صفدر مرزا پوری مرحوم )

نکتۂ اصلاح حضرت وسیم

مصرعہ یوسف نفیس بنگلوری :- قدم خاک ہی پہ پڑتا ہے اہل الفت کا
دیار عشق میں کوسوں زمیں نہیں ملتی

آقائے سخن نے اس شعر پر یہ نوٹ تحریر فرمایا جلیل القدر نے " پہ " کو ترک نہیں فرمایا - میں نے ترک کر دیا ہے - آپ اپنے اُستاد کے پیرو رہئے اور مصرع نہ بدلئے - میں بطور خود یہ مصرع لکھتا ہوں — ع

قدم خاک ہی پر اہل طلب کے پڑتے ہیں

یہ مصرع رکھئے گا تو ہمایی طرف سے دو صد " وسیم "

جناب نفیس کے مصرع میں " پہ پڑتا " کانوں کو ناگوار ہے کیوں کہ دو ( پ ) کا یک جا ہونا مخل فصاحت ہے—

حضرت وسیم کے مصرع نے اس عیب کو بھی رفع کر دیا - گو میں بھی حضرت جلیل کا مقلد ہوں مگر اس موقع پر " پہ " ضرور مخل فصاحت ہے—

نفیس :-　تری گلی میں لگے ہیں یہ ڈھیر کشتوں کے
میری لحد کو بھی دو گز زمیں نہیں ملتی

اصلاح :-　تری گلی میں لگے ہیں یہ ڈھیر کشتوں کے
کہ میری قبر کو دو گز زمیں نہیں ملتی

" بھی " بھی زاید تھا اس مصرعۂ ثانی میں " کہ میری قبر کو " بنایا گیا —

نفیس :-　یہ میں نے خاک اُڑائی ہے جوش وحشت میں
اب آسمان کے نیچے زمیں نہیں ملتی

نسخہ :-　یہ وحشیوں نے اُڑائی ہے خاک مل جل کر
اب آسمان کے نیچے زمیں نہیں ملتی

اس پر آئیم خلف حضرت وسیم نے یہ نوٹ تحریر فرما " بھائی صاحب میرے خیال میں مل جل کا لفظ نگینہ ہے شعر بلیغ ہو گیا - صرف اس ٹکڑے کی وجہ سے اس مصرع کے ساتھ یقیناً یہ شعر صاد کے قابل ہے گو قبلہ و کعبہ نے نسخے کے طور پر لکھ دیا ہے " آئیم "

نفیس :-　یہ مذاق ارض حرم میں شرب ذنب کی ہے
کہ تشنہ لب ہیں ذرا کو کہیں نہیں ملتی

اصلاح :-　یہ تو سے واعظوں کے ہے شراب کا توڑا
کہ تشنہ لب ہیں ذرا کو کہیں نہیں ملتی

یہ نوٹ تحریر فرمایا کہ " ارض حرم کو پاک رہنے دیجئے " —

نفیس :-　یہ حسن و عشق کی خلوت کا اک کرشمہ ہے
جو دامن اُن کا میری آستیں نہیں ملتی

اصلاح :-　شب وصل کا اُن کی یہ اک کرشمہ ہے
جو دامن اُن کا میری آستیں نہیں ملتی

یہ نوٹ تحریر فرمایا - حسن و عشق صاف معنے نہیں دیتا تھا الجھاؤ تھا —

نفیس :- جہاں آنسو گرا اک چشمۂ زمزم وہاں اُبلا
پڑی بنیاد کعبہ کی جہاں میں نے جبیں رکھ دی

اصلاح :- جہاں آنسو گرے اک چشمۂ زمزم وہاں اُبلا
پڑی بنیاد کعبہ کی جہاں میں نے جبیں رکھدی

" گرا " اور " گرے " میں جو فرق ہے ظاہر ہے " گرا " بحالت واحد اور " گرے " بحالت " جمع "

نفیس :- مرے دل میں جمایا نقشہ اس نے بت پرستی کا
مصور کھینچ کر تونے جو تصویر حسیں رکھدی

اصلاح :- مرے دل میں جمایا نقشہ اپنے حسن کا اُس نے
مصور کھینچ کر تونے جو تصویر حسیں رکھدی

" اُس نے بت پرستی کا " بجائے اس کے " اپنے حسن کا اُس نے " بنایا - " بت پرستی کا " یہ ٹکڑا بے کار سمجھا گیا - کیوں کہ بت پرستی کو تصویر سے کیا تعلق حسن سے البتہ لگاؤ ہے —

نفیس :- یہ بت مکہ سے نہ بولیں اور میں سجدے کروں ان کو
وہ خوبی کون سی ان میں ہے صورت آفریں رکھدی

اصلاح :- یہ بت مکہ سے نہ بولیں اور میں سجدے کروں ان کو
وہ خوبی کون سی ان میں الہ العالمین رکھدی

مصرعۂ ثانی میں " ہے " زائد تھا اس لئے بجائے " صورت آفریں " کے " الہ العالمین " بنا دیا مگر ہیچمدان مؤلف کی رائے میں مصرعۂ ثانی سے " صورت آفریں " کا ٹکڑا ہٹانا نہ چاہئے - مصرع یوں بھی ممکن تھا - اس سے بہتر تو یہی تھا - ع - عجب خوبی یہ ان میں تونے صورت آفریں رکھدی - اب پہلے

مصرع کو ملاکر پڑھئے —

یہ بت منہ سے نہ بولیں اور میں سجدے کروں ان کو
عجب خوبی یہ ان میں تو نے صورت آفریں رکھدی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصرع اسی مصرع کا محتاج تھا —

نفیس :- چلے کا مجھ پہ کیا جادو زمانے کی دورنگی کا
نظر میں میں نے رکھا ہے تمہاری چشم پرفن کو

اصلاح :- چلے کا مجھ پہ کیا جادو زمانے کی دورنگی کا
کہ برسوں میں نے دیکھا ہے کسی کی چشم پرفن کو

اصلاح دیکر یہ نوٹ حضرت وسیم نے تحریر فرمایا - نظر میں رکھنا " تکلف سے خالی نہ تھا - اس لئے تصرف کرنا پڑا " سبحان اللہ کیا اُستادانہ اصلاح دی ہے —

نفیس :- ستم ہے پڑوٹ پڑی ہے یہ کیسی آپس میں
نگاہ لطف سے چین جبیں نہیں ملتی

اصلاح :- ادا کی تیغ سے شمشیر کیں نہیں ملتی
نگاہ لطف سے چین جبیں نہیں ملتی

پہلے شعر تھا - اصلاح سے یہ شعر مطلع ہو گیا اور مصرعے برابر کے کس قدر لطف دے رہے ہیں —

نفیس :- آنے کا جوش پر جو مرا بحر انفعال
بہتی پھریں گی حشر میں فردیں حساب کی

اصلاح : دریا ترے کرم کا جو آنے کا جوش پر
بہتی پھریں گی حشر میں فردیں حساب کی

بحر انفعال مہمل سا ٹکڑا تھا - عرق انفعال - اشک انفعال - تو ہے مگر

بحر انفعال نہیں اس پر اُستاد نے کتنا چبھتا ہوا مصرع لگا دیا ہے کہ جس کی جس قدر داد دی جائے کم ہے - اے سبحان اللہ "دریا ترے کرم کا جو آگے کا جوش پر" مصرعۂ ثانی گویا اسی مصرع کا محتاج تھا —

نفیس :- مستانہ وار آتے ہیں وہ جھومتے ہوے
مستی شراب کی ہے کہ مستی شباب کی

اصلاح :- مستوں کی طرح آتے ہیں وہ جھومتے ہوے
مستی شراب کی ہے کہ مستی شباب کی

" مستانہ اور پیر وار کو کہا گیا ہے مگر احتیاط اولیٰ ہے یہ نوٹ جناب رسام نے لکھ کر بجائے " مستانہ وار " " مستوں کی طرح " بنایا گو مستانہ وار بھی صحیح ہے مگر اس اصلاح سے شعر اور صاف ہوگیا —

اسی غزل کا ایک مطلع ہم ذوقین مشاطۂ سخن کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتے ہیں جو لسان الملک حضرت ریاض کے رنگ میں ہے - سنئے

ارض حرم میں سنتے ہیں قلت ہے آب کی
ساقی وہاں بھی نہر بہا دے شراب کی

نفیس :- ہزاروں تیغ ہیں چین جبیں کے قبضے میں
چوری نہیں ہے کہ شمشیر آب دار نہیں

اصلاح :- ہزاروں تیغیں ہیں چین جبیں کے قبضے میں
چوری نہیں ہے کہ شمشیر آب دار نہیں

بجائے تیغ " کے تیغیں " بنا دیا - نفیس نے ہزاروں کے بعد " تیغ " کو واحد کہا تھا اُستاد نے جمع کردیا —

نفیس :- آرائی موسم گل کی غلط خبر کس نے
مرا لباس سلامت ہے تار تار نہیں

نفیس :-  نہیں ہیں پھول مری قبر پر یہ ساغر ہیں
خم شراب ہے ' ساقی مرا مزار نہیں

ان دونوں شعروں پر حضرت وسیم نے اگرچہ کوئی اصلاح نہیں فرمائی مگر جناب حکیم اثیم خلف جناب وسیم نے ان الفاظ میں داد دی - " پر کیف لطیف تشبیہوں میں شعر پورا اُتر گیا جواب نہیں ہو سکتا - ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ " ( اثیم )

( مرسلہ حضرت نفیس بنگلوری )

خواجہ عبدالروف عشرت لکھنوی

نواب محمد داور خاں قلقدر نواب آف کرنول :—

نہ ناز چاہئے قاروں کی طرح سے زر پر
کہ بعد بوجھ اُٹھانا پڑے وہی سر پر

اصلاح :-  لگا نہ جان کو قاروں کی طرح تو زر پر
یہ بوجھ تجکو اُٹھانا ہے ایک دن سر پر

خواجہ صاحب نے " جان " کے ایک لفظ سے مطلع میں جان ڈال دی اور دوسرے مصرع سے تو فصاحت کے دریا بہا دئیے - اور لطف یہ کہ مفہوم وہی رہا —

قلقدر :-  لکھا جو نامہ میں احوال درد فرقت کا
تو راستے ہی میں بجلی گری کبوتر پر

اصلاح :-  لکھا جو نامہ میں احوال بے قراری کا
تو راستے ہی میں بجلی گری کبوتر پر

بجلی کی مناسبت سے " بے قراری " کا لفظ بنایا گیا جس سے شعر میں ایک خوبی پیدا ہو گئی —

قلندر:- جو شوق قتل کا قاتل نے مجھ میں دیکھ لیا
کہا پکار کے رکھ دو گلے کو خنجر پر

اصلاح:- یہہ شوق قتل ہے قاتل کو میں نے جب دیکھا
رہیں پکاریں کہ رکھ دو گلے کو خنجر پر

جناب قلندر کا شعر مذاق شاعری سے گرا ہوا تھا یعنے معشوق کا یہہ کہنا کہ تم خنجر پر گلا رکھدو اس سے عاشق کے شوق قتل کا ارمان ثابت نہیں ہوتا اصلاح سے یہہ عیب رفع ہو گیا - اور شعر مزے کا ہو گیا - نازک اصلاح دی

قلندر:- ہم نشیں رفتہ رفتہ دور ہوئے
ہو گئی ساری انجمن خالی

اصلاح:- ہم نشیں رفتہ رفتہ اُٹھ گئے سب
رہ گئی آہ انجمن خالی

" دور ہوئے " یہہ ٹکڑا مہمل تھا بجائے اُس کے " اُٹھ گئے سب " کیا خوب بنا یا جس سے شعر میں ترقی کے علاوہ معنوی خوبیاں بھی بڑھ گئیں - دوسرے مصرع میں " رہ گئی آہ " یہہ ٹکڑا قابل داد ہے - پھر شیر محمد عاجز فیروز آبادی:-

میرے آزار کو نہیں سمجھا کرتا تشخیص ہے طبیب غلط

اصلاح:- میرے آزار کو نہ سمجھا تو تیری تشخیص ہے طبیب غلط

نہیں کا لفظ ماضی کے ساتھہ نہیں بولتے - اس لئے اُستاد نے " نہ سمجھا تو " بنا کر اس نقص کو دور کردیا - دوسرے مصرع میں تعقید لفظی تھی - اس لئے اُسے بھی بدل دیا - اِس اصلاح سے شعر میں بہت سی خوبیاں پیدا ہوگئیں - اور جو عیوب تھے رفع ہو گئے —

عاجز :- قامت ہے کہ شمشاد ہے غارت گر دیں کا
پھولوں سے رنگ میں عارض ہے حسیں کا

اصلاح :- قامت ہے کہ شمشاد ہے غارت گر دیں کا
گلدستہ ہے پھولوں کا کہ عارض ہے حسیں کا

عارض کو پھولوں کا گلدستہ بنا کر مطلع کو رنگیں بنا دیا ۔۔

عاجز :- دنیا جسے کہتے ہیں وہ ہے خواب کا عالم
دو روز میں ہو جاتا ہے گم نام مکیں کا

اصلاح :- دنیا جسے کہتے ہیں وہ ہے خواب کا عالم
اتھوارے میں ہو جاتا ہے گم نام مکیں کا

اتھوارے کے لفظ نے معنی میں ترقی پیدا کردی - مطلب یہہ ہے کہ انسان آٹھہ دن میں مر جاتا ہے

عاجز :- غیر حالت رات سے ہے عاشق دلگیر کی
انتہا اب ہو چکی ہے گردش تقدیر کی

اصلاح :- غیر حالت رات سے ہے عاشق دلگیر کی
سنہہ چوپٹا تمنے یہہ بھی بات ہے تقدیر کی

اصل مطلع میں باہم دونوں مصرعوں میں ربط نہ تھا - اس اصلاح نے مطلع میں چار چاند لگا دئیے -

عاجز :- قسمت نے شہر شہر کیا در بدر مجھے
آرام کا ملا نہ کہیں ایک گھر مجھے

اصلاح :- غربت نے شہر شہر کیا در بدر مجھے
آرام کا ملا نہ کہیں ایک گھر مجھے

بجاے "قسمت" کے "غربت" کا لفظ بنادیا - اس ایک لفظ نے مطلع میں ایک نئی روح پھونک دی اسی کا نام استادی ہے-

عاجز :- اے تپ نہ جلانا استخواں کو کھائے گا ھما انھیں میرے بعد

اصلاح:- اے تپ نہ جلانا استخواں کو مایوس نہ ھو ھما میرے بعد

"مایوس نہ ھو" اس ٹکڑے نے معنی میں ایسی نزاکت پیدا کردی جو احاطۂ تعریف سے باھر ھے ۔۔

( اوث )

یہ اصلاحیں بھی حضرت عشرت لکھنوی نے خود اپنے قلم معجز رقم سے لکھ کر مرحمت فرمائیں - گو ان شعروں میں وھی پرانا رنگ ھے - مگر ھمیں صرف اصلاح دکھانا مقصود ھے -

# تبصرے

## ادب


قواعد اردو پہلا حصہ - منتخبات ۱۵۳
اردو حصہ اول و دوم - اردو، فارسی ۱۵۳
انگریزی لغت ۱۵۷
کھیتی ۱۵۸
گناہ کی دیوار، ہمزاد ۱۵۸
گڑیا ۱۵۹
کلام جوہر ۱۶۰
آفتاب وطن ۱۶۲
انتخاب حسرت ۱۶۳
تجلیات فرخ ۱۶۴
باغ و بہار ۱۶۵
حسن فطرت ۱۶۷
غنچۂ تبسم ۱۶۸
کلیات عزیز ۱۷۱


## مذہب


مولود ہمایوں ۱۶۹
میلادالنبی پروجکٹ ۱۷۰


## تاریخ


مرقع دہلی ۱۷۰
نبیوں کے قصے ۱۷۲


## متفرق


مظاہر ذہنیات ۱۷۳
اعادۂ شباب و درازی عمر ۱۷۴


## اردو کے جدید رسالے


ندیم ۱۷۵
اردو ایسوسی ایشن میگزین الہ آباد ۱۷۶


— * —

# تبصرے

## ادب

روس میں اردو کی تعلیم

قواعد اردو ' پہلا صفحہ ( ۱۹۲۶ )

منتخبات اردو ' حصہ اول و دوم ( ۱۹۲۷ اور ۱۹۳۰ )

اردو - روسی - انگریزی لغت ( ۱۹۳۰ )

مرتبہ جناب الک سے ئی برانلی کوف صاحب ' دارالاشاعت

"مدرسہ علوم مشرقی" لینن گراڈ

حامیان اردو کو یہ سن کر بہت خوشی ہوگی کہ روس میں لوگوں کو اردو سیکھنے کا شوق ہوگیا ہے اور وہاں اردو زبان کی تعلیم دی جانے لگی ہے۔ اسی سلسلے میں لینن گراڈ کے مدرسہ علوم مشرقی نے چار کتابیں شایع کی ہیں جو روس کے شایقین اردو کے لئے بہت کار آمد ہوسکتی ہیں۔ اس مدرسے کے نصاب میں اردو ۱۹۲۳ میں داخل ہوگئی تھی ' لیکن ان کتابوں کے مرتب ہونے تک روسی طالب علموں کے پاس اردو سیکھنے کا کوئی ذریعہ سوا ان کتابوں کے نہیں تھا جو انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں شایع ہوئی ہیں۔ اب برانلی کوف صاحب اور ان کے چند ساتھیوں اور شاگردوں کی محنت سے چار کتابیں مرتب ہوگئی ہیں جو طالب علموں کی تقریباً کل ابتدائی ضروریات پوری کرسکتی

ہیں - ان میں سے قواعد اردو " ۱۹۲۶ میں شایع ہوئی یہ لسانیات کے جدید اصولوں کے مطابق لکھی گئی ہے اور ان لوگوں کے لئے جو اردو کی لسانی خصوصیات سے واقف ہونا چاہیں یہ بہت کافی ہے - لیکن اس میں مشق کے لئے سوالات نہیں ہیں اور مشق کے بغیر قواعد کا ذہن نشین ہونا دشوار ہے - روسی طالب علموں کو اردو کا ہر قاعدہ انوکھا اور ہر ترکیب نرالی معلوم ہوتی ہوگی ' اس لئے ان کو مشق کی اور بھی حاجت ہوتی ہوگی ' اور اس لحاظ سے یہ کتاب کی ایک بہت بڑی خامی ہے - دوسری کتاب ' منتخبات اردو " حصہ اول اس کمی کو ایک حد تک پورا کرتی ہے - یہ عزیزالدین احمد صاحب کی تصنیف " گنگو تری کا افسانہ " جس کی سادہ اور سلجھی ہوئی زبان حواشی اور فرہنگ کے ذریعہ سے اور بھی آسان کر دی گئی ہے - لیکن پھر بھی اس کا مطالعہ کرنے کی اسی کو ہمت ہو سکتی ہے جس نے مشق کرتے کرتے اردو الفاظ اور جملوں کی ساخت سے خاصی واقفیت حاصل کر لی ہو ' اور اردو عبارت اسی قدر بے تکلفی سے پڑھ سکتا ہو " - منتخبات کا دوسرا حصہ ۱۹۳۰ میں شایع ہوا - اس میں مولوی نذیر احمد کی " مراۃالعروس " مولانا شبلی نعمانی کی " سفر نامہ روم و شام " اور مولانا حالی کی " حیات جاوید " سے اقتباس دئے گئے ہیں ' اور تمہید میں اردو زبان کی مختصر تاریخ بھی کی گئی ہے - اس حصے کے ساتھ فرہنگ دینا ضروری نہیں سمجھا گیا ' کیونکہ اس کے ساتھ ہی ایک خاصی مکمل لغت الگ شایع ہو گئی ہے -

قواعد اردو " میں زبان سیکھنے والوں سے زیادہ ان لوگوں کا خیال رکھا گیا ہے - جنھیں لسانیات سے دلچسپی ہے ' اور گو قواعد صحیح اور مکمل ہیں پھر بھی اس میں شبہ ہے کہ وہ زبان سیکھنے والوں کے لئے ایک پختہ بنیاد کا کام دے سکتے ہیں - مشق کے واسطے سوالات نہ ہونے سے کتاب کی علمی وقعت کم نہیں ہوتی ' مگر عملاً وہ اتنی مفید نہیں ثابت ہو سکتی جتنی مشقوں کے ساتھ ہوتی مثالیں دینے میں بعض جگہوں پر الفاظ کے معنی غلط دیئے گئے ہیں ' صفحہ ۵ ا پر " بت " کے معنی ظاہری " بدیسی ' دئے گئے ہیں ' حالانکہ " بت " یا تو " بات " کا مخفف ہوتا ہے یا ایک قسم کی مرغابی ( بط ) کا نام ہے ؟ صفحہ ۸۹ پر "گرم دلی " کے بجائے " دل گرمی " لکھا ہے ' صفحہ ۹ ۱ پر " یار " کا مونث " یارنی " بتایا گیا ہے ' جو صریحاً غلط ہے - مگر اصول سمجھانے میں مصنف سے کوئی

ایسی غلطی نہیں ہوئی ہے - "گنگوتری کے افسانے" کے ساتھ جو فرہنگ دی گئی ہے اس میں ایسی غلطیاں نہیں ہیں' اور حاشئے میں جو محاورے سمجھا لے گئے ہیں ان کا مطلب بھی روسی میں صحیح ادا ہوا ہے - "منتخبات" کے دوسرے حصے میں حاشئے نہیں ہیں' اور گو لغت کے مرتب کرنے میں "منتخبات" کا مطالعہ کرنے والوں کی مشکلیں آسان کرنا مد نظر رکھا گیا ہے' لیکن مولوی نذیر احمد اور مولانا شبلی کی زبان روسی طالب علم محض لغت کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے کیونکہ لغت میں محاورے وغیرہ بہت کم دئے گئے ہیں - لغت میں کہیں کہیں غلطیاں بھی ہیں - سرسری مطالعے میں جن پر نظر پڑی وہ مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں :-

| | | |
|---|---|---|
| فسی | بمعنی | درد اور تکلیف |
| فسی | بمعنی | فسگون |
| متنا | -- | مشورہ کرنا راضی ہونا - یہ لفظ کسی اردو لغت میں نہیں ملتا |
| متوالپن | بجاے | متوالا پن |
| متیلا | -- | متھالا |
| نتنا | بمعنی | ناچنا |
| برھا | بجاے | بوڑھا |
| بہو | بمعنی | بیوی |
| بوو | بجاے | بھون |
| کڑائی | بمعنی | کڑاپن ' کڑا ہونا ' سخت ہونا |
| کوڑھی | بمعنی | ڈھیر ' گھر ' خاندان |
| لکھنوانہ | بجاے | لکھنؤ یا لکھنو کا |
| لمبانا | بمعنی | لمبا کرنا |
| مُتھا | بجاے | مُیتھا |
| متھا | بجاے | متھی |
| مچھوپلی | بمعنی | مچھلی والے کی بیوی یا مچھلی بیچنے والی |
| محکمہ التموز | بمعنی | عدالت عالیہ |
| مدرستہ | بمعنی | اکادمی ' مدرسہ یا تعلیمی ادارہ |
| نشا | بجاے | نشہ |

| | | |
|---|---|---|
| نلسی | بمعنی | شہوانی |
| نلشپلندی | بمعنی | ایک قسم کے نقبر جو رات کو سڑکوں پر لوٹتے ہیں |
| ہاریل | بمعنی | سبز بجائے ہریالی یا ہریالا ( سبزی ) |
| ہلسم | بمعنی | نرم ' خوشگوار |
| ہتھہ | بجائے | ہت |
| ہتھلے پن | بجائے | ہتھ پن |
| ہلکلا | بمعنی | ہلنا |
| ہلسا | بمعنی | ہلسی |
| یکجہت | بمعنی | وفادار ' قابل اعتبار ' دوست |

ایسی غلطیوں کا سبب صرف یہ ہے کہ کسی واقف کار اہل زبان سے مدد نہیں لی گئی ' انہیں زیادہ اہمیت نہ دینا چاہئے - روسی مدرسے اور یونیورسٹی صاحب کی کوشش بہت قابل قدر ہے اور ہمیں امید ہے کہ بہت سے روسی اس سے فائدہ اٹھائیں گے - اعتراض کا حق ہمیں اسی وقت ہو گا جب ہم اردو میں روسی زبان کے قواعد اور فرہنگ شایع کریں اور ان میں ایسی غلطیوں سے بچے رہیں -

اردو ادب کی جو تاریخ " منتخبات " کے ساتھہ دیباچے کے طور پر لی گئی ہے اسے مرتب کرنے میں گارساں دتاسی اور رام بابو سکسینا کی تصانیف سے مدد لی گئی ہے - ہندوستان میں مختلف زبانوں کی آمیزش ' اردو کا آغاز اور تدریجی نشو و نما تفصیل سے بیان کیا گیا اور اردو کے دکنی سرپرستوں اور قدردانوں کا پورا حق ادا کیا گیا ہے - اردو شاعری پر چند اعتراض بھی کئے ہیں مثلاً یہ کہ اس کا میدان بہت تنگ ہے اور اسے روزمرہ زندگی اور ہندو ستان کے مناظر فطرت سے بہت کم تعلق رہا ہے - لیکن ان کا اعتراض مخالفانہ نہیں محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے قسم کا مذاق رکھنے کی وجہ سے وہ ہماری شاعری کا پورا لطف اٹھانے سے معذور ہیں - مغربی میں ایک جگہہ رجب علی بیگ سرور کا نام سرور چھپ گیا ہے ' ملا راشدالخیری کی تصانیف " صبح زندگی " وغیرہ حکیم محمد علی کی طرف منسوب کردی گئی ہیں ' مگر انیس کو ان شاعروں کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے جنہوں نے سپہ گری چھوڑ کر شاعری کا پیشہ اختیار کیا تھا ' اس لئے کہ سپہ گری میں نفع یا شہرت حاصل کرنے کا امکان نہیں رہا تھا - لیکن یہ یہ بھی معمولی غلطیاں ہیں ' اور ہمیں ان کا خیال بھی نہیں

رہتا جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ ہندوستان میں اردو کی وہی حیثیت ہے جو روس کی متعدد ریاستوں میں روسی زبان کی آج کل جب اردو کے مقابلے میں متعدد زبانیں میدان میں آگئی ہیں ہمیں ایسی باتیں سن کر صرف خوشی نہیں ہوتی بلکہ ہمارے حوصلے بھی بڑھتے ہیں -

(م م)

---

## کھیتی

مصنفہ محمد مجیب صاحب، بی اے (اکسن) پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی - مطبوعہ جامعہ پریس - دہلی ۸۰ صفحے - قیمت چھ آنے)

اس ڈرامے کے اشخاص فرضی یا خیالی نہیں ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہی لوگ ہیں جن سے ہمیں آئے دن سابقہ پڑتا ہے - اور جن کے اثر سے ہماری قومی زندگی کی بری یا بھلی جیسی بھی ہو، تشکیل ہو رہی ہے - مصنف اس خیال کے حامی معلوم ہوتے ہیں کہ زندگی اور آرٹ دو علحدہ علحدہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ لازم ملزوم ہیں اور ایک دوسرے پر اپنا اثر رکھتی ہیں اگرچہ اس ڈرامے میں مصنف نے زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے مگر وہ اشاروں اشاروں اور باتوں باتوں میں بڑی صفائی سے وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جو شاید کوئی واعظ کہتا اور بھونڈے طریقے سے کہتا - اور یہی بات ڈراما کا اصل مقصد ہے - ڈراما لوگوں کے سامنے انہیں کی روزمرہ کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے - اور ان ہی کے سامنے ان کے دلوں کے چور اور ان کی نیتوں اور منصوبوں کے اصلی محرکات کو اس طرح کھول کر بیان کرتا ہے کہ وہ خود تعجب کرنے لگتے ہیں —

محمد مجیب صاحب نے اپنے ڈرامے میں عبدالغفور کی زبانی وہ سب کچھ بیان کر دیا ہے جس سے ہمارے آج کل کے نام نہاد لیڈروں کی ذہنیت کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے یہ لیڈر سیدھے سادے لوگوں کو کس ہشیاری سے اپنے قبضے میں لاتے ہیں اور اقتدار کو برقرار رکھنے کے واسطے کیا کیا تدبیریں کرتے ہیں اور اسی ضمن میں قابل مصنف نے نہایت لطف کے ساتھ ہندو و مسلم مفاد قوموں کی اصلیت بیان کی ہے اور ان حضرات کی گرفت کی ہے جو واقعی

ان ساری بد مزگیوں کے حقیقی ذمہ دار ہوتے ہیں - عبدالغفور کے پہلو بہ پہلو ایک اور دوسرا کیریکٹر حسام‌الدین کا ہے - یہ ایک تعلیم یافتہ خوشحال نوجوان ہیں - دل میں قوم کا درد ہے اور عقل سلیم رکھتے ہیں - حسام‌الدین بخلاف مولوی عبدالغفور کے اپنے ملنے جلنے والوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے جانی دشمن نہیں ہیں اور اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کریں اور اپنی خدمت اور ایثار سے ان کی نظروں میں عزت حاصل کریں - ایک جگہ حسام‌الدین کی زبانی نہایت دلنشین فقرہ کہا گیا ہے - مسلمانوں کو سمجھاتے سمجھاتے وہ ان سے یوں مخاطب ہوتا ہے " خدا نے جس زمین پر تمہیں بسادیا ہے ' جس ملک کو تمہارا دیس بنادیا ہے ' جن لوگوں کے ساتھ تمہیں رکھا ہے ' اس میں اس کی کوئی مصلحت ہوگی " --

اس ڈرامے میں ادبی اور فنی دونوں خوبیاں موجود ہیں اور اگرچہ غالباً اسے ایکٹ کرنے کے لئے لکھا گیا ہے لیکن اسے پڑھنے میں بھی لطف آتا ہے —

( ی )

---

## گناہ کی دیوار - ہمزاں

( مصنفہ اشتیاق حسین قریشی - مطبوعات مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی - "گناہ کی دیوار" - قیمت ۱۲ آنے - صفحات ۱۷۱ "ہمزاں" - قیمت ۶ آنے - صفحات ۴۷ )

---

یہ ڈرامے اسی غرض سے لکھے گئے ہیں کہ اسٹیج پر لائے جائیں - ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہیں بے وجہ چھوٹے چھوٹے سینوں میں تقسیم نہیں کیا گیا - ہندوستانی اسٹیج کی جو حالت ہے وہ ظاہر ہے -- یورپ میں بھی جہاں اسٹیج پر سائنس کی فرشتہ ساز ہوں کی بدولت بڑی سہولتیں حاصل ہیں یا عموماً ایسے وقت بار بار سین بدلے جاتے ہیں جب واقعی کوئی نیا ماحول پیش کرنا مقصود ہو اور اسکے لئے کافی ساز و سامان موجود ہو مصنف کے بھی ان ڈراموں میں اسی اصول پر عمل کیا ہے —

"گناہ کی دیوار" کا قصہ یہ ہے کہ نرمل ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے اور کاملی اس کی بھوی ہے جو نوجوان ہونے کے ساتھ حسین بھی ہے - نرمل کا ایک دوست ہے جس کا

نام گلشن ہے - یہ یک نہایت بے اصول اور دغا باز آدمی ہے - وہ میاں بھوی کی معمولی ناموافقت سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے میں اپنی عیارانہ چال بازیوں کی بدولت کامیاب ہو جاتا ہے - پھر کاملی کا اعتماد حاصل کرکے اسے ایک قحبہ خانے میں بیچ آتا ہے جہاں اسے گناہ کی زندگی پر مجبور کیا گیا - کاملی کی زندگی کے یہ تجربے ظاہر ہے جسے کچھ جان گسل ہوں گے ان کا اندازہ ناظرین خود کرسکتے ہیں - نرمل نے جوگ اختیار کرلیا تھا - اتفاق سے وہ کاملی کے حالات سے آگاہ ہوا - ادھر کاملی کو رنبھر کی بدولت جو انجمن اصلاح افتادگان کا سکریٹری تھا قحبہ خانہ سے نجات ملی - نرمل اور کاملی پھر ایک دوسرے سے ملے اور باوجود ان تمام واقعات کے دونوں میں اتحاد و خلوص قائم ہو گیا - اور گناہ دیوار'' جو دونوں کے درمیان حائل تھی خلوص کی بدولت ڈھے گئی - اس ڈرامے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات انواد کی گناہ کی زندگی اختیاری نہیں ہوتی بلکہ حالات کی مجبوری کا نتیجہ ہوتی ہے - سوسائٹی اس بات میں جو تشدد اختیار کرتی ہے وہ بے جا ہے -اس ڈرامے کی زبان سلیس ہے

'' ہمزاد '' کا قصہ یوں ہے - شاہ رخ ایک دولتمند سن رسیدہ شخص ہیں - ان کی ایک بھوی ہے جس کا نام شکیلہ ہے - دولت کی لالچ میں اس نے ان بڑے میاں کے ساتھ نکاح کر لیا ہے - ایک اور شخص ہے صبیح ' اس سے شکیلہ کی اشنائی ہے - شاہ رخ کا نوکر وزیر ان سب باتوں سے واقف ہے - چنانچہ اس نے بڑی ہشیاری سے ایسی صورت حالات پیدا کی کہ شکیلہ نے مہر سے دست برداری لکھ دی اور صبیح کے ساتھ نکاح کر لیا - دونوں نفع میں رہے - شاہ رخ بھی اور شکیلہ بھی - یہ اپنے گھر خوش وہ اپنے گھر خوش - یہ چھوٹا سا ڈراما مزاحیہ اور بزمیہ ہے -

(ی)

---

## گڑیا

(مصنفہ لفٹننٹ کرنیل ایم اے قریشی - آئی - ایم - ایس مطبوعہ خواجہ برقی پریس --- دہلی)

---

یہ ایک تھریحی ڈراما ہے - اسکے اشخاص یہ ہیں : کلیم ' پروفیسر علم نسواں اور '' بزم تحقیق عادات و اطوار نسواں '' کا صدر - حسینہ ' گڑیوں کے تاجر

یوسف کی بھتی ہے ۔ شوکتہ کلیم کا دوست ہے ۔

اپنے دوست شوکتہ کے کہنے پر کلیم اس بات پر آمادہ ہوتا ہے کہ ایک گڑیا اپنے ہاں رکھے تا کہ عورت کی شخصیت سے وہ مانوس ہو اور اس صنف کے ساتھہ جو اسے بیزاری ہے وہ کم ہو ۔ وہ یوسف کی دکان پر جاتا ہے ۔ ایک گڑیا خریدتا ہے جو اس تاجر کی بھتر حسینہ کی ہو بہو نقل ہے دکان میں حسینہ اور کلیم کی گفتگو ہوتی ہے اور حسینہ تہیہ کرتی ہے کہ اگر اس شخص کو رام نہ کیا تو کچھہ نہ کیا ۔ گڑیا کا روپ بھر کے وہ خود کلیم کے گھر جاتی ہے ۔ کلیم اسے اپنی الماری میں قفل لگا کر رکھہ دیتا ہے ۔ آہستہ آہستہ کلیم کو اس گڑیا سے محبت پیدا ہوئی ۔ دفتر جاتا ہے تو اس کا دھیان رہتا ہے ۔ جب گھر واپس آتا ہے تو کچھہ گڑبڑا تا ہوا ۔ بالآخر جب حسینہ نے دیکھا کہ کلیم کا دل اب پسیجنا شروع ہو گیا ہے تو ایک دن اس نے سارا راز افشا کر دیا قصہ میں حقیقت نگاری کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ۔ ہم نے بعض سائنٹفک لوگوں کے متعلق یہ تو سنا ہے کہ تہل کر گھر واپس آتے ہیں تو خود کولہے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے ڈنڈے کو چارپائی پر لٹا دیتے ہیں لیکن اس میں غالباً مبالغہ ہے کہ کوئی سائنٹفک آدمی مصنوعی گڑیا اور ایک ۱۸ سال کے پیکر نسوانی میں فرق نہ کر سکے ۔ ہاں، اس کے امکان سے انکار نہیں ۔ محض دل لگی کی چیز ہے —

(ی)

---

## کلام جوہر

(رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا
مجموعہ ۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ قرول باغ ۔ دہلی)

---

مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ اس سے پہلے اردو پبلک کے سامنے آ چکا ہے ۔ اور اس پر نقد و تبصرے بھی لکھے جا چکے ہیں ۔ اس کے پہلے ایڈیشن کا ختم ہو جانا اور پھر اس کا شائع ہونا پبلک کی خوش مذاقی پر دلالت کرتا ہے ۔ مولانا مرحوم کا کلام بہت کم ہے ۔ زمانہ نے انہیں اتنی

فرصت ہی نہ دی کہ وہ اطمینان سے بیٹھکر شاعری کرتے - لیکن اس تھوڑے سے کلام سے بھی یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ مولانا کی طبیعت اور جبلت میں شاعری کوٹ کوٹ کر بھری تھی - ان کا شعر ان کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہوتا ہے - بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی سیاست میں بھی ایک لحاظ سے شاعری کا رنگ پایا جاتا تھا رومانیت ان کی طبیعت پر ایسی حاوی تھی کہ وہ معمولی ماہرین سیاست کی طرح نام نہاد اعتدال و حکمت عملی کو خیر باد کہنے میں مطلق پاس نہ کرتے تھے - خود ایک جگہ فرماتے ہیں —

سیکھے ہیں یہ بیپی ایک بزرگوں کی رسم تھی
اس دور اعتدال میں دار و رسن کہاں

اور یہ واقعہ ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے تک ہندوستان میں "دار و رسن" کا ذکر، خصوصاً سیاست میں، شاید سیاسی رومانیت سے زیادہ وقیع نہ سمجھا جاتا ہو -

لیکن بعد میں لوگوں کے خیالات بدلے، ان کی ذہنیتیں بدلیں اور ان کے نصب العینوں میں بڑے بڑے تغیرات پیدا ہوئے - کوئی منصف مزاج آدمی اس سے انکار نہیں کریگا کہ مولانا مرحوم کی "سیاسی رومانیت" کا ان تغیرات کے پیدا کرنے میں بڑا ہاتھ رہا - دراصل انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حیات اجتماعی کی رفتار کے رخ کو بدل دیا —

شاعر مختلف قسم کے ہوتے ہیں - ایک وہ جو لفظوں کے گورکھ دھندے سے آگے نہیں بڑھتے، ایک وہ جو اپنے لفظوں سے ہمارے واسطے تصورات حسن پیدا کرتے ہیں، ایک وہ جو جن کے پاس بعض خیال ہوتے ہیں جنہیں وہ شاعری کی زبان کے توسط سے دوسروں تک پہونچانا چاہتے ہیں اور ایک وہ ہوتے ہیں جو اپنے دلی جذبات کی تصویر دوسرے کے آگے کھینچ دیتے ہیں تاکہ دوسرے بھی ان کی طرح محسوس کرسکیں - مولانا مرحوم کی شاعری اسی قسم کی تھی - ان کے دل پر جو گزرتی تھی اسے لفظوں اور وزن کا جامہ پہنا کر ظاہر کر دیتے تھے - یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر ہر مصرع ولولۂ عشق سے مملو ہے مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

ہو کچھ بھی مگر شور سلاسل تو نہیں یہ
جوہر کا تڑپنا دم بسمل تو نہیں یہ

ہے بات تو جب نزع میں تمکین رہے قایم
مقتل ہے ولا ! رقص کی محفل تو نہیں یہ
کچھہ ترک محبت تو نہیں ' ضبط فغاں ہے
ہم کرلے یہ آجائیں تو مشکل تو نہیں یہ

---

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
خوف غماز ' عدالت کا خطر ' دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوف خدا اور سہی
ہم وفا کیشوں کا ایماں بھی ہے پروانہ صفت
شمع محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

---

دور حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

---

کیا عشق ناتمام کی بتلاؤں سرگذشت دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھہ

اس مجموعہ کے ساتھہ مولوی عبد الماجد صاحب دریا بادی کا مقدمہ ہے جو انھوں نے جوہر اوران کی شاعری کے عنوان سے لکھا ہے ۔ یہ مقدمہ موصوف نے اپنے خاص انداز میں لکھا ہے اور دلچسپ ہے ۔

( ی )

## آفتاب وطن

( مصنفہ لالہ نوپ چند صاحب آفتاب پانی پتی یاد گار حضرت سلیم مرحوم پانی پتی ۔ بڑی تقطیع ' لکھائی چھپائی اوسط درجے کی ' کاغذ اچھا صفحات ۱۱۲ ۔ قیمت ۱۲ آنے علاوہ محصول ڈاک ۔ ملنے کا پتہ بلونت سنگھ ولد لالہ چھ کوڑ سنگھہ پانی پت )

یہ جلاب آفتاب پانی پتی کی مختلف نظموں کا مجموعہ ہے ۔ اس میں ۶۹ نظمیں ہیں اور اخیر میں چار صفحوں پر متفرق اشعار ہیں ۔ اکثر نظمیں

قومی ہیں اور بعض مذہبی اور اخلاقی - معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل قومی درد سے بھرا ہوا ہے وہ طرح طرح سے ہند و اہل ہند کی حالت زار پر آنسو بہاتا ہے کبھی ان کو ہمت و غیرت دلاتا ہے اور کبھی ان کے عیوب کی پردہ دری کرتا ہے ' اس میں شبہ نہیں کہ اس موضوع کے لئے جس شاعرانہ کمال اور استعدادانہ مہارت کی ضرورت ہے وہ حضرت آفتاب میں ابھی پیدا نہیں ہوئی تاہم نظموں کی زبان صاف سادہ اور طرز بیان بھی بڑی حد تک سلیس و عام فہم ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ درد مند دل رکھتے ہیں ان کا قومی احساس اور جذبہ حب وطن بہت زبردست معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنے " بد نصیب وطن " کی بپتا بیان کرنے پر اتر آتے ہیں تو ہندیوں کے دماغی ' ذہنی ' اخلاقی اور روحانی امراض کے ساتھ انتہائی سادگی سے امراض خبیثہ کا بھی ذکر کر دیتے ہیں - اس خیال کا ماخذ غالباً مس میو کی کتاب مدر انڈیا ہے —

کتاب کے شروع میں بلونت سنگھ صاحب پریمی پانی پتی کا ۱۲ صفحوں کا ایک مضمون ہے جس میں انہوں نے مصنف کے حالات اور شاعری کا حال لکھا ہے اور اس کا فخریہ اعتراف کیا ہے کہ آفتاب صاحب کی شاعرانہ زندگی کے بنانے اور سنوارنے میں حضرت سلیم مرحوم کا بڑا ہاتھ ہے - اس ضمن میں سلیم مرحوم کی قابلیت پر بھی بڑی دلچسپ بحث کی ہے جن حضرات کے دلوں میں حب وطن کی گرمی ہے وہ ضرور اس کتاب سے لطف اٹھائیں گے -- ( چ )

---

## انتخاب حسرت

( مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا منتخب کلام مرتبہ جلیل احمد قدوائی صاحب بی - اے - مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی صفحات ۱۳۲ قیمت ایک روپیہ )

حسرت غزل کے استاد ہیں - ان کے کلام میں پختگی ' متانت ' صفائی اور سوز پایا جاتا ہے - زندہ غزل گو شعرا میں ان کا درجہ بہت بلند

ہے - غزل جس سے عبارت ہے وہ حسرت کی غزل ہے --
انتخاب کے شروع میں قدوائی صاحب نے حسرت کی شاعری پر ۱۴ صفحے کا دیباچہ بھی لکھا ہے - انتخاب اچھا ہے اور چھپا بھی اچھا ہے --

---

## تجلیات فرخ

( مصنفۂ جناب سید واجد علی صاحب فرخ بنارسی ، پاکٹ سائز ، صفحات مع مقدمہ و تبصرہ ۲۵۰ - لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی - قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ :-علی ہادی پسر مصنف محلہ انصاراناؤ )

---

یہ جناب فرخ بنارسی کے کلام کا مجموعہ ہے ، اس میں پہلے دس صفحوں پر حضرت علی کی شان میں قصیدہ ہے ، اس کے بعد ۱۶ صفحوں پر مختلف نظمیں ہیں ۱۳۲ صفحوں پر غزلیں ہیں آخر میں ۱۲ صفحوں پر چند رباعیاں ہیں --

اردو شاعروں کا ابھی بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جس پر جدید انقلاب شاعری کا بہت کم اثر پڑا اور جو برابر پرانی طرز میں تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ طبع آزمائی کر رہا ہے - حضرت فرخ بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں - اس مجموعہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل ہیں واقعی ان کی طبع آزمائی کا میدان ہے - غزل میں وہ نئے نئے مضامین ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں غزلیں زبان اور بیان کے اعتبار سے بھی اچھی ہیں - چونکہ ان کو دوسری اصناف سخن سے دلچسپی نہیں اس لئے ان میں کوئی خاص خوبی نہیں -

فرخ صاحب جدید شعرا میں اس وجہ سے شریک ہو سکتے ہیں کہ وہ جدید زبان استعمال کرتے ہیں ، اگر زبان کا یہ امتیاز باقی نہ رہے تو ہماری قدیم شاعری اور ان کے کلام میں بہت کم فرق رہجاتا ہے وہی خیالات اور مضامین ہیں جو قدیم سے نئے نئے اسلوب سے پیش ہوتے آے ہیں - صرف زبان جدید ہے اور وہ بھی اس معنی میں کہ اس میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں جن کو عموماً آج کل انشا پرداز

اور شاعر وضع کر کے استعمال کرتے ہیں بعض ترکیبیں بہت خوش نما معنی خیز اور عام فہم ہیں اور دیر تک زندہ رہنے والی معلوم ہوتی ہیں اور بعض بھونڈی مبہم ناقابل فہم ہیں اور جن کی خود تعمیر میں تخریب چھپی ہوئی ہے -

فرخ صاحب کے کلام میں ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ وہ صوفیانہ مضامین اور رکیک خیالات سے احتراز کرتے ہیں جن سے بہت کم غزل گو شعرا بچے ہیں —

کتاب کے شروع میں جناب رضی احمد صاحب رضی بدایونی نے ۳۳ صفحوں پر تبصرہ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں جناب فرخ کے کلام کے محاسن کسی قدر مبالغے سے بیان کئے گئے ہیں - اس کے بعد جناب ضیاء احمد صاحب ایم - اے پروفیسر علی گڈھ یونیورسٹی کا مقدمہ ہے جو ۴۴ صفحوں پر مشتمل ہے - مقدمہ بڑی محنت سے لکھا ہے اس میں قدیم و جدید شاعری کا مقابلہ کرتے ہوے جناب فرخ کے کلام پر تبصرہ کیا ہے - موجودہ شاعری کو قدیم کے مقابلے میں سرا ہا ہے اور اُردو شاعری کے " درخشاں مستقبل " کی پیشین گوئی کی ہے فاضل مقدمہ نگار نے اپنے دعوے کی بنیاد جن دلائل پر رکھی ہے وہ زیادہ استوار نہیں ، تاہم انھوں نے اپنے خیال کے مطابق جن مسائل پر بحث کی ہے وہ ضرور سنجیدگی اور فکر و تامل سے غور کئے جانے کے قابل ہیں

( ج )

---

## باغ و بہار

( مولفہ میر امن دہلوی ' مع مقدمہ و فرہنگ مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو ' صفحات ۲۶۷ اوسط درجہ کی تقطیع ' لکھا ئی چھپا ئی نہایت نفیس اور پاکیزہ ' کاغذ عمدہ - قیمت مجلد تھا ئی روپے ' غیر مجلد دو روپے - ملنے کا پتہ : انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن )

---

باغ و بہار اردو زبان کی ان کتابوں میں سے ہے جو کسی تعارف کی محتاج نہیں - شاید ہی کوئی بدنصیب اردو داں ہوگا جس نے اُسے پڑھکر لطف نہ اُٹھایا ہو باغ و بہار کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ اردو زبان کی بہت کم ۷۹

کتابوں کو نصیب ہو سکی - اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے آسانی سے ہو سکتا ہے کہ اس کے لکھے جانے کے بعد ہی سے اس کی شہرت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئی اور ایسے زمانے میں جب طباعت اور ذرایع آمد و رفت کی یہ سہولتیں میسر نہ تھیں اس کے سیکڑوں مطبوع و مخطوط نسخے بہت جلد تمام ہندوستان میں شائع ہو گئے تھے - چنانچہ دکن جیسے دور افتادہ حصہ ملک کے بعض شہروں میں اس کے ایسے قلمی نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں جو اصل تصانیف کے ایک آدہ سال بعد کے لکھے ہوے ہیں —

اس کی مقبولیت کا راز اس کی فصاحت و سلاست ہے ' اس کی زبان اور بیان اس قدر سلیس ' پاکیزہ اور دلکش ہے کہ پڑھنے والا بے تکلف اور بے تکان پڑھتا چلا جاتا ہے ' اس میں رو بداد ( پلاٹ ) کی کوئی خاص خوبی نہیں لیکن اسلوب بیان کی سادہ اور فطری لطافتوں نے اس میں جو حسن پیدا کر دیا ہے وہ افسانہ نویسی کے اصول و ضوابط مشکل سے کر سکتے ہیں - میرامن کا یہ بڑا کمال ہے کہ وہ موقع محل کے اعتبار سے نہایت موزوں اور تہیت زبان استعمال کرتا ہے ' اس کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے وہ اپنےمافی الضمیر کو بے تکلف ' موثر اور دلنشیں پیرائے میں پیش کرتا ہے باغ و بہار کی تصنف نے سنجیدہ نثر کا بنیادی پتھر رکھا اس کے بعد لوگوں کو نثر میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا ' اس لحاظ سے تاریخ ادب میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے کتاب بارہا چھپ چکی ہے اور اب بھی چھپتی جاتی ہے ' اس کا انگریزی میں بہت پہلے ترجمہ ہوچکا ہے -

اس کے مختلف ایڈیشنوں میں اختلاف پیدا ہوتا جا رہا تھا اور اکثر غلط بھی چھپ رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی حیثیت ہی نہ بدل جاے ' اس لئے بڑی ضرورت تھی کہ خاص اہتمام سے اسے شائع کیا جاتا ' انجمن ترقی اردو کی یہ حق شناسی ہے کہ اس نے اسے کمال صحت ونفاست کے ساتھہ چھپوا کر شائع کیا ہے کہ دیکھہ کر جی خوش ہو جاتا ہے -

مولوی عبدالحق صاحب مدظلہٗ معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو نے اس کو مرتب کیا ہے ' اور اس پر بڑی تحقیق سے ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے - مقدمہ میں کتاب کے ماخذ کے متعلق جو غلط فہمی اب تک چلی آرہی تھی اور جس کا

شکار خود میراس بھی تھا اس کا ازالہ کیا ہے ' داخلی اور خارجی شہادتوں سے فاضل مرتب نے اس پر بحث کی ہے اور خاص انداز میں تنقید بھی کی ہے - بلغ و بہار پر بیسیوں مضامین لکھے گئے ہیں لیکن اس کو کسی نے اس کی اصل حیثیت میں اب تک پیش نہیں کیا تھا - مولوی صاحب کا مقدمہ تنقید و تحقیق کے اعتبار سے نہایت گراں قدر ہے -

اس کتاب میں کئی ایسے الفاظ و محاورات ہیں جن کے معنی و مفہوم بتانے سے ہمارے بڑے سے بڑے لغت بھی قاصر ہیں ' اس لئے مولوی صاحب نے اخیر میں مشکل و متروک الفاظ و محاورات کی فرہنگ بھی دیدی ہے جو بڑی تحقیق و محنت سے مرتب ہوئی ہے -

امید ہے کہ اردو داں حضرات ضرور اس کی قدر کریں گے اور طلبہ خصوصاً اس سے ضرور مستفید ہوں گے -

( چ )

---

## حسن فطرت

( مصنفہ منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرت مرحوم
گورکھپوری مطبوعہ اشاعت گورکھپور - جیبی تقطیع )

---

عبرت اچھے شاعر تھے اور ان کی شاعری عام شاعروں کی طرح غزل ہی تک محدود نہ تھی - مسدس عبرت مشہور نظم ہے جو اپنے وقت میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھی ' اس میں انہوں نے مسدس حالی کی بڑی خوبی سے تقلید کی تھی - اب تو لوگ بھول بھال گئے - اس مثنوی میں انہوں نے حسن و دل کے معاملات کو نظم کیا ہے - یہ وہ واردات ہے جس کا جلوہ ہر زمانے میں اور ہر مقام میں نظر آتا ہے - مستقد میں نے نظم و نثر میں اس پر بڑی بڑی گلفشانی نہاں کی ہیں - حضرت عبرت نے بھی اس مثنوی میں کمی نہیں کی اور شاعرانہ انداز میں حسن و دل کے معرکوں کی خوب بیان کیا ہے - ان کے بیان میں سادگی ' بے تکلفی اور حسن پایا جاتا ہے —

---

## غنچۂ تبسم

( مجموعہ مضامین سید تمکین کاظمی صاحب - چھوٹی تقطیع -
صفحات ۱۶۹ قیمت دو روپے ' مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن وغیرہ)

---

ظرافت ایک لطیف شے ہے اور اس کے لئے بڑی ذہانت کی ضرورت ہے - تمسخر ' پھکڑ اور چیز ہیں اور ظرافت بالکل دوسری چیز - بہت کم ایسے ادیب ہیں جو اسے خوبی سے نبھا سکتے ہیں - بعض لوگ طبعاً ظریف ہوتے ہیں ان کی ظرافت میں ایک حسن ہوتا ہے گو بعض اوقات وہ حد سے تجاوز ہی کیوں نہ کر جائیں - اُن کی نظر میں خاص بات ہوتی ہے وہ وہیں پڑتی ہے ' جہاں پانی مرتا ہے - بعض طبعاً ظریف نہیں ہوتے مگر ظریف بننے کی کوشش کرتے ہیں اور ظریفانہ مضمون لکھتے ہیں - اس میں کچھہ تو نقل اور تقلید سے کام لیتے ہیں اور کچھہ لفاظی سے ' مگر ان کی کوشش اکثر رائگاں جاتی ہے - اصل ظریف بعض وقت ایک فقرے بلکہ ایک آدھ لفظ میں ایسی کہہ جاتا ہے کہ دوسرا آدمی صفحے کے صفحے لکھہ جائے تو وہ بات پیدا نہیں کر سکتا - یا کبھی وہ ظرافت کے پردے میں ایسی نکتے کی باتیں لکھہ جاتا ہے کہ جن کی ذرا سی تہہ میں قدیم روایات اور تو ہمات کی بڑی بڑی عمارتیں ہل جاتی ہیں - اس مجموعے میں ایسے فقرے یا ایسی باتیں کہیں نظر نہیں آتیں البتہ بعض مضامین جن میں خاص خاص اشخاص اور مواقع کو بیان کیا ہے ایسے ہیں کہ اُسے پڑھنے والا دلچسپی سے پڑھے گا ' خصوصاً ایسے مضامین جن کا تعلق دکن سے ہے - عید کا بیان لکھا ہے خاصا ہے ' لیکن حیدر آباد کی عید میں ظریف کو ایسی پتے کی باتیں نظر آئیں گی کہ وہ لکھنے بیٹھے تو لطف پیدا کر دے - قابل مصنف اس میں کامیاب نہیں ہوے - اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی ظرافت کی تحریروں کا بڑا مقصد ہنسانا اور لطف پیدا کرنا ہے لیکن ان کی تہ میں کچھہ اور بھی ہوتا ہے - غرض ان مضامین میں اصل سے نقل اور سادگی سے تصنع زیادہ پایا جاتا ہے —

# مذہب

## مولود ہمایوں

( مرتبہ مولوی حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس
دتاولی ضلع علی گڑھ - مطبوعہ مطبع عہد آفریں حیدر آباد دکن '
اوسط درجہ کی تقطیع - صفحات ۱۶۲ قیمت سوا روپیہ )

مولوی حاجی موسیٰ خاں صاحب اسلامی خلافت کے کارنامے پر ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ خلافت کے کارنامے کی جھلک دکھائی جاے - پہلا حصہ چھپ چکا ہے جس میں اسلام سے پہلے دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت پر مورخانہ نظر ڈالی گئی ہے دوسرے حصہ کی پہلی جلد بھی چھپ چکی ہے جو ہمارے پاس تبصرے ' کی غرض سے وصول ہوئی ہے اس میں پیغمبر اسلام کی حیات پاک کے حالات ( ولادت سے ہجرت تک کے ) درج ہیں - فاضل مرتب نے محنت سے کام لیا ہے مستند اور وقیع مواد فراہم کرکے اس کو عالمانہ انداز میں لکھا ہے واقعات کی ترتیب بھی اصولی ہے نتائج اخذ و استنباط میں سلیقے سے کام لیا گیا ہے واقعات کی ترتیب میں اپنے مقصد تصنیف کو ہر جگہ پیش نظر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اصل مضمون سے ہٹنے نہیں پائے —

کتاب کی زبان اور بیان زیادہ سلیس اور عام فہم نہیں کم پڑھے لکھے لوگ اس سے سہولت سے مستفید نہیں ہوسکتے - بھیثیت موجودہ کیا بلحاظ ضخامت اور کیا بلحاظ انداز تحریر اوسط درجے کے پڑھے لکھے لوگ کم وقت میں کسی قدر سہولت سے آں حضرت صلعم کی سیرت کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ —

( چ )

## میلادالنبی پروجکٹ

( مرتبہ محمد عبدالغفار صاحب ، جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ - دہلی
چھوٹی تقطیع ' صفحات ۶۴ - قیمت آٹھ آنے )

---

اس سے قبل باغبانی پروجکٹ کا ذکر ان صفحات میں ہو چکا ہے - جامعہ ملیہ کا یہ سلسلہ بہت کار آمد اور مفید ہے بچوں کی صحیح تعلیم کا یہ نہایت عمدہ طریقہ ہے - اس سے اُن میں کام کرنے کا شوق ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ بصیرت بھی پیدا ہو تی ہے - ہندوستان میں میلاد کہاں نہیں ہوتے لیکن اکثر مقامات پر جو طریقے اس مبارک کام کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں اُن سے کوئی معقد بہ فائدہ نہیں ہوتا اور بچے تو اسے بالکل نہیں سمجھتے اس کتاب میں جو منصوبہ تیار کیا گیا ہے اور اس پر جس طریقے سے بچوں نے عمل کیا ہے وہ بجائے خود ایک تعلیم ہے - میلاد کے لئے ابتدا سے لیکر آخر تک جن جن باتوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں آگئی ہیں - بچے ہی سب اس کا انتظام کرتے ہیں اور سب کچھ، انہیں کے ہاتھوں انجام پاتا ہے استاد انہیں صرف رستہ سمجھا دیتا ہے جن صاحبوں کو بچوں کی تعلیم سے تعلق ہے نیز بچوں کے والدین کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے —

---

# تاریخ

---

## مرقع دہلی

( از نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالارجنگ خاندوراں -
مرتبہ حکیم سید مظفر حسین صاحب )

---

" مرقع دہلی " جس کا دوسرا نام حکیم مظفر حسین صاحب نے "دہلی بارھویں صدی میں " رکھا ہے ایک مختصر اور دلچسپ تذکرہ ہے - درگاہ قلی خاں بہادر

بحالار جنگ موتمن الدولہ کے آبا و اجداد شاہجہاں کے عہد میں ایران سے ہندوستان آئے اور مناسب حالوں پر مامور رہے - نواب دلاور قلی بہادر نے ابتدائے عمر سے نواب مغفرت مآب - نظام الملک آصفجاہ کی نگرانی میں پرورش پائی اور ہر مہم ان کی مصاحبت میں رہے اور کارنمایاں کئے - نواب مغفرت مآب کے بعد نواب ناصر جنگ شہید نواب صلابت جنگ اور نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں مختلف عہدوں پر سرفراز رہے - اور آخر میں جب وہ صوبہ اورنگ آباد خجستہ بنیاد کی صوبیداری پر تھے سنہ ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی - یہ تذکرہ انہوں نے اس وقت لکھا جبکہ وہ نواب نظام الملک آصف جاہ کے ہمراہ سنہ ۱۱۵۱ھ میں دہلی گئے تھے —

اس تذکرے میں وہاں کے مزارات اور اُس وقت کے مشائخ شعرا مرثیہ خوانوں اور ارباب طرب کا مختصر سا ذکر ہے - ضمناً بعض حالات - معاشرت بھی آگئے ہیں جو صرف عیش و عشرت سے متعلق ہیں - بیان صاف ہے اور اس سے نواب مرحوم کا ذوق ادب ظاہر ہوتا ہے - وہ شاعر بھی تھے - بہر حال اس کے مطالعہ سے عہد محمد شاہی کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے -

اصل تذکرہ ۸۲ صفحے پر ہے - قابل مرتب نے ۶۶ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے جسمیں مصنف کے خاندان اور خود مصنف کی زندگی کے حالات اور کتاب کا خلاصہ ہے - اور اس کے بعد ۱۶ صفحے پر اسناد وغیرہ کی نقلیں ہیں -

---

## کلیات عزیز

( مجموعہ کلام خواجہ عزیز الدین مرحوم -
مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ - قیمت
مجلد چھ روپے ' غیر مجلد پانچ روپے )

---

ایران کے بعد فارسی ادب و زبان کو فروغ ہوا تو ہندوستان میں ہوا - یہ زبان اب تک ہمارے اخلاق و عادات ' طرز خیال معاشرت اور ہماری زبان اور ادب پر چھائی ہوئی ہے - اس سر زمین میں ایسے ایسے فصیح و بلیغ اور بلند پایہ شاعر پیدا ہوے کہ اہل زبان بھی ان کا لوہا مان گئے - مرزا غالب کے بعد خواجہ عزیز نے ایرانی تخیل اور شستہ ایرانی زبان کو بڑی شان

اور آب و تاب کے ساتھ زندہ رکھا - اس دور کا اب خاتمہ ہو چکا ہے ' زمانے کی روش بدل گئی ہے ' فارسی ہمارے لئے غیر زبان ہو گئی ہے لیکن بزرگوں کے کمال اب بھی دلوں کو گرمانے کے لئے کافی ہیں —

خواجہ صاحب بڑے قادرالکلام اور باکمال شاعر تھے اور ہر صنف سخن پر پوری قدرت رکھتے تھے اور یہ کلیات ان کے کمال کا شاہد ہے - علاوہ غزلوں کے چار مثنویاں ہیں - قیصرنامہ جس میں جنگ روم و روس کی داستان ہے سکندر نامے کی طرز پر اور نظامی کے رنگ میں کہی ہے - دوسری مثنوی گلگشت کشمیر ' تیسری مثنوی یدبیضا ' چوتھی ہدیۃ الثقلین ' متعدد قصیدے اور بہت سے قطعات اور رباعیاں بھی ہیں - تاریخ بے تکلف کہتے تھے اور خوب کہتے تھے - کلام استادانہ اور بلند ہے - زبان نہایت پختہ اور شیریں اور ہر قسم کی صنائع اور خوبیوں سے مملو ہے - غرض کہ خواجہ صاحب کا کلام بڑے بڑے اساتذہ کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے - خواجہ صاحب مرحوم کے فرزند خواجہ وصی الدین صاحب مستحق شکریہ ہیں کہ ان کی وجہ سے یہ کلام محفوظ ہو گیا -

---

## نبیوں کے قصے

( مصنفۂ مولانا خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی - مطبوعۂ مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ - قرول باغ دہلی - صفحات ۸۰ - قیمت ۶ آنے - )

---

اس کتاب میں مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے رسولوں کی زندگی کے حالات سادہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں - ان حالات میں بالخصوص ان محاسن کو اجاگر کر کے پیش کیا گیا ہے جن کے جانے بغیر ہمارے بچوں اور بچیوں کی سیرت کی تشکیل ناقص رہتی ہے - انسانیت کے ان محسنوں کے حالات نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کو بھی جاننا چاہئیں - اس چھوٹی سی کتاب میں ہمت نہ ہارنے ' ثابت قدم رہنے ' صبر سے کام لینے ' صداقت کی رسی کو مضبوط پکڑنے اور زندگی کو ایک امانت سمجھنے کے سبق ہر صفحہ

پر ملیں گے -

زبان سادہ ہے اور بچوں کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی

( ی )

---

# متفرق

---

## مظاہر ذہنیات

( از ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب ' ال ' ام ' پی ' آئی ام ' ڈی دھولپور صفحات ۱۸۴ قیمت دو روپے )

---

اگرچہ دیباچہ میں فاضل مصنف نے یہہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہہ کتاب نفسیات کی تمام مستند کتابوں سے مدد لیکر لکھی گئی ہے ' لیکن اصل میں اس میں نفسیات کا حصہ بہت کم ہے ' بلکہ جا بجا عملی زندگی میں کامیابی کے متعلق ہدایت و مشورہ دیا گیا ہے - اگرچہ اس کتاب میں ترکیب دماغی ' حافظہ اور تخیل سے بحث کی گئی ہے ' لیکن چونکہ کسی قسم کی ترتیب اور باہمی ربط ان مبا حث میں نہیں ہیں ' اس لئے بحیثیت نفسیات کے ایک رسالے کے ' اس کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے ' تحت الشعور کی اصطلاح فاضل مصنف نے جا بجا بیان کی ہیں ' لیکن انہیں تحت الشعور ( سب کانشس ) اور لاشعور ( آن کانشس ) میں التباس ہوا ہے - اسی طرح سے تحت الشعور کی بحث کرتے کرتے وہ شعور کائنات کی حد تک جا پہنچے ہیں اور اس طرح اس رسالہ کے دائرے ما بعد الطبیعات سے ملادئے ہیں -

کتاب میں ابواب نہیں ہیں - اگرچہ مبا حث جلی قلم سے ظاہر کئے گئے ہیں - لیکن خود ان میں کوئی ربط نہیں ' حافظہ ' تخیل ' اور توجہ کی بحث الگ الگ نفسیاتی ہے ' لیکن ان کے ضمن میں بھی عملی فوایدہ مثلاً اشتہار بازی کی کامیابی کا راز ' مطالعہ کرنے کا طریقہ ' اعتقادات کے حیرت انگیز کرشمے

وغیرہ بیان کئے گئے ھیں - مسمریزم اور عمل تنویم کرنے کے طریقے بھی بیان کئے گئے ھیں - جن کے متعلق ھماری صدق دل سے دعا ھے کہ خدا کرے کوئی نا تجربہ کار نوجوان ان کی مشق نہ شروع کرے -- آخر میں کچھ صفحات غذا اور لباس کے متعلق ھیں یہ گویا اس تصنیف کا طبی حصہ ھے - اور مفید ھے ' "کامیابی کے زریں اصول" پر کتاب ختم ھو جاتی ھے -

اگرچہ ھم اس کتاب کو نہ نفسیات کا رسالہ کہہ سکتے ھیں ' اور نہ طب کا ' لیکن چونکہ عملی زندگی کی کامیابی برابر فاضل مصنف کے ذھن میں رھی ھے - اس لئے امید ھے کہ اس کے مطالعہ سے ناظرین کو نفسیاتی معلومات کا شوق پیدا ھو جائے ' اور یہ بہت فنیسٹ ھے ' لکھائی چھپائی اچھی ھے ' قیمت دو روپے جو بہت زیادہ ھے — (و)

---

## اعادۂ شباب و درازیٔ عمر

از

(ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب ایم - بی ' سی - ایچ - بی (لندن) ایم - ڈبلو ' ایل - ایس - آر (برلن) سپیشلسٹ سیکل انسو فوچ بانا عدہ سرکار عالی گولکنڈہ حیدرآباد دکن

---

کھوئی ھوئی جوانی اور درازیٔ عمر کا شوق آج سے نہیں بلکہ قدیم زمانے سے چلا آرھا ھے اور اپنے اپنے وقت میں حکما اور اطبا نے طرح طرح کی کوششیں کی ھیں - آج کل ڈاکٹر ناروفوف اور ڈاکٹر جاوورسکی نے اس باب میں خاص شہرت حاصل کی ھے - ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نے اس خاص علاج کی تحقیق اور سیکھنے کی غرض سے یورپ کا سفر کیا اور پیرس اور برلن وغیرہ میں رہ کر اس فن کے اساتذہ سے اسے سیکھا ھے - اس مختصر رسالے میں انہوں نے اپنے تجربات کو بڑی خوبی اور صفائی سے بیان کیا ھے اور ھر ڈاکٹر کے طریقے کا جس نے اس علاج میں کمال حاصل کیا ھے صاف اور سلیس زبان میں ذکر

کیا ہے اور جو کتابیں ان ڈاکٹروں نے اس مضمون پر لکھی ہیں اُن کے نام بھی درج کر دئے ہیں - ان ڈاکٹروں کے عملوں میں جو فرق ہے اُسے مختصر طور پر لکھ دیا ہے —

ڈاکٹر صاحب نے اس کی تحقیق اور حصول ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود بھی عمل کو شروع کر دیا ہے - ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نہایت ذہین شخص ہیں اور اگر وہ استقلال سے اس کام کو کرتے رہے تو یقین ہے کہ وہ بہت نام پیدا کریں گے -

---

# اردو کے جدید رسالے

---

## ندیم

(مدیر سید ندیم الحسن صاحب رضوی - شریک ' سید بشارت احمد صاحب رضوی - جاگیر دار کالج ' بیگم پیٹ - حیدر آباد دکن

---

یہ ماہانہ رسالہ جاگیر دار کالج حیدر آباد دکن سے سید ندیم الحسن صاحب مدرس کالج مذکور کی سعی کا نتیجہ ہے - اس کے دلچسپ اور خوبصورت بنانے میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا - مضامین بھی نظم و نثر دونو کے خوب جمع کئے ہیں - ایک حصہ صرف طلبہ کے مضامین کا ہے وہ بھی بہت دلچسپ ہے -ہزایکسلنسی مہاراجہ بہادر صدر اعظم ' سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ ' کرنل سر رچرڈ ٹرنچ ' نواب مسعود جنگ ' نواب اکبر یار جنگ ' نواب ذوالقدر جنگ بہادر نواب ولی الدولہ بہادر ' نواب نظامت جنگ بہادر ' خان فضل محمد خاں ' نواب جہاں یار جنگ بہادر ' سر امین جنگ بہادر ' نواب مہدی یار جنگ بہادر اور دیگر صاحبوں کی تصویروں سے اُسے اور زینت ہو گئی ہے - کاغذ اعلیٰ درجے کا ہے اور چھپائی

بھی اس سے بہتر حیدرآباد میں نہیں ہو سکتی - ہم قابل مدیر کو اس عمدہ رسالے پر مبارک باد دیتے ہیں - خدا کرے یہ قائم رہے —

---

## اردو ایسوسی ایشن میگزین الہ آباد

( ایڈیٹر محمد حبیب الرحمن صاحب الہ آباد - )

یہ رسالہ الہ آباد یونیورسٹی کی اردو ایسوسی ایشن کی طرف سے شایع ہوا ہے اور اس کے ایڈیٹر ایسوسی ایشن کے جوائنٹ سکرٹری محمد حبیب الرحمن خاں ہیں - تمام مضامین یونیورسٹی طلبہ کے ہیں اور ہر مضمون اچھا ہے جس سے طلبہ کا علمی شوق ظاہر ہوتا ہے ظاہری شان بھی قابل تعریف ہے - اگر ایسوسی ایشن نے اس معیار کو قائم رکھا تو بلا شبہ وہ اردو کی خدمت انجام دے گی —

# اعلان

---

ہندستانی ایکیڈیمی کی جانب سے دو انعام ہندی میں اور دو انعام اردو میں قیمتی ۵۰۰ روپیہ فی انعام ، حسب ذیل مضامین پر دیے جائیں گے :—

(۱) دماغی اور اخلاقی سائنس ( Mental and Moral Science ) ( ہندی و اردو)

(۲) نظم ( ہندی و اردو )

نوٹ :—

کتاب خود مصنف کی تصنیف کردہ ہو —

نظم کی کتاب میں ایک ہی مصنف کی نظموں کا مجموعہ ہو سکتا ہے یا ایک ہی طویل نظم ہو سکتی ہے —

انعام کے واسطے کتابیں ۳۱ اگست سنہ ۱۹۳۲ ع تک بھیجی جانی چاہئیں —

تاریخ مقررہ سے قبل دفتر ہذا میں انعام کے لئے پیش کردہ ہر کتاب کی سات جلدیں روانہ کی جانی چاہئیں —

(دستخط) تارا چند

جنرل سکرٹری

ہندستانی ایکیڈیمی صوبہ متحدہ الہ آباد

---

# یہ کتابیں بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہیں

## ( تصانیف مرزا سجاد بیگ صاحب )

| | |
|---|---|
| الفہرست | ۱۰ روپے |
| الانسان | ۲ روپے ۸ آنے |
| الاستدلال | ۳ روپے |
| تمنائے دید ( ناول ) | ۱۰ آنے |
| تسہیل البلاغت | ۳ روپے |

## ( مطبوعات ہندستانی اکاڈیمی )

| | |
|---|---|
| عرب و ہند کے تعلقات | ۴ روپے |
| کبھر صاحب | ۲ روپے |
| اردو زبان و ادب | ۱ روپیہ |
| ہندوستان کے معاشرتی حالات | ۱ روپیہ ۴ آنے |
| ناتن | ۲ روپے ۸ آنے |
| فریب عمل | ۲ روپے |

## ( کتابستان الہ آباد )

| | |
|---|---|
| مثنوی ناسخ | ۱۲ آنے |
| بس کا روکھہ | ۱ روپیہ |
| تاریخ اسلامی حصہ اول | ۸ آنے |
| ... ... ... دوم | ۹ آنے |
| ... ... ... سوم | ۱۰ آنے |
| ... ... ... چہارم | ۱ روپیہ |
| مولدین | ۲ روپے ۸ آنے |
| اخبارالاندلس جلد اول | ۱۰ روپے |
| ... ... ... دوم | ۸ روپے |
| ... ... ... سوم | ۷ روپے |
| تاریخ مغرب | ۲ روپے ۸ آنے |
| خلافت موحدین | ۴ روپے |
| عبادت اور اس کی غایت | ۸ آنے |
| اساس عربی | ۲ روپے |
| غریب القرآن | ۲ روپے ۸ آنے |

## ( تصانیف سید سجاد حیدر صاحب بی اے )

| | |
|---|---|
| زہرا ( ناول ) | ۸ آنے |
| خیالستان | ۳ روپے |
| حکایات احتساسات | ۱ روپیہ ۴ آنے |
| جلال الدین خوارزمشاہ | ۱ روپیہ ۱۲ آنے |
| پرانا خواب ( مع ۲ افسانے ) | ۱ روپیہ ۸ آنے |
| مطلوب حسینان | ۸ آنے |
| آسیب اُلفت | ۱۲ آنے |
| پرانا خواب | ۱۰ آنے |

## ( مصنفہ برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب )

| | |
|---|---|
| نہتا رانا عرف رواداری | ۱ روپیہ ۸ آنے |

# اردو

جلد ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۳۲ع حصہ ۴۶

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

# فہرستِ مضامین


| نمبر شمار | مضمون | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | اردو لسانیات | جناب پنڈت بر جمو ہن دتاتریہ صاحب ' کیفی ' دہلوی | ۱۷۷ |
| ۲ | خطبات گارساں دتاسی | مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب ڈی - لٹ (پیرس) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد | ۲۰۴ |
| ۳ | بادۂ کہن ( گلزار شہادت ) | غلام ہمدانی صاحب مصحفی | ۲۳۳ |
| ۴ | اُردو کے ان پڑھ شعراء | مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی | ۲۴۸ |
| ۵ | ترکوں کی اسلامی خدمات | مترجمہ جناب مولوی سید وہاج الدین صاحب بی - اے' بی - ٹی لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد | ۲۵۸ |
| ۶ | ادبیات کی تعریف | مترجمہ جناب منشی ونشی دھر صاحب ودیاالنکار لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد | ۳۰۹ |
| ۷ | آزاد بدایونی کے متعلق غلطی کی اصلاح اور بعض ان پڑھ شاعروں کے حالات | جناب قمرالحسن صاحب " قمر " بدایونی | ۳۱۶ |
| ۸ | تبصرے | ایڈیٹر و دیگر حضرات | ۳۲۹ |

# اردو لسانیات

از جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی
( یہ توسیعی لکچر حضرت کیفی نے کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں ۸ نومبر سنہ ۱۹۳۱ ع کو دیا تھا - سامعین نے اسے بہت پسند کیا تھا - اس میں فاضل لکچرار نے بڑی خوبی اور دلاویزی کے ساتھ اردو زبان کے بعض ایسے مسائل پر بحث کی ہے جو نہایت اہم اور بنیادی ہیں اور جن پر زبان کی ترقی کا بہت کچھ دارمدار ہے - ہمیں امید ہے کہ یہ محققانہ اور پر از معلومات لکچر غور اور شوق سے پڑھا جاے گا —

( ایڈیٹر )

زبان اصل میں انسان کے تعینات یا اداروں میں سے ہے - وہ اون کی معمول ہے جن کی کار براری اوس سے ہوتی ہے - وہی اوس کے محافظ اور مختار ہیں اونھیں نے عوارض اور ضروریات کے مطابق اوس کو اپنے ڈھب کا بنایا ہے - ہمیشہ ہر کہیں ایسا ہی ہوتا ہے - زبان کا ہرجز و ترکیبی مسلسل تغیرات کا ماحصل ہے جو اہالیان زبان کے ارادے اور رغبت سے عمل پزیر ہوا - یہ لوگ تاریخی عوارض ' انسانی فطرت اور داعیے کے تہیّہم سے متاثر تھے جن کے نشانات ہماری نظر میں صاف نمایاں ہیں - اور یہی زبان کو سائنٹیفک تحقیق و تفحص کا شایاں موضوع قرار دیتے ہیں -

انھیں امتیازی اعتبارات سے مطالعۂ زبان کی نوعیت کا مثل تاریخ و اخلاقیات کے تعیّن ہوتا ہے —

زبان انسانی تہذیب اور نوع انسان کی تاریخ کا ایک شعبہ ہے ۔ زبان متعدد علوم سے استعانت کرتی ہے ۔ لیکن باوجود اس کے انسان کا ذہن افکار کے اظہار کی تلاش اور چھان بین میں زبان کی ترقی و حل معضلات اور روابط ونتایج کے درمیان ایک قسم کی حد وسطی ہے ۔ تاریخ کی مانند زبان کی بھی تحلیل علمیہ مثل کیمیا اور طبیعات کے ایک معمل میں ممکن ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معمل میں اوسی شے کا دخل ممکن ہے جو امر واقعہ ہو اور قانون قدرت کے کُلیہ کے تحت جگہ پاسکے ۔ زبان امر واقعہ تو ہے مگر بہ تقاضائے نوعیت ہمیشہ معرض تغیّر میں ہے اور یہی مابہ‌الامتیاز لسانیات کو دوسرے علوم سے حاصل ہے —

لسانیات کے باب میں تحلیل و تجزئے کے وہ اصول عہدہ برآ نہیں ہوسکتے جو طبیعات و مادیات پر حاوی ہیں ۔ زبان سالمات یاسالبات کے قدغن سے مبرّا ہے ۔ ہاں علما کوشش میں ہیں کہ زبان کو سائنس ۔ کہئے علم نفسیات وصوتیات کے تحت لائیں ۔ اس ضمن میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اول الذکر جیسا کہ اس وقت ہے ضرور یہ شان رکھتا ہے کہ لسانیاتی مسائل پر اس کے خاص نظریوں کی روشنی میں فکر کی جائے ۔ یہ امر متقدمین اردو کے ذہن نشین تھا ۔ اہالیان اردو نے زبان کی طرف سے علمی تخیّل کو کبھی طلاق نہیں دی ۔ افعال کے صیغوں کی تنظیم ۔ سائنٹیفک اصول پر صفت و موصوف اور مضاف و مضاف الیہ کی تقدیم وتاخیر کا آئین ۔ حروف جار کی معنوی حیثیت کی تعین ۔ اسلوب اور زبان کی داخلی استعداد کے مطابق مرکبات کی توضیع ۔ تاوید کے موقعوں پر تصرف کا مستحسن استعمال

محاورے کی سلاست اور منطقی تدوین -- ضرب الامثال کی عمومیت اور کلیت اور قوت تالیف -- اور تعقید و اضمار قبل الذکر کی معائب انشا میں شمولیت وغیرہ وغیرہ -- وہ امور ہیں جو عہد قدیم و متوسط میں اہالیان اردو کے حسن شعور اور سلیقہ تنظیم کی ہزار زبان سے داد دیتے ہیں -- ان میں سے بعض امور جستہ جستہ آپ کی توجہ کے لئے پیش کئے جائینگے —

خدا معلوم وہ دن اردو زبان کے حق میں کتنا اہم اور نتیجہ خیز تھا جب حضرت شاہ سعداللہ گلشن نے شمس الدین " ولی " کو یہ ہدایت کی :—

" این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ بہ کار ببر -- از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت " ترجمہ

یہ اتنے سارے فارسی کے مضمون جو بیکار پڑے ہوئے ہیں ان کو اپنے ریختے میں استعمال کر - کون تجھ سے جایزہ لیگا —

استاد کی ہدایت کی تعمیل میں وہ مضمون تو شاگرد رشید نے اٹھا لئے جن کی بدولت اس کے کلام کو شہرت دوام کا تمغا نصیب ہوا مگر زبان اس شاہ جہان آباد کی اردو معلوی ہی رکھی -- شاہ صاحب کا عندیہ یہ تھا کہ ولی دکنیت کو ترک کرکے اردو زبان کو ایران کی نغز گفتاری -- تشبیہ و استعارہ وغیرہ محاسن کلام یا اصناف شعری سے متمول کرے انھیں کیا خبر تھی کہ تین صدی بعد ایسا زمانہ آئیگا کہ اوس مفید مشورے کے الٹے معنی لئے جائینگے -- اور چند حروف جار اور امداد افعال وغیرہ کے سوا اردو کلمے کلام سے خارج کردئے جائینگے —

اردو نے قدیم اور متوسط زمانوں میں کیا لسانی ترقی کی اور اس اعتبار

سے اب اوس کی کیا حالت ہے -- اس کا مجمل تذکرہ آج کیا جائیگا -- تحقیق اس امر کی منظور ہے کہ عہد حاضر میں اردو لسانیاتی اعتبار سے کس درجہ کو پہونچی ہے اور یہ کہ وہ حالت اطمینان کے قابل ہے یا نہیں؟ یہ تحقیق نہ صرف اس یا اوس جماعت بلکہ ہر شخص کا فرض ہے جو اردو کو اپنی زبان کہنے کا دعوی کرتا ہے —

زبان کے ترکیبی فعلوں میں سے یہاں صرف دو کا ذکر کیا جائیگا -- یعنی اختراعی یا ابداعی استعداد اور اخذ کی قابلیت -- یہی دو علامتیں ایک زبان کے مرجیون ہونے کی ہیں - یہ قابلیت اور استعداد جب کسی زبان میں زایل ہو جاتی ہے تو اوس کی ترقی کا راستہ مسدود ہو جاتا ہے -- اور اسباب بھی ہیں جو زبانوں کی ترقی بلکہ زندگی کے مزاحم ہوتے ہیں - جیسے رواج و پسند عام کو قطعاً نظر انداز کردینا اور زبان سے متعلق ہر امر کو سائینٹفک تنقیح قرار دیکر قاعدے کے قیود و تعینات میں جکڑ بند کردینا جیسا کہ سنسکرت کے ساتھہ رئیاکرنیوں نے کیا -- میں مانتا ہوں کہ قاعدے اور آئین کی ضرورت مسلم ہے لیکن اوس کا استعداد اور بارن تولے پاورتی جیسے یقینیات عامہ کا حکم ناطق زبان کی شبا بیات اور اپج کا دشمن ہے - یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ احترام بغیر حسن شعور اور ذوق سلیم کے اور اخذ بغیر تصرف حسنہ کے ممکن نہیں -- اردو کی موجودہ حالت دیکھکر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ بیچاری اوس مقام کے قریب تو نہیں پہنچ رہی ہے جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا -- اگر ہم انانیت اور برخود غلط ہونے سے دور ہٹ کر نظر غایر سے کام لیں تو خوف ہے کہ شبہ یقین کے قریب پہنچ جائیگا —

لسانیات اور ادبیات یا کہئے کہ زبان اور لٹریچر میں جو امتیاز ہے

اوس کی تصریح کی ضرورت نہیں - مختصر یہ کہ یہ اس تمام اردو دنیا کا دل بڑھانے اور امید دلانے والا ہے کہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے دارالترجمہ کا محض تتمہ نہیں یعنی کسی خط توامان کا ورق ثانی نہیں بلکہ زبان کی ترقی واصلاح بھی اس کے مقاصد میں سے ہیں - آج کا موضوع محض اس غرض سے انتخاب کیا گیا کہ جامعہ کے معزز آراکین و اصحاب حل وعقد اور دوسرے ادیب اور نکتہ رس اصحاب جو اس صحبت میں تشریف رکھتے ہیں - اون کی توجہ اس طرف منعطف کی جائے - یعنی اردو کی لسانیاتی حالت کی جانب تاکہ وہ بزرگ اس کی کیفیت و کمیت کا موازنہ کریں - اس لحاظ سے شاید ہندی بھی اوسی ضغطے میں ہے جس میں اردو ہے - لیکن میرا روئے سخن اردو کی طرف ہے —

عرض کیا گیا ہے کہ جب کوئی زبان اختراع واخذ کے بارے میں قوّت فعل سے عاری ہوجاتی ہے تو ارتقا کی شاہراہ سے بھٹک جاتی ہے - اگر ابھی سے روک تھام نہ کی گئی تو خوف ہے کہ اب سے دور یہ موذی مرض کہیں لاعلاج نہ بن جائے —

پہلے اس کا جایزہ لیا جائیگا کہ اردو کی لسانی ترقی سے متعلّق متقدمین اور متوسطین نے کیا کچھہ کیا - اور پھر بتایا جائیگا کہ اون کے متعاقبین اور عہد حاضر کے کارنامے کیا ہیں - لیکن یہ سب امور ایک واحد لکچر میں احاطہ نہیں ہوسکتے - جو کچھہ کہا جائیگا بالاجمال ہوگا —

متقدمین کرام کو جس وقت یہ چیٹک لگی کہ اردو یا ریختہ کو منظم کریں تو اون کے سامنے کوئی مکمل دیسی ہندوستانی نمونہ موجود نہ تھا - اوس وقت کی ہندی یا برج بھاشا - سورسینی یا پراکرت کو آج کل کے لسانیاتی معیار اور اصول کے متبع مکمل نہیں کہاجاسکتا - کیونکہ اگر

کسی میں اعلیٰ نظم موجود تھی تو نثر مفقود - اور کسی میں نثر تھی تو نظم مہتم‌بالشان ندارد تھی - اس لئے تحقیق اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ " ہندیرانی " مسالے سے جو بت تیار ہوا تھا اوس کی پوشاک تو ہندوستانی رہی لیکن اوس کے لئے زیور کچھہ ہندوستان اور زیادہ تر ایران کا استعمال کیا گیا - یہ آپ جانتے ہیں زیور کس قدر پیارا اور سہانا ہوتا ہے —

اردو زبان کی تدوین و تزئین کے بہت سے اصول اور طریقے بتائے گئے ہیں - لیکن جو دُر سیدانشا مرحوم نے دریافت کیا فلسفۂ زبان کا سرتاج ہے اور رہیگا جب تک اردو زندہ ہے - آپ فرماتے ہیں :—

" مخفی نہ ماند کہ ہر لفظے کہ در اردو مشہور شد عربی باشد یافارسی یا ترکی - یا سریانی - یا پنجابی یاپوربی - ازروئے اصل غلط باشد یا صحیح - آن لفظ لفظ اردوست - اگر موافق اصل مستعمل است ہم صحیح و اگر خلاف اصل است ہم صحیح - صحت و غلطی آں موقوف بر استعمال پزیرفتن در اردو است - زیرا کہ ہرچہ خلاف اردوست غلط است گودر اصل صحیح باشد - و ہرچہ موافق اردوست صحیح باشد گودر اصل صحت نہ داشتہ باشد " * —

ترجمہ

یادرکھنا چاہئےکہ ہرلفظجواردو میں مشہور ہو گیااُردوہوگیا - خواہ وہ عربی ہو یا فاسی - ترکی ہو یا سریانی - پنجابی ہو یا پُوربی - ازروئے اصل غلط ہو یا صحیح - وہ لفظ اردو کا لفظ ہے - اگر اصل کے مطابق ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے خلا ف مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے - اوس کی صحت اور غلطی اردو میں اس کے استعمال میں آنے پر منحصر ہے - کیونکہ جو اردو کے خلاف ہے غلط ہے - خواہ وہ اصل زبان میں صحیح ہو - اور جو اردو کے موافق ہے صحیح ہے خواہ وہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو — "

---

* دریائے لطافت - صفحہ ۲۴۱ —

سید سرور نے اس چند فقروں میں تہذیب لسان کے ضابطے کا لب و لباب پیش کر دیا ہے - اسی اصول پر اُردو بنی اور پروان چڑھی - اسلاف کا دستور العمل یہی تھا - یہ تصرف اس اُردو جن کو میں ایک لفظ 'تاریخ' سے تعبیر کروں کا تفریس و تعریب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور رکھیں گے جب تک اُردو زندہ اور چالو زبان ہے - کیوں کہ اول تو وہ عربی یا سنسکرت کی طرح صرفی زبان نہیں اور دوسرے یہ کہ اُس کی بنیاد ہی کاٹ چھانٹ اور تصرف ہے - اس سے بحث نہیں کہ آیا زبان کی ساخت کا یہ گر اردو والوں نے ہندی سے سیکھا جس کا بہت امور میں سنسکرت سے اخذ ات بدیہی ہے - بہ ہرحال کامل تحقیق اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے قریب سورسینی آپ بھرنش سے مغربی ہندی نکلی جس کے میل سے دوآبہ گنجم * میں ایک نئی زبان پیدا ہوئی - اسے مستشرق اور لسان ہندوستانی کہتے ہیں - پھر اس کی دو شاخیں ہوگئیں - جس کی وجہ اول اول زیادہ تر رسم الخط تھی - یہ دو شاخیں آپ کی ہندی اور اردو ہیں - زبان کی تاریخی روداد کے اس مجمل حوالے سے میرا مطلب یہ ظاہر کر دینا ہے کہ جو دعوی ہم اردو کے بارے میں کرتے ہیں بہت ممکن بلکہ اغلب ہے کہ اوس میں ہندی والوں کا بھی حصہ شریک ہے - کیوں کہ یہ امر ثبوت اور استدلال کا محتاج نہیں کہ جب تک ہندوستانی دو شاخوں میں منقسم ہوکر جداگانہ ضبط تحریر میں نہ آئی سب برابر کام کرتے رہے اور اُسے بناتے رہے —

---

* میں نے اُس حصۂ ملک کو جو دریاے گنگا اور جمنا کے بیچ میں واقع ہے دوآبہ گنجم نام دیا ہے —

اس سلسلے میں پہلے اسموں کو لیا جائے گا۔ اردو والوں نے نہ صرف یہ کیا کہ الخالق کو الخالق (پوشاک کی ایک چیز جیسے اچکن) جامُم کو جاحَم اور موسِم کو موسم بنا لیا بلکہ بہت سے عربی الفاظ کی جنسیت بھی بدل دی۔ فارسی خوش نصیب تھی کہ اُس نے یہ بکھیڑا پالا ہی نہیں۔ مثلاً شمس جو عربی میں مونث تھا اردو میں مذکر ٹھیرا۔ آپ کہیں گے یہ مداخلت بیجا کیوں؟ یہ تو سخت لسانی بدعت ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس لغت کے لئے اُن کے پاس صرف دو متبادل طریق عمل تھے۔ یا تو وہ اس لفظ کو لیتے ہی نہیں اور لیتے تو اُس کے مترادف لغت ہندی کی جنسیت کا اتباع لابد تھا۔ جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی سورج۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ غیر زبانوں کے اسموں کی تذکیر و تانیث سے متعلق اُن کا نظریہ یہ تھا کہ اُن کو دیسی اسموں کی جنس کا متبع کرتے تھے۔ مدتوں اہل اُردو اسی دستور پر چلتے رہے اور جو محتاط ہیں اور ذوق سلیم رکھتے ہیں اب بھی اسی پر عامل ہیں۔ اُنھوں نے 'مندر' کو 'مندیل'۔ 'جادہ' (بر وزن 'مادہ') کو جادہ۔ 'توشک' (بجز فوقانی سب حرف ساکن) کو 'توشک' اور بغچہ (غین معجمہ) کو بقچہ کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں جلدی سے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان اور بیسیوں دوسرے الفاظ میں تصرف کی معقولیت اور وجاہت کے حق میں زبردست دلائل پیش ہوسکتے ہیں۔ جس کا یہ موقع نہیں۔ تصرف کا عمل الفاظ فارسی و عربی کی صوتی حیثیت یعنی تلفظ اور جنسیت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اصل معنوں میں بھی تصرف کئے گئے۔ 'تحفہ' سوغات کے معنی رکھتا تھا لیکن وہ اچھے۔ سجل اور تازے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا —

وہ زمانہ بیسویں صدی عیسوی کا زمانہ نہ تھا کہ بات بات میں

ملی- پھر نکالی جاتی- اُن لوگوں کے نزدیک ہندو مسلمان اور اُن کے مذہب یا مذہبی روایتیں اور اصطلاحیں یکساں تھیں- اُنھوں نے اپنی زبان کو بنانے اور سنوارنے کا عزم کیا تھا- شدھی یا تبلیغ کا نہیں- اُن کا قول و فعل تھا "عیسیٰ بدین خود و موسیٰ بدین خود" خیر- قرآن کا جامہ پہننا اور گنگا اُتھانا تو رہا ایک طرف انھوں نے صلواۃ جیسے لغت کے معنی میں بھی جو جناب رسالت مآب کی مقدس ذات سے مخصوص ہو چکا تھا تصرف کیا- اگرچہ اتنا پاس ادب ضرور رہا کہ اُسے محض صیغہ جمع تک محدود رکھا- میر تقی 'میر' مغفور فرماتے ہیں :—

پڑھتا تھا میں تو سبحہ لئے ہاتھہ میں دروہ
صلواتیں مجھہ کو آگے وہ ناحق سنا گیا

اُنھوں نے گنگا کو اُلٹا کر پھر شوخی کی جتاؤں میں پہنچا دیا- منشی اسیر کا شعر ہے :—

ہم تو پیاسے رہے سے غیر کو دی پیر مغاں!
اُلٹی اس شہر میں بہتی ہوئی گنگا دیکھی

اصل میں تھا :- "لا اِلی الذین ولا الی الذّین" یعنی نہ اُن میں سے نہ اُن میں سے- اس سے بنا لیا اِلّذی نہ اُلّذی- بمعنی مذبذب- ڈانواں ڈول- چنانچہ سید رضی نے کہا :—

نہ تو عاشقوں ہی میں جا ملی نہ وہ فاسقوں سے بنی رہی
تری وہ مثل ہے اب اے رضی کہ اللّذی نہ اللّذی

کلمہ مقدس لن ترانی' کی شان ورود تشریح کی محتاج نہیں- اس کے معنی قرار پائے خود ستائی- انانیت- شیخی وغیرہ- شیخ ناسخ نے فرمایا :—

لنترانی سنتے ہیں دیدار سے محروم ہیں
یعنی اس حیرت کدہ میں کور ہیں ہم کر نہیں

ٹھاکروں کی پوجا میں سب سے پہلے گنیش جی کی پوجا کی جاتی ہے - مگر وہ بھی تصرف و اختراع کی زد سے نہ بچ سکے - "گوبر گنیش" کا مرکب آپ کے روز مرہ اور لغات میں موجود ہے —

سامعین کرام - ذرا بگلا بھگت ' اور ' ولی کھنگر ' کی طرف التفات فرمائیےگا - کیا برابر کی جوڑ ہے - شوق قدوائی مرحوم نے فرمایا —

کھویا انھیں شوق کیمیا نے اے شوق
لوٹا انھیں جھوٹے فقرا نے اے شوق
کامل نہیں ایک اور ولی کھنگر لاکھہ
بس دور کے ڈھول ہیں سہانے اے شوق

' رام کہانی ' ہندؤں کے ہاں رامچندر جی کی کتھا کو کہتے تھے - اردو والوں نے اس کے معنی میں تصرف کرکے اس طرح استعمال کیا - جرات مرحوم کا ارشاد ملاحظہ ہو :—

درد دل اوس بت بیدرد سے کہئے تو کہے
جا کے یہ رام کہانی تو سنا اور کہیں

کھت سنسکرت میں چھہ کا نام ہے - کھتراگ کے لغوی و اصطلاحی معنی ہیں چھہ راگ - یہ مرکب اون چھہ مول راگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جن سے اور بہت سی راگنیاں نکالی ہیں مگر اردو میں اس کے معنی کے کے اور سُر کیا ٹھاٹھہ ہی بدل دیا - صبا کا شعر ہے :—

پڑے ہیں عشق کے کھتراگ میں ہم اے مطرب
کسے خیال ہے دھرپد - تراتے ترپت کا

مرکب اسموں کے سلسلے میں ایک اور لفظ کا ذکر کیا جائے گا وہ ہے "کُت بدّیا" - اس کے معنی آپ جانتے ہیں مار پیٹ زدوکوب یہ وہ بدیا ہے جو بے سکھائے پڑھائے آتی ہے —

مبادا آپ سنتے سنتے اکتا جائیں اس لئے اب اس سلسلے کو ختم کرتا ہوں - میں نے کئی سو لفظوں کا ایک نقشہ مرتب کیا ہے جن میں اسم بھی ہیں اور افعال و ضمایر وغیرہم بھی - اس کے چھہ خانے رکھے ہیں (۱) اردو (۲) ہندی (۳) پنجابی (۴) اپ بھرنش (۵) پراکرت اور (۶) سنسکرت۔ اس موقع پر سارا نقشہ پیش کرنا تو طول امل ہے نمونے کے طور پر پانچ چھہ لفظ عرض کئے جائیں گے جو اردو والوں نے اخذ و تصرف کے سلیقے کا بھی ثبوت پیش کرتے ہیں —

| اردو | ہندی | پنجابی | اپ بھرنش | پراکرت | سنسکرت |
|---|---|---|---|---|---|
| چھانو | چھُیاں | چھاں | چھاؤ | چھآ | چھایا |
| بیکا | بانکا | ویلکا | وَنکڑُو | وَکّڑُو | وَکْرک |
| دِھیت | دِھیتّہ | دھیتّہ | دھتّھوُ | دِھتّھوّ | دِھرشت |
| سچ | سانچ | سَچّ | سچّ | سچّم | سَتْیم |
| کوئل | کویلِ | کول | کوئِل | کوئلِا | کوکِلا |
| دیکھا | دِیکھا | دِتّھا | دِتّھئو | دِٹّھ | دِوشٹ |

حفظ مراتب کی نظر اور ادبی روا داری ملاحظہ فرمائیے گا - ایک لفظ کو مفرد حالت میں تو اپنے ڈھب کا بنالیا مگر مرکب حالت میں اوس کی اصلی ہئیت کو ہاتھہ نہ لگایا - مثلاً سانچ کو بدل کر سچ کرلیا لیکن "سانچ کو آنچ - نہیں" اس میں سانچ ہی رہنے دیا ؛ اسی طرح ہست سے بد تدریج "ہتھہ" بنا - جب ہمارے ہتے چڑھا تو ہم نے اس کو ہاتھہ بنا لیا لیکن

مرکبات میں اس کی وہی سورسینی شکل قائم رکھی - جیسے " ہتھہ چھت " " ہتھہ پھیری " " ہتھہ پھول " - " ہتھہ کھنڈا " - پھلّم سے پھول بنا مگر مرکب پھلجھڑی اور پھلکاری میں اصل شکل قائم رکھی - اسی طرح سورسینی " نک " میں الف ایزاد کرکے " ناک " تو بنالیا لیکن " نکتوڑا " نکٹا میں اس کی ہئیت کذائی قائم رکھی —

قدما اور متوسطین کی نکتہ رسی اور معنی آفرینی کی کہاں تک داد دی جائے - ایک معمولی لفظ ' خوت ' کو لیجئے - اس کے کتنے مترادف الفاظ وضع یا اختراع کئے - یا تصرف سے کام میں لائے اور اون کو وہ وہ معنی پہنا ئے کہ نفسیات کا ماہر دنگ رہ جاتا ہے - ملاحظہ ہو : -

بُدا - جھجک - بھچک - سانسا - کھٹکا - دھڑکا - سہم - سناٹا - دھچکا - ڈر -

یہ سب کلمے خوت کے مختلف درجوں کو وا ضح کرتے ہیں اور پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہماری زبان کا دامن کتنا فراخ ہے —

مرکبات کو دیکھئے -- " مرتکا " سے ادل بدل ہوتے ہوتے ماٹی بنا - اس بھاشا کی ماٹی کو انھوں نے مٹی بنا لیا اور پھر اوس سے نہایت اہم مرکب تو صیغی تیار کیا یعنی مٹیالا - میرے خیال میں یہ مرکب سنسکرت کی سندھی کے قاعدے پر بنا ہے - بے محل نہ ہوگا اگر گریمر کی اس اصطلاح سندھی کی نسبت یہاں دو لفظ کہدئے جائیں - جب ایک لفظ ایسے حرف پر ختم ہو کہ اوس کی آواز متعاقب لفظ کے اول حرف کی آواز کے ساتھہ آسانی سے پیدا نہ کی جا سکے تو اون حروف میں سے ایک حرف کو کبھی کسی کبھی کسی حرف سے بدل دیتے ہیں - یا کہئے ایک حرف کو حذف کر کے اوس کی جگہ ایک نیا حرف ایزاد کر دیتے ہیں - سنسکرت کا اصل فقرہ تھا " دَدھی آنے" چونکہ ' اِی ' اور ' آ ' دونوں کی آواز یکے بعد دیگرے ادا نہیں ہو سکتی تھی اس

واسطے اس کا " دھیانے " بن گیا - اسی طرح " روی آتی تھکشنو بھوتی " میں آتی کے الف کو " ر " سے بدلا اور ' روی رتی ' - بنا دیا آپ نے دیکھا اب جس کو ہمارے ہاں تنافر حروف کہتے ہیں رفع ہو گیا - سنسکرت میں یہ قاعدہ یعنی سندھی کا قاعدہ مہتم بالشان حیثیت رکھتا ہے - میری تحقیقات میں اکثر ' انڈو یوروپین ' یعنی آریائی زبانیں اس پر کم و بیش عمل پیرا ہیں فارسی کو لیجئے ' بندہ ' اور ' مژہ کی ' جمع ' الف ' ' نون ' سے بنانی تھی - دیکھا کہ ہائے مختفی کے ساتھ الف کا میل نہیں - چنانچہ ' بندہ ' اس کے بدلے بندگان ' اور ' مژہ ان ' کے بدلے ' مژگاں ' بنایا - یعنی ہائے مختفی کو ' گ ' سے بدل دیا - یہ دقت اور سندھی کے اصول کی پابندی کی ضرورت وہیں آکر پڑتی ہے جہاں دونوں طرف حرف علت ہوں - یا ایک طرف ہائے مختفی اور دوسری طرف حرف علت —

ایک خاص فقرے کے تلفظ پر آرنلڈ بنت کا غصہ سراسر بے محل تھا جب اوس نے ' وسٹ انڈ ' کے ایکٹروں کی زبان سے سنا : —

" سودا زینڈ ملک "

وہ سمجھا کہ " سودا اینڈ ملک " کی سٹی خراب کی ہے جاہل ایکٹروں نے * مگر مغربی لندن کے جاہل ایکٹر نادانستہ پانفی کا اتباع کر رہے تھے - جس نے " روی آتی " کو " روی رتی ' بنا دیا - وضع کرنے والے نے کیوں نہ سوچا کہ دو الف پیہم آواز نہیں دے سکینگے - لوگوں کو اس ترکیب کی غیر فطری ادا کا احساس ہوا اور اب وہ اور تو کچھ نہ کر سکے " ملک اینڈ سودا " اور " وھسکی اینڈ سودا ' بولنے لگے —

---

* تفصیل کے لئے دیکھو ( Modern English in thi Making ) مصنفۂ جارج میکنا ئٹ - صفحہ ۵۹۹

اس ضمن میں ایک مثال انگریزی زبان سے اور پیش کی جائیگی - یہاں اوسی سندھی کے اصول کو قاعدے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے - انگریزی گرامر کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جو لفظ حرف علت سے شروع ہو اوس کے پہلے اے ( A ) بمعنی ایک نہیں لاتے بلکہ ' آین ' An لاتے ہیں ' اے بک ' تو ٹھیک لیکن اے ایکٹ غلط - کیوں کہ دو الف کی آواز ایک سا تھہ نکالنا آلات نطق کے بس کا روگ نہ تھا اس لئے ( N ) یا نون بڑھا کر ( A ) کا آین بنانا پڑا —

عجمی جب عربی زبان کے قاعدے باندھنے بیٹھے تو ان کا ذھن سندھی کے اُس اصول سے متاثر تھا - اسی وجہ سے اُنھوں نے فصاحت سے متعلق تنافر حروف پر بہت زور دیا - لیکن چونکہ عربی ان کی مادری زبان نہ تھی اور سامی حروف کی صحیح آواز پیدا کرنے سے ان کے آلات نطق عاری تھے نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں تنافر حروف نہ تھا وہاں بھی انگلی رکھہ گئے - سب جانتے ہیں کہ ھائے ہوز اور حائے حطی کی آوازیں جدا جدا ہیں لیکن غیر اھل زبان اپنے منہ سے اُس امتیاز کو ظاہر نہیں کرسکتا - اسی طرح بعض شاعروں نے جن کے آلات نطق الف اور عین کی صحیح سامی آواز پیدا کرنے میں قاصر تھے الف کی طرح عین کو بھی گرا دیا ہے —

مرکب افعال ایسے ایسے مرتب اور وضع کئے کہ اس بارے میں شاید کوئی زبان اردو کا مقابلہ کرسکتی ہو - مثال کے لئے ایک معمولی مصدر ' لکھنا ' کو لیجئے - ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے :—

( ۱ ) خط لکھو

( ۲ ) خط لکھدو

( ۳ ) خط لکھڈالو

( ۴ ) خط لکھہ چکو

آپ ان چار جملوں کے معنی جانتے ہیں - ترکیب نے جو زور اور معنوی امتیاز فعل کو بخشا ہے اُس کو بھی محسوس کرتے ہیں - اردو کی لسانیاتی وقعت جو اوسے اسلاف نے عطا کی ایک اور واقعہ سے ثابت ہے علما کے اس مجمع کے سامنے اس توجیہہ کی ضرورت نہیں کہ ہمارا مجموعہ تعزیرات ہند شاید جستنی نین کے ضابطۂ قانون کے سوا سیاسی قوانین میں مکمل بلکہ اکمل تسلیم کیا جاتا ہے - یورپ کے کئی ملکوں میں اس مجموعہ کو آگے رکھہ کر ضابطے مدون کئے گئے - باوجود اس کے یہ مجموعہ بھی اُردو کا مرھون منت ھوئے بغیر نہ رہ سکا - اور لارڈ مکالے جیسا وحید عصر اور بے بدل مدشی اُردو کے سامنے ھاتھہ پھیلانے پر مجبور ھوگیا - یہ اشارہ ہے دفعہ ۵۰۸ کی تشریح الف کی جانب جس میں لفظ ' دھرنا ' قدرے الحاقی تصرف کے ساتھہ استعمال ھوا ہے - ' دھرنا دینا ' کے معنی آپ کو معلوم ہیں جو ہیں —

اونھوں نے ماخذ کی پروا نہ کر کے ماخوذہ سے واسطہ رکھا اور اوسے اپنے مطلب کا بنالیا - چنانچہ عربی یا فارسی لفظوں کی جب اپنے قاعدے کے بموجب جمع بنانے لگے تو حرف ثانی کی حرکت کو حذف کردیا - ' محل ' کی جمع بنی ' محلوں ' - ھائے حطی کی حرکت غائب - اسی طرح ' نظر ' کی جمع بنائی ' نظروں ' نہ کہ ' نظروں ' —

اگر اونھوں نے فارسی اور عربی یا سنسکرت کے لغات کی اندھی تقلید کی ھوتی تو اُردو کو یہ لغاتی تمول ھرگز نصیب نہ ھوتا - اب جو کوئی " ازالتہ الاغلاط " یا " تصحیح اللغات " وغیرہ کا نام لے تو سمجھہ لو کہ وہ اُردو کا اھل نہیں —

' صفات ' میں بھی ایسے مرکب وضع کئے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے

کہ کن الفاظ میں ان کے ذہن رسا اور جدت آفرینی کی توصیف کرے ' سیتلا سنہ داغ ' اور سیتاستی ' کو ملاحظہ فرمائیے - اس مرکّب توصیفی وسیتاستی ' کے معنوں میں لکھا گیا ہے " ہندی - مسلمان عورت " یعنی یہ مرکب مسلمان عورتوں کے استعمال سے خصوصیت رکھتا ہے - اس کے معنی ہیں :- " عفیفہ - بیوی زن - جس کے دامن پر نماز جایز ہو " - یہ معنی وہ ہیں جو مسلمان مولف اس لغت کے سامنے لکھتا ہے —

صفت نسبتی میں انھوں نے نہایت دلچسپ تصرف سے کام لیا - " تاریخ فیروز شاہی " آپ نے دیکھی ہے - یہ بھی جانتے ہیں کہ اوس کا مصنف " ضیاء برنی " ہے - جغرافیہ کے بڑے سے بڑے ماہر سے پوچھئے کہ برن کہاں واقع ہے - وہ سوئیزرلینڈ کے نقشے میں تو ایک برن آپ کو بتا دیگا لیکن ہندوستان کے نقشے میں یہ مقام معدوم رہیگا - آپ جانتے ہین کہ بلند شہر کا قدیم نام " برن " ہے - اونھوں نے قصبہ کا نام تو بدل دیا مگر صفت نسبتي کو ' برنی ' رکھا - بلند شہری نہ بنایا - اس کا دوسرا رخ بھی دلچسپ ہے - آگرہ کا نام اکبرآباد نہ پڑسکا اکبر کے عہد کے قبل سے آج تک سب آگرہ ہی کہتے ہیں - لیکن شاہ نظیر اکبرآبادی کہلاتے ہیں - دہلی شاہجان آباد تو بنگئی لیکن اوس کے شاعر دہلوی ' ہی رہے - بات یہ ہے کہ اون کا تصرّف مصلحت اور حسّ مشترک پر مبنی تھا - ضد اور استبداد پر نہیں اور اون کے نظر یے معقولیت پر مدون تھے —

ذرا غور فرمائیے کہ اون بزرگوں کی ذہنیت کتنی دقیقہ رس اور نکتہ پرور ہوگی - اور اُن کی تصرف لسانی کی قوت عمل کتنی زبردست ہوگی جو بخشنا - خریدنا - آزمانا - بدلنا - فرمانا ' وغیرہ مصدر ترکہ میں

چھوڑ گئے -- مختصر یہ کہ اردو کے متقدمین نے اوس کی تدوین و تنظیم میں جو مسالا اون کے سامنے تھا اوس سے بہترین کام لیا -- جس کی بدولت زبان کو مستقل اور قایم بالذات حیثیت حاصل ہوگئی -- تصرف لسانی کے معنی صرف ' اپنانا ' نہیں بلکہ اپنا سا بنالینا ہیں -- آپ نے دیکھا عربی لفظ " بدل " کو لے کر بدلنا مصدر بنایا -- اب اس کی فعل کے ہر زمانے اور صیغے میں گردان ہوسکتی ہے -- یہیں تک نہیں حاصل مصدر بنا " بدلی " تابع مہمل بھی اس کے ساتھہ ملایا گیا جیسے ادل بدل ' -- مختصر یہ کہ اوس کی وہی حیثیت ہوگئی جو آنا -- جانا -- کھانا پینا کی تھی -- انگریزی میں یہ عمل اب تک جاری ہے اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ وہ زبان برابر ترقی کررہی ہے -- 'لُوٹ' انھوں نے ہمارے ہاں سے لیا اور ایسا اپنا سا بنا لیا کہ فعل کی گرداں میں ' ٹوٹَو ' اور ' ٹولوٹ ' بالکل یکساں ہیں -- چارلس ڈکنس جیسے مستند مصنف نے یہ لفظ استعمال کیا ہے -- اور پھر ہمارے ' لُٹیرا ' کی جگہ 'لُوٹر ' بنایا -- حال ہی میں ایک لفظ انگریزی میں داخل ہوا ہے -- ہوٹال ' سے اونھوں نے ہوٹالسٹ ' بنایا اور جمع کے لئے ' س ' اوس پر ایزاد کیا - جیسا کہ انگریزی گریمر کا قاعدہ * ہے -- میرا مطلب تصرّف سے یہ ہے —

پچاس برس کا مشاہدہ اور تجربہ جو منظر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے - حسرت ناک اور مایوس کرنے والا ہے -- یہ دیکھکر جی ڈوبتا ہے کہ اس نصف صدی کی مدت میں ہم نے اردو کی لغات میں کوئی ایزادی نہیں کی - یعنی اس بارے میں اردو کا ترکیبی فعل گویا معطّل ہوگیا -- چند اصطلاحیں جیسے " برقانا وغیرہ ضرور وضع کی گئیں -- اور ' بھڑوت ' جیسے چند

* دیکھو ٹائمس آف انڈیا ہفتہ وار - بمبئی - مطبوعہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۳۱ ع صفحہ ۱۹ —

دیسی لفظ اردو میں ضرور لے لئے گئے ہیں - لیکن یہ سب علم و فن کی اصطلاحیں ہیں -- اور پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ ان کے وضع یا اختیار کرنے والوں کو کیا کہا گیا —

غیر زبانوں سے جو لفظ بلا ضرورت بجنس اردو میں آئے اون میں سے اکثر نا خواندہ مہمان کی طرح اردو کی سبھا میں اوپرے معلوم ہورہے ہیں -- اس ضمن میں آگے چل کر کچھ عرض کیا جائیگا —

سیاسیات کی مانند لسانیات میں بھی سخت جان ہوا کرتے ہیں -- یہ سخت جان اون سخت جانوں سے مختلف ہیں جن کی سوانح عمریاں غزل کے اشعار میں بکھانی جاتی ہیں - ان کا استقبال اور سخت گیری زبان کی ترقی اور توسیع کے مزاحم اور جانی دشمن ثابت ہوئے ہیں -- ہر زبان اس حضرات سے تنگ ہے - کہاں اللہ بخشے وہ بزرگ جن کا قول تھا کہ برقع چونکہ ہماری زبان میں الف سے نکلتا ہے اس لئے بجائے عین کے الف سے لکھنا چاہئیے اور کہاں یہ حضرت جو تصرف لسانی کے نام سے بھویں تانتے ہیں -- کہا جاتا ہے کہ اردو میں ' خود رفتہ نہیں بلکہ ' از خود رفتہ ' استعمال کرنا لازم ہے -- جواب دیا گیا کہ ' سر گذشت ' کی سر گذشت تو ذرا بیان فرمائیے -- یہ اوسی قسم کی سوشکا فی اور ماخذ پرستی ہے جیسی انگریزی میں لفظ " Reliabli " کے متعلق انگلستان کے ادبی سخت جانوں کی طرف سے ظہور میں آئی تھی - ذرا سنئیگا بڑے لطف کی بحث ہے —

اس لفظ کے معنی ہیں اعتبار کے قابل -- اعتراض ہوا کہ ایک لفظ ٹرسٹ وردی ( Trust Worthy ) پہلے سے موجودہ ہے تو پھر زبان کے نازک اندام پر اور بوجھ کیوں لادا جاتا ہے - اس کا شافی جواب ملا یعنی ثابت کردیا

کہ پرانا لفظ نئے لفظ کے نفس معنی کا حامل نہیں -- تو ارشاد ہوا :- چونکہ یہ نیا مرکب لفظ ' Rely ' سے بنا ہے اور اس فعل کے بعد التزاما حرف جار ' On ' آیا کرتا ہے - اس واسطے اس مرکب کو ریلائنبیل ' Relionable ' کہو - سب جانتے ہیں جو حشر اس غلط استدلال کا ہوا - لفظ ' ریلائیبل ' اس وقت انگریزی کے معمر کلمات سے ہے —

ارشاد ہوتا ہے کہ لفظ رہائش غلط ہے -- اردو مصدر رہنا سے فارسی طریق پر حاصل مصدر بنا لیا معترض کی ناواقفیت پر ہنسی آتی ہے کہ اوس نے اِس لفظ کی تاریخ تحقیق کرنے کی زحمت نہ اُٹھا کر اس کے اختوام کی تہمت ایک صوبے کے سر تھوپ دی جو اس بارے میں قطعاً معصوم ہے -- جاننا چاہئیے کہ سید انشا نے بالکل معمولی طور پر ناچ اکتر وغیرہ کے ساتھہ اس لفظ کو لکھا ہے -- اس بے نظیر ادیب اور اہل نظر نقاد کے قلم سے پورب ' پچھم ' اتر ' دکھن کوئی نہ بچا اور مغل پورہ کی زبان اور لہجے پر تو بے پناہ حملے ہوئے ہیں - اگر یہ لفظ مغل پورہ کی جدت آفرینی یا بد مذاقی کا مولود ہوتا تو سید انشا اس کو ایک سادھارن لفظ کی طرح ہرگز نہ لکھہ جاتے — *

زبان کی قوت اشتقاق و اختراع اور سلیقہ ترکیب کا ذکر آگے آ چکا ہے - یہاں چند مرکبات پیش کئے جاتے ہیں جو اردو کی قوت حیات اور فعل ترکیبی کی صلاحیت کا بین ثبوت ہیں - ملاحظہ ہو :—

مُنہ پھٹ - ہتھہ چھٹ - ہری چُگ - نمک حرامی چمکو - کھاؤ - لُٹاؤ -

---

* رسالہ صبح امید :- لکھنؤ بابت دسمبر سنہ ۱۹۱۹ ع صفحہ ۳۰ و ۳۱ - اور دریائے لطافت صفحہ ۱۳۱ —

بڑ بڑیا - کچ پیندیا - نکھٹو - تلوریا - گُلچلا - کھاؤ کھپ - لنگوٹیا یار - ہنس مکھ - گلچھڑے - کٹھ پتلی - چمچیڑ - تل چاولی - گنگا جمنی - رونی شکل - ساما فچتیاں - ٹھڑ دلا - گرہ کٹ - جیب کترہ - گلے باز - شور بے چت - منہ زور - جوشیلا - دل لگی - کمر کس - آگن بوٹ - قبول صورت - دھلمل یقین - ایماندار - درشنی جوان - بیکل - ٹکڑ گدا، گھنچکڑ وغیرہ وغیرہ —

آپ نے دیکھا کہ تصرف و اختراع کے ہاتھہ سے عربی - فارسی اور نیز سنسکرت کوئی زبان نہ بچی - ان الفاظ میں جو مرکبات ہیں ان میں اسم اور فعل - اسم اور صفت - اسم اور اسم ہر قسم کے کلموں کو آپ شیر و شکر پائیں گے - ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب زبان کا بلوغ درجۂ کمال پر ہو - بقول خواجہ آتش مغفور :—

یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا

میں کہتا ہوں کہ اردو کو آریہ زبان ہونے کے باوجود نہ سنسکرت کا حلقہ بگوش بنانا چاہئے نہ فارسی یا عربی کا دست نگر - علمی اصطلاحوں کا معاملہ دوسرا ہے جس کو مبحث بنانے کا یہ موقع نہیں —

اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ شعر کی زبان نثر کی زبان سے اور بول چال کی زبان علمی تصنیف کی زبان سے ممیز ہوا کرتی ہے - یہ کون کہتا ہے کہ فلسفہ ما بعد الطبیعات یا اسلوب تحلیلی کے نظریے پر باغ و بہار یا فسانۂ آزاد کی زبان میں کتابیں تصنیف ہونی چاہئیں - علمی زبان روز مرہ سے اُسی طرح مابہ الامتیاز رکھتی ہے جس طرح تریس سوت - رائیڈنگ سوٹ سے کوئی صحیح حواس رکھنے والا شخص کھانے کی پوشاک پہن کر سواری کو

نہیں نکلتا - لیکن وہ سواری کی پوشاک پہن کر شام کی پوشاک کی ہوا بھی نہیں کھاتا - یہ تمثیل میں آگے نہیں لے جاؤں گا —

عہد حاضر کے ایک جید لسان یعنی عالم لسانیات کا قول * ہے کہ تحریری (علمی) زبان کی ہستی کو یخ کی اُس پپڑی سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو دریا کی سطح پر بن گئی ہو - یخ نے اپنے اجزاے ترکیبی دریا سے لئے حقیقت میں وہ کچھ نہیں سواے اس کے کہ دریا ہی کا پانی ہے - پھر بھی اُسے دریا نہیں کہہ سکتے - ایک بچہ اِسے دیکھ کر سمجھتا ہے کہ دریا نیست و نابود ہوگیا لیکن یہ صرف دھوکا ہے - یخ کی پپڑی کے تلے پانی برابر بہہ رہا ہے —

یہ تمثیل جو فاضل وینڈریاس نے دی فرانسیسی زبان پر صادق آتی ہوگی - اُردو پر عائد نہیں ہوسکتی - یہاں کی علمی یا تحریری زبان کو اس دریا سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی جس کی سطح جم کر یخ کی پپڑی بن گئی ہو - یخ کے کڑاڑے یا برفانی چٹان کو دریا نہیں کہہ سکتے - حالانکہ تینوں کے وجود کی بنا پانی ہی پانی ہے —

ممکن ہے کسی ذہن میں یہ سوال اُٹھے کہ اگلے زمانے میں علمی یا تحریری زبان کیا تھی یا تھی ہی نہیں؟ میں عرض کروں گا کہ تھی نمونہ حاضر ہے —

تار برقی کا سلسلہ صوبہ شمال مغربی یا زیادہ صحت کے ساتھ کہیے صوبۂ آگرہ میں نیا نیا تھا - آج کل آپ تلغرات کو ترجیح دیں گے اُس زمانے

---

* Language - A Lingiustic Introduction to History - By J. Vendryes, Paris University. p. 275.

میں اُسے ڈاک بجلی کا عام نام دیا گیا تھا - علمی زبان میں 'تار مخبر کہربائی' کہتے تھے - فروری سنہ ۱۸۵۶ ع میں آگرہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں ایک ہزار سے زیادہ رئیس اور شرفا جمع ہوے - قاضی صفدر علی نے 'تار مخبر کہربائی' کا تجربہ دکھاتے ہوے ایک تقریر کی جس کو اُردو میں سائنٹفک موضوع پر شاید اولین تقریر کہنا درست ہوگا - اس کا جستہ جستہ خلاصہ جسے آج کل کی زبان میں 'ملخص' کہنا چاہئے پیش کیا جاتا ہے - غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :—

" صاحبو - علم دو قسم کے ہیں - اول وہ جس کو انسان بدون مشاہدہ اور استعمال اجسام کے حاصل کرسکتا ہے - اس کو ریاضی کہتے ہیں - دوسرے وہ جس کا جاننا بغیر تجربہ کے نہیں ہو سکتا - کیوں کہ فرض کرو ایک شخص پیدا ہوا اور اُس نے کچھ بھی گرم و سرد زمانے کا نہیں دیکھا - ایک اندھیرے کمرے میں رہتا ہے - تو وہ عقل سے ریاضی کے اصول دریافت کرسکتا ہے کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں - مگر چونکہ اُس نے اجسام کے تجربے نہیں کئے اس واسطے وہ نہیں جان سکتا کہ اگر پتھر کو پانی میں ڈالیں تو وہ گھلے گا یا نہیں - وہ علم جو تجربہ پر منحصر ہیں اُن کی قسموں میں سے ایک قسم علم طبیعی ہے .....

" یہ علم بہت سے علموں کے واسطے حاوی ہے - چنانچہ منجملہ علوم طبیعی کے ایک علم کہربائی بھی ہے —

" کہربا ایک سیال لطیف ہے جو جہان کے تمام اجسام میں بہ مقادیر مختلفہ پھیلی ہوئی ہے - اس کے چند اوصاف مخصوصہ ہیں جن سے حوادث عجیبہ اور فوائد غریبہ سرزد ہوتے ہیں ... ... ... ... ...

" یہ علم بذاتہ دو قسموں پر منقسم ہے - اول وہ کہربا جو رگڑنے

سے پیدا ہوتی ہے - دوئم وہ کھربائی جو چھونے سے پیدا ہوتی

آپ نے تین چوتھائی صدی پہلے کی علمی زبان ملا خط فر مائی - یہ تو ہوئی بہتے دریا کی سطح پر برف کی پپڑی - آج کل کی زبان جیسی کچھہ ہے آپ جانتے ہیں - اوس کو کہنا چاہئے انجماد خالص - صاحب زبان خواہ کسی نو ع کے سو ضو ع پر لکھے وہ زبان کو یخ کے کڑاڑے اور برف کی چٹان کے نیچے دفن نہیں کریگا —

ترجموں کی زبان بھی اسی بھول بھلیاں میں چپر غٹو ہے - ایک بات اسی ضمن میں عرض کرونگا - ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا اور اوسی شان کا کیا جس شان کی اصل کتاب تھی اس ترجمہ میں جہاں آپ کو استحصال بالجبر ' اور ' تخویف مجرمانہ ' جیسے اصطلاحی فقرے ملیں گے جو مرحوم کی دقت نظر اور اختراعی کمال کا ثبوت ہیں - تہیتہہ اردو کی مثالیں بھی ملیں گی - جن کی اصطلاحی اہمیت قانون میں کسی لاطینی اصطلاح سے کم وقیع نہیں مثلاً " لے بھاگنا " اور " بھگا لے جانا " وغیرہ - یہ وہی مرکب مصادر یا افعال کی طلسم کاری ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے . وہ اُردو کیا کہ جب تک قاموس اور برہان اسر کوش اور شید کلپدرم داہلے بائیں تشریف فرما نہ ہوں ایک تحریر کا معنی مدعا سمجھہ ہی میں نہ آسکے - یہ تو ہوئی ایک بات اور میں اون مہربانوں کی خاطر سے کہہ دونگا اس کا مضایقہ ہی کیا ہے - لیکن زبان کی بہبودی اون کی یا کسی کی خوشنودی پر فوقیت چاہتی ہے - میں اس موقع پر لسانیات کا نہایت وقیع اور مہتمم بالشان اصول

---

* تفصیل کے لئے دیکھو رسالہ خورشید پنجاب - لاہور بابت مارچ سنہ ۱۸۵۶ ع مرتبہ منشی ہر سکھہ رائے - مالک اخبار و مطبع کوہ نور -

موضوعہ آپ کی توجہ کے لئے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے :- کہ جب کسی زبان کو دوسری زبانوں سے الفاظ یا مرکبات اپنے کا چسکا پڑ جاتا ہے اور وہ اونہیں بلا چوں و چرا یعنی اپنی طور پر تصرف کے بغیر استعمال کی عادی ہو جاتی ہے تو اوس کی تصریفی قوت - اختراعی قابلیت - اور اشتقاقی اہلیت زایل ہو جاتی ہے —

متاخرین اور اون سے بڑھکر ہمارے معاصرین نے یہ نہ سوچا کہ وہ جو اور زبانوں کی لغات اندھا دھند لئے جاتے ہیں اس کا نتیجہ اون کی زبان کے حق میں کیا ہوگا - میں پھر کہتا ہوں کہ پچھلے پچاس برس میں اردو میں ایک لفظ - ایک مرکب - ایک محاورہ وضع یا اختراع نہیں ہوا بزرگوں کی کمائی کہاں تک ساتھہ دیگی - زبان کا تصریفی اور اشتقاقی عمل معطل ہو رہا ہے - یہی حالت رہی تو یاد رہے کہ یہ تعطل سقوط کی صورت پکڑ جائیگا اور اب سے دور ہماری زبان آئے دن بھیک کا کاسہ ہاتھہ میں لئے اور زبانوں کے دروازوں پر الکھہ جگاتی پھرا کریگی - مانگے تانگے کی خوشباشی اور قرض پر دھوم دھام کو تمول نہیں کہتے —

اگلے موقعہ پر آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا تھا کہ متکلم یا منشی کے اور سامع یا مخاطب کے باہم ذہنی قربت ہی روح فصاحت ہے - آج میں یہ گزارش کرونگا کہ یہ ذہنی قربت لسانی تربیت کی محتاج ہے - محض ابتدائی مدارس کو رہنے دیجئے اور مدارس ثانوی کے نصاب تعلیمی پر نظر ڈالئے تو آپ پر ظاہر ہوگا کہ ان مدارس کے لئے جو اردو نصاب مدون ہوتے ہیں سائنٹیفک نقطۂ نظر پر راجع نہیں ہوتے میں فوراً یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہاں میرا روئے سخن دکن کے مدارس ثانوی کے اردو نصاب سے ہرگز نہیں - میرا تجربہ ہندوستان کے دوسرے حصوں

تک محدود ہے -- لیکن یہ چونکہ اُصولی امر ہے اس لئے اس کا تذکرہ ضروری سمجھا گیا -- میں امید کرتا ہوں آپ میرے ہم خیال ہونگے اس بارے میں کہ جو بچّے مدارس ثانوی میں داخل ہوتے ہیں اون کو فصیح وسلیس اردو میں تربیت کرنے کی ضرورت ہے -- اس میں بھی آپ کا اتفاق ہوگا کہ فصیح اور نکھار اردو میں اثر اور ترنم بھرا ہوا ہے -- اصطلاح میں جسے روز مرّہ کہتے ہیں اُس پر زور دینا مفید نہ ہوگا کیونکہ اس کے ساتھہ صوبیت اور مقامیت تشریف لے آتے ہیں -- بچّے کے ذہن میں شروع سے ہی اختلاف اور تناقض کے جراثیم ڈالدینا اوس کی آئندہ ادبی زندگی کے لئے سمّ قاتل کا حکم رکھتا ہے -- اون کو ایسی زبان میں تربیت کرنا چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسیوں اپنے شہر یا قصبے والوں کو اور اون لوگوں کو جو اردو سمجھتے اور جانتے ہیں اپنا مطلب سمجھا سکیں -- ابتدائی تعلیم میں نوخیز طلبا کی ذہنی تربیت کا خیال رکھنا نہایت اہم ہے -- یہ بھی یاد رہے کہ ابتدائی عمر میں ابداع و اختراع کی اُپج اون میں کمال ہوتی ہے -- جنھوں نے بچوں کے کھیل کود اور ورزش کے مقاموں میں چند لمحے توجہ سے گذارے ہیں وہ تسلیم کرینگے کہ بچے آپس کی پھبتیوں -- جوش و خروش کے مکالموں اور فی البدیہہ تک بندیوں میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں اور ایسی ایسی ترکیبیں گھڑ لیتے ہیں کہ آپ حیران رہجاتے ہیں اور نہایت محظوظ ہوتے ہیں - اختراع کی یہ قوت اپنے وقت پر ہنسی کھیل سے منتقل ہوکر علم و فضل اور تحقیق تفحص کے میدان میں مستعمل ہونی چاہئے نہ یہ کہ وہاں کی وہیں رہ جائے اس لئے لازم ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ایسی اردو میں ہوکہ طلبا کے تخیّل اور قوت اختراع کی مزاحم نہ ٹھیرے -- یہ تربیت جبھی ہوسکتی ہے کہ اردو الفاظ کے ٹھہٹھہ معنی اور وضعی مصرف کو اون کے ذہن نشین کردیا

جائے -- اور جملہ کی ترکیب و انشا کا اصول اون کے لوح دل پر نقش ہوجائے -
اسے کہنا چاہئے زبان متداولہ کی تعلیم -- اس لسانی استعداد کے حاصل ہونے کے
بعد ادب یعنی لٹریچر کی تعلیم کی نوبت آتی ہے —

زبان سے متعلق بہت سے امور ایسے ہیں جنھیں متوسطین نے متنازعہ
فیہ یا تصفیہ طلب چھوڑا وہ ابھی تک لٹک رہے ہیں -- ایک تذکیر و تانیث
ہی کو لیجئے -- میرا مطلب اس بارے میں اُس اختلاف سے نہیں جو ایک
مقام یا زمرے کو دوسرے مقام یا زمرے سے ہے -- اس جگہ غیر ذی روح اسموں کی تذکیر
و تانیث کا سوال نہیں اٹھایا جائیگا -- میں یہ کہنے کو ہوں کہ ہماری بے بسی اور
بے بضاعتی کتنی شرم کے قابل ہے کہ ہم ابھی تک یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ
جنسیت کے بارے میں کلمہ ربط کس کا متبع -- مبتدا کا یا خبر کا ؟ " ذوق "
اور " غالب نے " اس تنقیح کو جہاں چھوڑا تھا وہیں موجود ہے -- وہ
دونوں استاد جب اس کے تصفیہ میں قاصر رہے تو ہم میر فیصلی کہاں کے ؟
ہمارا یہ انداز معلوم ہوتا ہے -- ذوق مرحوم کا قول ہے :—

دریائے غم سے میرے گذرنے کے واسطے
تیغ خمیدہ یار کی لو ہے کا پل ہوا

اس شعر میں کلمہ ربط جنسیت میں خبر کا متبع ہے -- مرزا غالب
کا ارشاد ہے :—

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں ہو جائیگا

یہاں کلمہ ربط مبتدا کے تابع رکھا گیا -- اس ایک ادنیٰ مثال سے آپ
قیاس کرسکتے ہیں کہ زبان کی یہ گڑبڑ کتنی منحوس ہے اور یہ آج تک ہماری
اعمال کی طرح ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہے - اس کے نتائج و عواقب کی شدت ثبوت

کی محتاج نہیں - آپ دیکھتے ہیں یہ وہ بات نہیں جو فرض کیجئے دہلی اور لکھنؤ یا پنجاب اور پٹنہ کے درمیان ایک امر تنقیح کا حکم رکھتی ہو - بلکہ یہ وہ امر ہے جو زبان کی یگانگت اور ہم آہنگی کا مدعی ہے - جب تک ایسے نقص ہم میں موجود ہیں اور جب تک یہ نامراد تشخص ذاتی سادھارن اور کار آمد انفرادیت کا رنگ پکڑ کر اپنے تئیں اجتماعیت میں جذب اور محو نہیں کر دیتا ہماری زبان کا بس اللہ والی ہے —

انگلستان تو اب انگریزی زبان کے بارے میں ' امریکنزم ' اور " یانکی ازم " یعنی ' امریکیت ' کو بھول گیا جس طرح پہلے ' سکاٹیزم ' یعنی ' سکاٹیت ' کو بھول گیا تھا - لیکن ہم اب تک وہی بے وقت کی راگنی الاپے جاتے ہیں —

ہم کو یاد رکھنا چاہئیے کہ ہم اردو کے واحد مالک نہیں بلکہ امیں ہیں وہ ایک ودیعت ایک امانت ہے جو حفاظت اور ترقی کے لئے ہمیں سونپی گئی - وہ ایک جدی جائداد ہے جس کی ملکیت ہمیں پر ختم ہونے والی نہیں - ہمارا فرض ہے کہ ہم ماضی سے سبق لیکر اُوس کی موجودہ حالت کا صحیح موازنہ کریں اور اوسے ایسا بنا جائیں کہ ہمارے بعد آنیوالے ہم کو دعائے مغفرت سے یاد کریں - یاد رہے کہ ہم ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک کڑی ہیں - اس سے زیادہ نہیں - اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ذاتی پسند اور چاؤ چونچ کو اجتماعی مفاد پر قربان کردیں - ہمارا مطمح نظر مستقبل اور آئندہ ضروریات ہوں نہ کہ ذاتی تشخص اور خود پسندی —

# خطبات گارساں دتاسی

## بارھواں خطبہ - یکم دسمبر سنہ ۱۸۶۲ ع

---

( مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی - لٹ - ( پیرس ) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد )

حضرات !

گذشتہ ایک سال میں ہندوستان جنت نشان کی زبان میں کافی ترقی ہوئی ہے -- اس باب میں مستشرقین اور خود ہندوستان کے علماء و فضلاء نے بڑی جانفشانی کا ثبوت دیا -- انہوں نے اردو کے مطالعہ کے لئے بعض سہولتیں بہم پہنچانے کے ساتھہ ساتھہ اس کے ادب میں بیش بہا نئے اضافے بھی کئے -- بقول 'بُلدر' " ادب ہی وہ سب سے بڑی آسمانی نعمت ہے جس کا شمار مذہب کے بعد ہونا چاہئیے — "

راجندرلال متر نے ہندوستان سے اردو کے نئے اخبارات و رسائل کے متعلق میرے لئے بعض معلومات بہم پہنچائی ہیں -- میں پہلے اس کی نسبت کچھہ عرض کرونگا -- در اصل مجھے مرحوم 'جیمس' کا مرہون منت ہونا چاہئیے کہ ان کے ذریعہ سے راجندرلال متر کے ساتھہ میرا غائبانہ تعارف ہوا -- میں ذیل کی سطروں میں ان اخبارات و رسائل کے نام گناتا ہوں جن کے متعلق پچھلے خطبات میں میں نے ذکر نہیں کیا —

(۱) جام جہاں نما - یہ ایک اردو کا اخبار ہے جو کلکتہ سے نکلنا شروع ہوا ہے - اس میں سوائے سرکاری یا انفرادی اعلانوں کے اور کچھ نہیں ہوتا - اسی نام کا ایک اخبار میرٹھہ سے نکلا کرتا تھا جس کی نسبت میں اپنے ۲۹ نومبر سنہ ۱۸۵۳ ع کے خطبہ میں ذکر کر چکا ہوں میرٹھہ والے اخبار میں ادبی رنگ غالب تھا - کلکتہ کا جام جہاں نما ٹائپ میں چھپتا ہے اور میرٹھہ کا جام جہاں نما ہاتھہ سے لکھہ کر چھاپا جاتا تھا —

(۲) ایک اخبار بریلی سے نکلنا شروع ہوا ہے جس میں خصوصیت کے ساتھہ صرف رہیلکھنڈ کی خبریں ہوتی ہیں - اس کا نام رہیلکھنڈ اخبار ہے - یہ مہینہ میں دو بار شائع ہوتا ہے اور چھوٹی تقطیع کے ۱۶ صفحوں پر مشتمل ہے —

(۳) بمبئی سے کشف الاخبار سنہ ۱۸۶۱ ع سے نکلنا شروع ہوا ہے - یہ ہفتہ وار ہے اور ہر بدھ کے روز شائع ہوتا ہے - یہ چھوٹی تقطیع کے ۸ صفحوں پر مشتمل ہے - لکھنؤ کے منشی امان علی اس کے مدیر ہیں - ہر نمبر کے شروع میں ایک چھوٹی سی نظم ہوتی ہے جس میں اس نمبر کا پورا پروگرام لکھا ہوتا ہے —

(۴-۵) پنجاب گورنمنٹ کی ابتدائی تعلیم کی رپورٹ میں ایک اخبار کا ذکر کیا گیا ہے جس کا نام "سرکاری اخبار" ہے - میں اس رپورٹ کی نسبت آگے چل کر پھر ذکر کروں گا - اس میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب کے علاقے میں یہ اخبار بہت مقبول ہے - پنجاب کے وسیع صوبے کے دور دراز اضلاع میں اس کے ذریعہ سے سرکاری اعلانات وغیرہ پہنچتے رہتے ہیں - ایک اور ماہوار اخبار ہے جو اٹاوہ سے نکلتا ہے - اس کا نام

منصب رعایا ہے -- مسٹر اے ہیوم کی سربراہی اور دیسی لوگوں کی اداوت میں یہ اخبار نکلتا ہے —

(۹) ان اخبارات کی فہرست کے ساتھہ میں ایک مجموعہ مضامین کا بھی ذکر کئے دیتا ہوں جو حال ہی میں گورنمنٹ کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا ہے -- اس کا نام معلم العملہ ہے - اس کا مقصد یہ ہے کہ سرکاری عملہ کے لئے ضروری معلومات بہم پہنچائی جائیں -- سدا سکھہ اس کے مولف ہیں - اس کا دوسرا نمبر مجھے ملا ہے - اس میں پان کی کاشت ' سر شتۂ تعلیم کے مسائل ' مالیات ' ہندوستان کے جغرافیہ ' رام چندر کی کہانی اور کتبخانے قایم کرنے کے طریقوں پر معلومات درج کی گئی ہیں —

میرے گزشتہ سال کے خطبے کے بعد اس سال کے دوران میں اردو زبان کی متعدد نئی کتابیں شائع ہوئی ہیں - ان سب کے متعلق ذکر کرنے میں طول ہوگا - ان میں جو اہم ہیں ان کا یہاں میں ذکر کرونگا ادبی لحاظ سے ان میں سب سے زیادہ اہم سودا کا انتخاب ہے - ناصر خان نے یہ انتخاب شائع کرکے اردو دل پبلک پر بڑا احسان کیا ہے - سودا جدید اردو کا مشہور شاعر ہوا ہے لیکن باوجود اپنی شہرت کے اس کا کلام کس مپرسی میں پڑ گیا تھا - ایک اور دوسری کتاب کے متعلق میں پچھلے خطبے میں ذکر کر چکا ہوں - ایچ استورٹ ریڈ نے مجھے اس کا ایک نسخہ بھیجا ہے - * اس کتاب کا نام " منتخبات اردو " ہے - یہ انتخاب کریم الدین نے کیا ہے - موصوف وہی ہیں جنھوں نے میری کتاب " تاریخ ادب اردو " کا ترجمہ کیا ہے -

---

* مطبوعہ لکھنؤ - سنہ ۱۸۶۱ ع - پہلی جلد میں ۱۶۲ صفحے ہیں اور ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں ہیں - دوسرا حصہ مجھے اب تک نہیں ملا —

منتخبات اردو کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے لئے لکھی گئی ہے - اس میں الف لیلہ میں سے سند باد جہازی کا دلچسپ قصہ بھی لیا گیا ہے اگرچہ الف لیلہ کے سب نسخوں میں یہ قصہ موجود نہیں ہے * تحفتہ اخوان الصفا کے بعض حصے ہیں - یہ کتاب تمثیلا نہ رنگ میں لکھی گئی ہے - اس کا ترجمہ میں نے فرانسیسی میں کیا ہے جو آج کل " مجلۂ شرقی " ( Revued , Orient ) میں شائع ہو رہا ہے - فردوسی کے شاہ نامے کا اُسی بحر میں اردو ترجمہ کیا گیا ہے اور اس ترجمے کے ۶۰ صفحے ہیں - درد کی غزلوں کے اقتباسات ہیں - درد اردو زبان کے بہترین شاعروں میں سے ہوا ہے گلستان اور اخلاق جلالی کے بھی اقتباسات ہیں ان کے علاوہ Pazruyiah † کی خود نوشت سوانح کے بعض حصے شائع ہوئے ہیں - اس رسالے میں اخلاقی و فلسفہ کی تعلیم سے بحث کی گئی ہے اور اس میں یونانی خطابت کی جھلک پائی جاتی ہے - اس کا خلاصہ یہ ہے : اس قصہ کے ہیرو نے طبابت کو اپنا پیشہ اختیار کرلیا تاکہ اس کی وساطت سے خلق اللہ کی خدمت کر سکے - وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے جس میں بعض اخلاقی باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے - " جو شخص خود اپنی روحانی زندگی کی پروا نہیں کرتا اور اپنی اولاد کی خاطر دولت جمع کرتا ہے اس کی مثال اس عود کی سی ہے جو خود جلکر دوسروں کو جو قریب بیٹھے ہوں خوشبو پہنچاتا ہے یا اس شمع کی سی ہے جو اس لئے جلتی ہے کہ ضیافت کے سب شرکاء تک اس کی روشنی پہنچ سکے - " بیٹے نے باپ کی نصیحت

---

* نسخوں سے میری مراد صرف مطبوعہ نسخے نہیں ہے بلکہ قلمی نسخے بھی -

† یہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا ( مترجمہ )

پر عمل کیا - بلکہ اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا - اس نے اپنے نفس کو فلسفیانہ غور و فکر کا خوگر کرلیا - اسے یہ معلوم ہوگیا کہ واقعی دنیاوی جاہ و دولت بجلی کی چمک کی طرح بہت جلد غائب ہو جانے والی چیز ہے - اس کی مثال ایسی ہے جیسے ابر کا سایہ یا جیسے ایک خواب - چنانچہ ساری عمر اس نے مذہبی فلسفی کی زندگی بسر کی اور ہمیشہ اس کو اس ابدی مسرت پر اعتقاد رہا جو نیکی کا نتیجہ ہوتی ہے —

ان نئی مطبوعات میں فارسی زبان کے ترجمے بھی شامل ہیں - ہندی میں بھی فارسی سے ایک ترجمہ ہوا ہے - بہاری لال نے گلستان کے آٹھویں باب کو ہندی کا جامہ پہنایا ہے - بعض ترجمے فارسی اور اردو میں ہیں اور بعض ہندی اور سنسکرت میں - آخرالذکر کی مثال " بھوج پربندسار" - ہندی میں سنسکرت متن کی شرح دی گئی ہے - اسی طرح " بدھی ودیادیت " کو پیش کیا جا سکتا ہے - شوی لال نے سنسکرت اشلوکوں کی ہندی شرح لکھی ہے - ان کے علاوہ " منو دھرم سار " ہے - یہ بھی ہندی اور سنسکرت دونوں میں ہے - اس میں منو کے قوانین کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے - اسی سال کے دوران میں " خلاصہ تواریخ " کا ایڈیشن شائع ہوا ہے - یہ تاریخ غلام علی کی لکھی ہوئی ہے - اس میں ان اسلامی بادشاہوں کا ذکر ہے جو انگریزی حکومت کی ابتدا اور اس کے نشو و نما کے دوران میں ہندوستان میں ہوئے ہیں - اسی مصنف نے سلطان ٹیپو کے عہد کی تاریخ قلمبند کی ہے - وہ خود ٹیپو کے ہاں ملازمت کرچکا تھا - موسیو پال دے کواردی کے پاس اس تاریخ کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے اور انھوں نے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے - موصوف پانڈی چری میں جج کے عہدے پر ممتاز رہ چکے ہیں - آج کل ان کا قیام شہر پاریس میں ہے صرف و نحو

پر بھی اردو میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کی نسبت معلومات حاصل کرنا مستشرقین یورپ کے لئے از بس ضروری ہے - مثال کے طور پر "اردو مرتند" کو لیجئے - پنڈت بنسی دھر نے اسے ہندی زبان میں تالیف کیا ہے - پنڈت جی اس عہد کے ان مصنفین میں سے ہیں جو ہر قسم کے موضوع پر قلم فرسائی کرسکتے ہیں - انھوں نے 'علم المعیشت' پر ایک کتاب لکھی ہے - ایک جغرافیہ پر لکھی ہے جس کا نام "بھوگول سار" رکھا ہے - ہندی میں جغرافیہ کو بھرت "بھرت کھنڈ" کہتے ہیں - بابو 'شیو پرشاد' نے ہندوستان کا عام جغرافیہ لکھا ہے اور اسے ہندی اور اردو دونوں میں شائع کیا ہے - اس جغرافیہ کا خلاصہ "چھوٹی جام جہاں نما" * رکھا ہے - 'متھرا پرشاد' نے Maun کی کتاب معلومات عامہ ( Lessons in General Knowledge ) کا ہندی ترجمہ شائع کیا ہے —

'تھامسن کالج' رڑکی کے مطبع کی ہندوستان میں وہی حیثیت سمجھنی چاہئے جو انگلستان میں 'ایٹن' کے مطبع کو حاصل ہے - اس مطبع سے ہندوستانیوں کے واسطے نہایت کارآمد مطبوعات شائع ہوتی رہتی ہیں - یہ سچ ہے کہ یہ مطبوعات ادبی نہیں ہیں - یہاں سے متعدد خطوط کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں جیسے 'دستور الارقام' (؟) - اسے منشی 'میاں جان' نے ترتیب دیا ہے منشی 'میاں جان' کے اشعار کا ذکر تذکروں میں موجود ہے - ان کا تخلص 'انھس' ہے - میں نے ابھی جس بیاض کا ذکر کیا وہ دوسری انشا کی بیاضوں کی طرح نہیں جن میں تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار سے عجب انداز تحریر اختیار کیا جاتا ہے اہل مشرق کو یہ انداز تحریر بہت پسند ہے بلکہ اس کے بالکل برخلاف اس بیاض

---

* اصل میں غالباً چھوٹی کی بجائے چھوٹا ہوگا —

میں ایسے خطوط کے نمونے درج کئے گئے ہیں جو کاروباری خطوط اور عرضداشتوں میں مستعمل ہوتے ہیں - یہ مسٹر اسٹورٹ کی فارسی بیاض سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے —

اسی سلسلہ میں ہم اس جغرافیہ کا بھی ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس میں ساگر کے زرخیز ضلع کے نقشے اردو اور دیوناگری دونوں رسوم خط میں درج کئے گئے ہیں - ان نقشوں کی ترتیب بینی رام نے کی ہے - اس کے علاوہ ایک رسالہ گانوں کے خسرے تیار کرنے کے متعلق ہے - اس رسالے کو پنڈت رام پرشاد نے ترتیب دیا ہے اور اس میں کرنل ہوالو کی بڑی حد تک تقلید کی ہے - ایک رسالہ سڑکیں تعمیر کرنے کے متعلق اور ایک رسالہ ڈاک بجلی کے نام سے تار برقی کے متعلق شائع ہوا ہے —

ان میں سے بعض کتابیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ یورپین لوگوں کے لئے مفید ہوگا - مثلاً ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام آئینۂ اہل ہند ہے - اس میں ہندوستان کے باشندوں کی صنعتوں اور ان کی رسوم سے بحث کی گئی ہے - اس کتاب کے مصنف کا نام کرشن راؤ ہے - اس میں مصنف کی تصویر بھی ہے اور بعض مقامات پر عبارت کو واضح کرنے کے لئے بھی نشان کے طور پر تصاویر مندرج ہیں - یہ تصویریں حسن ذوق پر دال ہیں - میں اس وقت آپ کے سامنے اور دوسرے رسالوں کا ذکر نہیں کروں گا جو علم ریاضی، تعمیرات اور میکانک کے متعلق شائع ہوئے ہیں -

چند ہفتے ہوئے مجھے اردو اور ہندی کتابوں کا ایک پارسل ہندوستان سے ملا ہے - یہ کتابیں میرے کرمفرما مسٹر آر - کست نے بھیجی ہیں جو لاہور میں جوڈیشل کمشنر ہیں - میں نے ابھی جس شہر کا نام لیا یعنی لاہور

وہ ایک تاریخی شہر ہے - اور مسٹر ایچ تھارنٹن نے اس شہر کی تاریخ پر ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھا ہے - مسٹر تھارنٹن سول سروس کے آدمی ہیں - ان کتابوں میں ایک بیتال پچیسی ہے - اسے بکرم ولاس بھی کہتے ہیں - یہ لاہور میں طبع ہوئی ہے اور اس میں نہایت خوبصورت تصاویر بنی ہیں - ایک کتاب جو " سبھاولاس " ( لطف معاشرت ) ہے - اس قسم کے نام دراصل ہندی میں بہت عام ہیں - مگر یہ کتاب جو مجھے بھیجی گئی ہے ہندی اشعار کے انتخاب پر مشتمل ہے - ایک کتاب " تشریح ظہوری " ہے - اس میں در اصل ملا ظہوری کی " سہ نثر " کو اردو میں پیش کیا ہے - ایک کتاب نورس کے تینوں حصوں پر مشتمل ہے نورس بیجاپور کے سلطان ابراہیم شاہ کی مشہور نظم ہے - ایک تعزیراتِ ہند کا نسخہ ہے - یہ لاہور کا چھپا ہوا ہے - انگریزی سے یہ ترجمہ نہایت سلیقہ کے ساتھ کیا گیا ہے - اس کا انداز تحریر قریب الفہم اور موضوع کے عین مناسب ہے - مسٹر ایچ ایس ریڈ نے اس ترجمہ میں بڑے اہتمام سے کام لیا ہے - موصوف ہندوستان کی مروج و مقبول زبان اردو کے بڑے پرجوش حامیوں میں ہیں - ایک نسخہ ضابطۂ فوجداری کا اردو ترجمہ ہے - یہ ترجمہ الہ آباد سے سنہ ۱۸۶۲ ع میں شائع کیا گیا - اس میں چھوٹی تقطیع کے ۱۱۴ صفحے ہیں —

ان کتابوں میں جو مجھے بھیجی گئی ہیں بعض فلسفیانہ مباحث سے متعلق ہیں - مثلاً " سدھانتا سنگرہا " جو قدیم نیایا فلسفہ کے اصول پر لکھی گئی ہے ؛ اپدیش پشپوت اردو کی کتاب گلدستہ اخلاق کا ہندی ترجمہ ہے —

ان کتابوں میں ہندی کی ایک کتاب شدد رش درپن کو اہمیت حاصل ہے - اس کتاب میں ہندؤں کے فلسفہ کے چھ ضابطوں کو بیان کیا گیا ہے اس کے مصنف

نہیمیا نیلا کنٹھہ شاستری گور ہیں۔ آپ 'بنارس' کے ایک مشہور پنڈت ہیں اور اب آپ نے مسیحی مذہب قبول کر لیا ہے۔ جیسا کہ ان کے نام کے پہلے جزو سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ ایڈورڈ فٹز ہال جو ہندی علوم کے بڑے ماہر ہیں' اس کتاب کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ موصوف کے نام سے سنسکرت کی متعدد تصنیفات شائع ہوچکی ہیں۔ آج کل آپ 'لندن' کے کنگز 'کالج' میں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ مسٹر 'ڈنکن فوربس' کی علیحدگی کے بعد آپ نے اس خدمت کو منظور فرمایا ہے۔ آپ نے اس کتاب کو انگریزی کا جامہ پہنایا ہے اور بعض بعض مقامات پر رد و بدل بھی کیا ہے اور حواشی درج کئے ہیں۔ یہ ترجمہ ایک جلد میں ہے۔ اسی سال کلکتہ میں طبع ہوا ہے اور اس کا نام A Rational Refutation of the Hindu Philosphical System (یعنے ہندو نظام فلسفہ کی عقلی تردید) ہے—

انگریزی سے ترجموں کی تعداد آے دن بڑھتی جاتی ہے۔ اس جگہہ میں صرف چند کی نسبت ذکر کروں گا۔ 'ٹاڈ' کی کتاب "Hints of Self-improvement" کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے اور اس کا نام "تعلیم النفس" رکھا گیا ہے۔ ہندی میں بھی اس کتاب کا اصل سے ترجمہ ہوا ہے اور اس ہندی ترجمہ کا نام "سکشا منجری" ہے۔ 'شیو پرشاد' نے 'من بھلاؤ' کے نام سے ایک کتاب ہندی میں شائع کی ہے۔ اس میں انگریزی نثر اور نظم دونوں کے ترجمے ہیں—

'روبنسن کروسو' کے دلچسپ قصے کا اردو ترجمہ پہلے ہی ہوچکا ہے۔ یہ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ دنیا کی تقریباً ساری زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ پنڈت 'بدری لال' نے اس کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے اور حال ہی میں بنارس میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب

نہایت ضخیم ہے اور اس میں جا بجا تصاویر بھی ہیں —

"دستور المعاش" کا اس سال دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ دہلی کے مہا پادری ( arch-bishop ) ڈاکٹر 'وھائٹہیلے' جو ہمارے 'انسٹیٹیوٹ' کے ارکان میں سے ہیں ان کی کتاب "معاشی حالات" ( money matters ) میں تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد جے۔ پی 'لیڈلی' نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ پنڈت 'بنسی دھر' نے اسی کتاب کو ہندی کا جامہ پہنایا ہے۔ موصوف ان لوگوں میں ہیں جو کام کے آگے تھکنے کا نام نہیں جانتے—

میرے نزدیک ان سب نئی کتابوں میں "سرا پاے سخن" ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ مسٹر فنز 'ایڈورڈ ہال' کی عنایت سے مجھے اس کا ایک نسخہ مل گیا ہے۔ یہ ایک تذکرہ ہے۔ اور یہ نہایت وسیع زمانے پر حاوی ہے۔ غالباً اودہ کے آخری تاجدار کے تذکرہ کے بعد اس کا نمبر دوسرا ہے۔ اس میں بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھہ پانچ ہزار نثر و نظم لکھنے والوں کے حالات قلمبند کئے گئے تھے مگر سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش کے دوران میں معلوم ہوتا ہے اس کے سب نسخے ضائع ہوگئے تھے اور اب وہ ایک نایاب چیزوں میں سے ہے۔ "سرا پاے سخن" میں جو حالات جمع کئے گئے ہیں وہ سنہ ۱۸۵۴ ع تک آکر ختم ہوجاتے ہیں۔ یہ تذکرہ گزشتہ سال پہلی مرتبہ لکھنؤ میں طبع ہوا اور آٹھہ سو صفحات پر مشتمل ہے اور سات سو سے زائد مصنفوں کے حالات اس میں موجود ہیں۔ جن میں سے اکثر ہم عصر ہیں۔ آپ یہ دیکھیں گے کہ اکثر تذکروں میں ان میں سے بہت سے شعرا کا کوئی حال نہیں ملتا ہے۔ اس تذکرے میں خاص کرکے 'لکھنؤ' اور صوبۂ اودہ کے شعرا کا حال بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ اس واسطے کہ اس کے مصنف کا وطن 'لکھنؤ' ہے اور یہاں کے متعلق اسے کافی واقفیت حاصل ہے۔ اودہ

میں مصنفوں اور بالخصوص شعرا کی بڑی کثرت ہے - اودہ کے اخری تاجدار واجد علی شاہ کے دربار سے چار سو شعرا کو تنخواہیں ملتی تھیں اور واجد علی شاہ خود بھی شاعر تھے —

اس تذکرے کے مصنف کا نام 'محسن' ہے - یہ حقیقت کے بیٹے اور وزیر * کے پوتے ہیں - 'محسن' کے باپ اور دادا دونوں اردو کے مشہور شاعروں میں سے ہوئے ہیں - محسن کے خاندان کے دو بزرگوں ' رشک ' اور ' عشقی' نے ان کی پرورش کی تھی - ' رشک ' بھی شعر کہتے تھے اور ' عشقی ' نے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ لکھا ہے - ' محسن ' نے اپنا تذکرہ دراصل عشقی ہی کے کہنے پر لکھنا شروع کیا تھا - اس تذکرہ کو لکھتے وقت اس کے پیش نظر پندرہ دوسرے تذکرے تھے اور جیسا کہ اس نے اپنے تذکرے کے دیباچہ میں لکھا ہے ' اس نے سیکڑوں دیوانوں اور بیاضوں کی مدد سے اپنے کام کی تکمیل کی - چنانچہ انھیں دیوانوں اور بیاضوں میں سے اس نے تقریباً ۶ ہزار اشعار اپنے تذکرہ میں نقل کئے ہیں - دوسروں کے اشعار کے ساتھہ ساتھہ خود اپنے اشعار بھی نقل کئے ہیں اس واسطے کہ محسن خود اعلیٰ درجہ کے شاعروں میں ہیں - اپنے تذکرہ کے دیباچہ میں ' محسن ' نے انگریزی حکومت کی بہت کچھہ مدح سرای کی ہے جس کے سایۂ عاطفت میں

---

* مصنف کو غلط فہمی ہوی ہے - محسن وزیر کے پوتے نہیں تھے بلکہ ان سے کسی قسم کا رشتہ نہ تھا - البتہ وہ وزیر کے شاگرد تھے اور اس کا ذکر خود انھوں نے اپنے تذکرے میں کیا ہے - ان کے دادا کا نام عرب شاہ تھا - رشک اور عشقی ان کے خاندان کے بزرگ نہ تھے - عشقی ان کے دوست تھے اور رشک سے ان کو تلمذ تھا - ان کو رشک اور وزیر دونوں کی شاگردی کا فخر تھا - مولف خطبات کو ان صاحبوں کے تعلقات کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے - ( ادیٹر اردو )

پھر سے ہندوستان میں علم و فن اپنی پوری بہار پر ہیں اور ساری مخلوق امن و عافیت کے ساتھہ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف کار ہے —

'محسن' کا تذکرہ اور دوسرے تذکروں کی طرح بے مزہ نہیں ہے۔ اور دوسرے تذکروں کی طرح اس کا ہر باب منتخب کلام کا بے ترتیب انبار نہیں جن میں اگر کوئی ترتیب ہوتی ہے تو وہ محض ردیف کی بلکہ اس میں مختلف مضامین کے اعتبار سے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور جس شاعر کے وہ اشعار ہیں اس کی زندگی کے مختصر حالات درج کئے ہیں۔ اس تذکرے میں یہ خوبی ہے کہ مضمون کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ چنانچہ سر، بال، چہرہ، پیشانی، آنکھیں، ناک، رخسار، منہ، ہونٹ، دانت، زبان، ٹھڈی، کان، گردن، شانے، ہاتھہ، انگلیاں، ناخن، پاؤں، دل، اور روح وغیرہ پر الگ الگ اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ اگر کسی باب میں سر کا ذکر ہے تو اس باب کا خاتمہ لفظ "سر" پر ہوگا اور اگر کسی باب میں بالوں کا ذکر ہے تو اس کا خاتمہ لفظ "مو" پر ہوگا۔ اسی طرح ہر باب میں التزام کیا ہے۔ یہ سب اشعار غزلوں کے ہیں۔ غزل میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں ملے جلے ہوتے ہیں۔ مشرقی شعراء کے ہاں عورت کی شخصیت خدا کا پرتو ہوتی ہے اور کبھی کبھی وہ ان دونوں کو اپنے بے تکے تخیل سے ایک دوسرے میں ضم کردیتے ہیں۔ ٹینیسن نے جو آج کل انگلستان کا سب سے بڑا شاعر ہے کس خوبی سے اس مضمون کو باندھا ہے۔ وہ کہتا ہے:

تجھے مشکل ہی سے خاکی کہا جا سکتا ہے اور نہ تو پورے طور پر ملکوتی ہی ہے۔ تیرے حسن کو الفاظ کے توسط سے نہیں ظاہر کیا جا سکتا،

تیرے عنبریں لہلہاتے ہوئے بال *

اس کنول کے پھول کے مثل ہیں جن میں سے ہو کر سورج غروب ہوتے وقت جھانکتا ہے —

ان سیکڑوں مصنفوں میں جن کا اس تذکرہ میں ذکر ہے سب کے سب شاعر ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ غالباً ان میں بہت تھوڑے ایسے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں شاعر کہا جا سکتا ہے - ان میں بیشتر تک بندیاں کرتے ہیں - ان کی شاعری ہمارے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں - قدیم یونانی شاعر کالی 'ساک' کا قول ہے کہ "خدائے شعر کا دیدار ہر کس و ناکس کو میسر نہیں آ سکتا" —

سراپائے سخن سے مجھے بعض ایسی تصانیف کا علم ہوا ہے جن کے متعلق شاید مجھے کہیں اور معلومات نہ ملتیں - مثلاً بعض ایسے دیوان اور تذکرے ہیں جن کا ذکر اس میں موجود ہے اور مجھے پہلی مرتبہ اس کتاب کے ذریعہ سے ان کا علم ہوا - جب میں نے اپنی کتاب "تاریخ ادب ہندی و اردو" سنہ ۱۸۲۹ ع میں شائع کی تھی تو اس وقت ان دیوانوں اور تذکروں سے میں قطعاً لاعلم تھا - اس وقت صرف سات تذکروں کی مدد سے میں نے اپنی کتاب کی تکمیل کی - آج میرے علم میں ۵۴ تذکرے ہیں اور یقیناً ان کے علاوہ بھی اور ہوں گے جن تک میری دسترس نہیں ہوئی - چنانچہ آج میرے پاس بہت کافی مواد موجود ہے جسے میں اپنی کتاب کی تکمیل کے لئے استعمال کرسکتا ہوں —

---

* میں نے لفظ ( flaxen کے بجائے Amber ) کردیا ہے اس واسطے کہ اہل مشرق عورت کے بالوں کو عنبر سے تشبیہ دیتے ہیں - اس میں رنگ اور خوشبو دونوں کی مناسبت کا خیال پیش نظر ہوتا ہے —

سراپائے سخن کے علاوہ جس میں ادب اردو کی تاریخ کے لئے بہت سواد موجود ہے میرے پرانے شاگرد مسٹر جے - ان - کارٹر نے ایک اور کتاب بھیجی ہے جو مرہٹی زبان میں ہے -- مگر اس میں ہندی کے چوٹی کے شاعروں کا حال مفصل موجود ہے -- یہ کتاب سنسکرت اور دوسرے ماخذوں کی خوشہ چینی کے بعد لکھی گئی ہے * -- میں افسوس کے ساتھہ آج آپ صاحبوں کو یہ خبر سناتا ہوں کہ مسٹر جے - ان - کارٹر کا حال ہی میں انتقال ہوگیا -- موصوف بمبئی تک کی ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری تھے - موصوف نے ازراہ عنایت جو مرہٹی کی کتاب بھیجی ہے اس میں ۴۵ شعرا کا حال موجود ہے -- ان میں سے ۳۰ شاعر ایسے ہیں جن کی نسبت میرے پاس پہلے کوئی معلومات موجود نہیں تھیں —

یورپین جماعتوں کی طرف سے اردو زبان کی مطبوعات میں " Calcutta Religious Tract Society " کی متعدد شائع کردہ کتابیں قابل ذکر ہیں -- ان میں بعض کی نسبت میں یہاں ذکر کرتا ہوں - (۱) مسیحیت اور اسلام کا موازنہ (۲) بعض اشخاص کے مسیحیت قبول کرنے کا بیان (۳) پھلمنی اور کرن کا قصہ ' و غیرہ —

پادری اون صاحب ( Rev, Owen ) نے شورش عظیم سے پہلے انجیل مقدس کی تفسیر اردو زبان میں مکمل کرلی تھی - شورش کے دوران میں ان کی اور دوسری کتابوں کے ساتھہ یہ بھی ضائع ہوگئی - چنانچہ موصوف نے اسے پھر از سر نو لکھنا شروع کیا - اب عنقریب وہ شائع ہونے والی ہے-ہمیں یہ سنکر تعجب ہوا کہ ایک مسلمان عالم سید ' احمد ' غازی پوری انجیل مقدس کی تفسیر اسلامی نقطۂ نظر سے لکھہ رہے ہیں - انہوں نے اپنے ذاتی مطبع میں اسکی چھپائی کا انتظام بھی کرلیا ہے -- یہ کتاب

* ' کوئی چرتر ' مصنفۂ جناردن رام چندر جی - مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۸۶۰ ع

قسط وار چھپے گی - اور رسالے کی صورت میں صفحہ کے ایک طرف انگریزی ہوگی اور دوسری طرف اردو ترجمہ اور تفسیر -- ہر رسالہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہوگا - ہندوستانیوں کی اس قسم کی کوششیں ہمیں یورپی تاریخ کے اس زمانہ کی یاد دلاتی ہیں جبکہ مسیحیت کے سیلاب کے سامنے یونانی اور رومی مذہبی رسوم پاش پاش ہورہی تھیں اور مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتی تھیں —

مسٹر ڈنکن فوربس نے اپنی اردو لغت کا دوسرا ایڈیشن شائع کردیا ہے ایڈیشن میں اردو کے الفاظ کو دیوناگری خط میں بھی لکھ دیا ہے - انھوں نے یہ کام کمال احتیاط اور دیدہ ریزی کے ساتھ کیا ہے جب ہندی الفاظ فارسی رسم خط میں لکھے جاتے ہیں تو ان کی ہیئت ایسی بدل جاتی ہے کہ انھیں بعض اوقات پہچاننا دشوار ہوجاتا ہے - نیز موصوف نے " باغ و بہار " کا چوتھا ایڈیشن فارسی رسم خط میں نکالا ہے - نسولیس کے مشورے کے مطابق اس کتاب کے بعض ایسے فقروں کو خارج کردیا ہے جو ذوق سلیم کی نظر میں کھٹکتے تھے * —

" باغ و بہار " کے وہ ایڈیشن جو لاطینی رسم خط میں شائع ہوئے ہیں ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں - سنہ ۱۸۳۶ ع میں ایک پرتگالی پی- ایس- ڈی روزاریو نے اس کا ایک

---

* بہت اچھا ہو اگر موصوف اپنے معاون کار ' چارلس ریو ' کی مدد سے " اخوان الصفا کا بھی اسی طرح ایک ایڈیشن شائع کریں اور اس میں سے بعض حصوں کو خارج کردیں -- میری رائے میں صفحہ ۱۸ پر جہاں غیر فطری عشق و محبت کا ذکر ہے اسے ضرور خارج کردینا چاہئے -- بدقسمتی سے یہ خیال اہل مشرق کے ہاں بہت عام ہے —

ایڈیشن ہندوستان کے دارالسلطنت کلکتہ میں طبع کرایا تھا ۔۔ موصوف نے ایک لغت بھی لکھی ہے جس میں انگریزی الفاظ کے معنی اردو اور بنگالی میں درج کئے ہیں ۔ افسوس ہے کہ موصوف کا حال ہی میں کلکتہ میں انتقال ہوگیا ۔۔ مونیر ولیمس نے سر چارلس ٹریولین کی فرمائش پر " باغ و بہار " کے اسی ایڈیشن کو تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھہ دوبارہ طبع کرایا ہے ۔۔ مجھے بھی ہندوستانیوں کی طرح بڑی مسرت ہے کہ سر چارلس ٹریولین پھر دوبارہ ہندوستان تشریف لے گئے ہیں ۔۔ ڈنکن فوربس نے بھی لاطینی رسم خط میں اردو کے پہلو بہ پہلو اس کا ایک ایڈیشن نکالا ہے ۔ اس سے پہلے ایڈیشن کی طرح اس میں بھی متن کے مشکل الفاظ کی تشریح کی ہے ۔۔

" باغ و بہار " کی نسبت میں اپنے سنہ ۱۸۵۳ ع کے خطبے میں ذکر کر چکا ہوں ۔۔ اس جگہ پھر ایک امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی قصوں میں آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ تبلیغ اسلام کی جانب کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور اشارہ کیا جاتا ہے ۔ اور غنائی شاعری ' تصوف ' عشق مجازی اور ہمہ اوست کے مسائل سے آگے نہیں بڑھتی ۔۔ قصوں میں اسلامی عقاید اثباتی نوعیت کیساتھہ پیش کئے جاتے ہیں اور اسلام کی جانب غیر مسلموں کو نہایت موثر انداز میں رجوع کیا جاتا ہے ۔۔ مثلاً باغ و بہار میں جہاں بخارا کے تاجر کا ذکر ہے ' کہ اسے کیوں کر دختر وزیر کی وساطت سے مصائب سے نجات ملتی ہے ' تو وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تاجر دوگانہ شکرانے کا رو بقبلہ ہو کر پڑھنے لگا ۔ وزیر کی لڑکی یہ

حرکات و سکنات دیکھکر متعجب ہوتی ہے اور اس تاجر سے دریافت کرتی ہے کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے ؟ تاجر جواب دیتا ہے : " جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھ پر مہربان کیا اور ویسے زندان سے خلاص کروایا ' اس کی ذات لا شریک ہے ' اس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجا لایا اور ادائے شکر کیا -- یہ بات سنکر کہنے لگی ' تم مسلمان ہو ؟ - میں نے کہا شکر الحمد للہ - بولی میرا دل تمہاری باتوں سے خوش ہوا میرے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ -- میں نے دل میں کہا الحمد للہ کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی - غرض میں نے لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھا ' اور اس سے پڑھوایا — "

ایک اور جگہ بصرے کے تاجر کا اسی طرح ذکر ہے جسے اس کے بھائیوں نے قتل کرنے کی نیت کی تھی - وہ جب بیہوشی سے ہشیار ہوا تو سرانديپ کی شہزادی اور اس کی خواصیں اس کے چاروں طرف جمع تھیں -- شہزادی مہربانی سے بولی : " اے عجمی ! خاطر جمع رکھ ' کڑھ مت ' اگرچہ کسو ظالم نے تیرا یہ احوال کیا لیکن بڑے بت نے مجھ کو تجھ پر مہربان کیا ہے - " اس پر تاجر نے پکے مسلمان کی حیثیت سے کہا :- " قسم اسی خدا کی جو واحد اور لا شریک ہے " - کچھ دنوں بعد ایسا اتفاق ہوا کہ شہزادی نے تاجر کو نماز پڑھتے دیکھا اور اس سے پوچھنے لگی :— "

اے جاہل ! ہمارے بڑے بت میں کیا برائی دیکھی جو غائب خدا کی پرستش کرنے لگا ؟ میں نے کہا انصاف شرط ہے ' تک غور فرمائے کہ بندگی کے لائق وہ خدا ہے کہ جس نے ایک قطرے پانی سے تم سار کا

محبوب پیدا کیا ' اور یہ حسن و جمال دیا کہ ایک آن میں ہزاروں انسان کے دل کو دیوانہ کر ڈالو بت کیا چیز ہے کہ کوئی اس کی پوجا کرے ؟ ایک پتھر کو سنگ تراشوں نے گھڑ کر صورت بنائی اور دام احمقوں کے واسطے بچھایا - جن کو شیطان نے ورغلایا ہے وے مصنوع کو صانع جانتے ہیں - جسے اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں اُس کے آگے سر جھکاتے ہیں - اور ہم مسلمان ہیں ' جس نے ہمیں بنایا ہے ہم اسے مانتے ہیں ' اُن کے واسطے دوزخ ' ہمارے لئے بہشت بنایا ہے -- اگر بادشاہزادہ ی ایمان خدا پر لاوے ' تب اس کا مزا پاوے ' اور حق و باطل میں فرق کرے اور اپنے اعتقاد کو غلط سمجھے "۔

اس ضمن میں میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی کتب عقاید و تفاسیر کے متعلق مسیحی دینیات کے علماء کو پوری واقفیت رکھنی ضرور ہے -- ہمیں چاہئے کہ ان بیانات کو جو انجیل اور مسیحیت کے متعلق اسلامی عقاید میں ملتے ہیں بیکار سمجھ کر ٹھکرا نہ دیں - در اصل ان میں ہمیں بہت ساری یہودی اور نصرانی روایات ملیں گی - میں اس باب میں مسٹر اوتول کا ہم خیال ہوں جنھوں نے حال ہی میں قران کا انگریزی ترجمہ کیا ہے ' کہ قران اور محمد ( صلی اللہ علیہ وسلم ) کی بدولت جو تغیرات پیدا ہوئے انھیں فی الحقیقت دنیا کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے -- لوگوں کو اس بات کا علم نہیں کہ قران کا بیشتر حصہ ان روایات پر مشتمل ہے جو محمد ( صلی اللہ علیہ وسلم ) کے زمانے اور ان کے ملک میں مشہور تھیں -- توریت کی تلمودی اور یہودی روایات اور وہ قصے جو عرب و شام کے یہودیوں اور عیسائیوں میں مشہور تھے قران میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ موجود ہے - اس کے علاوہ جعلی ( Evangiles ) کے بیانات محمد ( صلی اللہ علیہ وسلم ) نے قران میں شامل کرلئے - بظاہر یہ معلوم ہوتا

ہے کہ انکو ان جملی ( Evangiles ) کا علم تھا - انھیں در اصل مسیحی مذہب کی دیو مالا سے زیادہ وقعت نہ دینی چاہئے تھی مگر محمد ( صلی اللہ علیہوسلم ) کے تخیل کو یہ مبالغہ امیز قصے ایسے پسند آئے کہ انھوں نے انھیں سچ جان کر قابل قبول سمجھا -- میرا خیال ہے کہ باوجود ان تمام باتوں کے ہمیں قران کو قطعی طور پر جھوٹ نہیں سمجھنا چاہئے -- تاریکیوں میں بھی کہیں نہ کہیں روشنی کی جھلک موجود ہوتی ہے -- سیل اور اوڈوں کی طرح میں بھی سینٹ آگسٹین کے اس مقولہ کا قائل ہوں کہ دنیا میں کوئی ایسا جھوٹا عقیدہ نہیں جس کی تہ میں تھوڑا بہت سچ نہ موجود ہو" — *

قران بھی ہمارے ( Saints ) (حواریوں) کی کتابوں کے مثل آیات پر مشتمل ہے - پھر آیات کی بھی دو قسمیں ہیں ؛ محکمات اور متشابہات - مجھے یہ تقسیم بہت پسند آئی - کیا اچھا ہو اگر توریت و انجیل کے لئے بھی اس تقسیم کو اختیار کر لیا جائے - خاصکر انجیل کے متعلق اگر ہم اس تقسیم کو قبول کرلیں تو بہت آسانی ہو جائے - انجیل میں بعض جملے ایسے ہیں ( خوش قسمتی سے ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے ) جنہیں انسانی عقل و فہم سمجھنے سے قاصر ہے اور ان کی کوئی معقول تاویل بھی ممکن نہیں - وہ کٹر عیسائی جو انجیل کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں ان جملوں کو پڑھکر بڑے ست پٹاتے ہیں - ہمارے نزدیک یہ بہت اچھا ہو اگر ہم کھلم کھلا کہہ دیں کہ ہم ان جملوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے کہ وہ بے معنی ہیں - یا تو یہ ہے کہ ہمارا علم اس قدر محدود ہے کہ ہم ان مخصوص مطالب

* Quæstiones Evangelicæ

کو نہیں سمجھ سکتے یا یہ کہ بعد کے تصرفات یا ابتدائی انجیل نویسوں کی غلط نقل کی وجہ سے بعض مبہم جملے انجیل کے متن میں شامل ہوگئے بعد میں آنے والوں نے انجیل کے احترام و تعظیم کی خاطر کوئی تبدیلی کرنا گوارا نہ کی - میں سمجھتا ہوں یہ بہتر ہوگا اگر ہم صرف آیات بینات کو شمع ہدایت بنائیں - یہ بھی ضرور نہیں کہ مہمل جملوں کو خواہ مخواہ معنی پہنائے جائیں - ممکن ہے کہ خدا کو یہی منظور ہو کہ وہ اسی طرح رہیں - بہر حال ہمیں اس باب میں سینٹ پال کے مقولہ کو یاد رکھنا چاہئے کہ " لفظ باعث ہلاکت ہوتا ہے مگر لفظ کی روح (یعنی اس کا اصلی مدعا) زندگی عطا کرتی ہے " —

بہر حال مسیحی مبلغین کے لئے یہ از بس ضروری ہے کہ وہ قران کا مطالعہ کریں اگر واقعی وہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں - ورنہ مسلمانوں کو مسیحی تعلیمات کی جانب متوجہ کرنا بہت دشوار ہے - قران میں انجیل و توریت کے الہامی کتابیں ہونے کے متعلق بہت ساری آیتیں ملتی ہیں - خود محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) نے ان دونوں کتابوں کی صداقت کو تسلیم کیا ہے - ولیم میور نے جن کی کتاب " حیات محمد " (صلی اللہ علیہ و سلم) آج کل بڑی مقبول ہو رہی ہے' قران کی ان سب آیتوں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے جن میں انجیل و توریت کے آسمانی کتابیں ہونے کے متعلق تصدیق ہوتی ہے - * وہ لوگ جو اس مضمون سے بے خبر ہیں انہیں یہ دیکھکر بہت تعجب ہوگا کہ قران نے بارہا توریت

---

* The testimony borne by the Coran on the Jewish and Christian Scriptures. Agra, 1856.

و انجیل کی صداقت تسلیم کی ہے —

اب ہم پھر ہندوستان کی جانب رجوع کرتے ہیں —

مجھے کپتان فلر کی مرتب کردہ رپورٹ کا ایک نسخہ حال ہی میں ملا ہے - اس میں پنجاب کے سرشتہ تعلیم کے متعلق پوری معلومات جمع کردی گئی ہیں - اس رپورٹ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۶۰ - ۶۱ ع میں ۳۷ ہزار ' ۲ سو ۸۰ طالب علم اردو زبان میں تحصیل علم کرنے میں مشغول ہیں - اردو کی صرف و نحو کی تعلیم با قاعدہ دی جاتی ہے - اور فارسی سے زیادہ زور اردو کی صرف و نحو پر دیا جاتا ہے - فارسی زبان کا میں نے مقابلتاً اس لئے ذکر کیا کہ ہندوستانی لوگ اور خصوصاً ہندوستانی مسلمان فارسی زبان کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور اسے اپنی کلاسک زبان خیال کرتے ہیں اسی طرح تحصیلی مدارس میں ہندو اور مسلمان طلبا کی کل تعداد چھ ہزار تین سو ہے - اس میں سے ۴ ہزار تین سو طالب علم اردو زبان پڑھتے ہیں اور صرف ۲ ہزار نو سو چونتیس طلبا فارسی پڑھتے ہیں - دیہاتی مدارس کا بھی یہی حال ہے - کل طلبا کی تعداد ۳۲۱۶۵ ہے اس میں سے ۳۱۱۶۰ اردو پڑھنے والے ہیں اور ۱۴۲۳۷ فارسی پڑھنے والے - نارمل اسکولوں میں جہاں استادوں کی تعلیم ہوتی ہے ' طالب علموں کی کل تعداد ۴۵۱ ہے - اس میں سے ۴۱۶ اردو پڑھتے ہیں اور صرف ۵۲ ہندی پڑھتے ہیں - اور فارسی پڑھنے والوں کی تعداد ۳۶۳ ہے - اضلاع کے مدارس میں طلبا کی تعداد ۲۳۱۹ ہے - اس میں سے ۱۸۴۶ اردو پڑھنے والے اور ۴۷۲ فارسی پڑھنے والے ہیں —

ہندوستانی مدارس میں انجیل پڑھانے میں اب کوئی دشواری نہیں ہوتی - چنانچہ بنگال کے ایک ہندو اخبار میں اس مسئلہ کی نسبت ان

الفاظ میں اظہار خیال کیا گیا ہے :—

"جس طرح نیشکر کی ہر پور میں جڑ سے چوٹی تک رس بھرا ہوتا ہے اسی طرح انجیل کے ہر صفحے میں تعلیم کے جواہر ریزے پنہاں ہیں —

صوبہ شمال مغربی کی حکومت قابل مبارک باد ہے کہ اس نے دیسی لوگوں کی تعلیم کی طرف خاص شغف ظاہر کیا - اس صوبے کے مدارس میں محض انگریزی زبان اور یورپی علوم ہی کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے بلکہ خود دیسی لوگوں کی زبان اور ان کے علوم کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے - چنانچہ حکومت کی سرپرستی میں سنسکرت کی کتابوں کے ہندی میں ترجمے کرائے گئے ہیں ان ترجمہ کرنے والوں کی یہ کوشش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سنسکرت کے اصلی الفاظ اور محاوروں کو ہندی ترجمے میں کھپا یا جائے - اس سے یہ ہوتا ہے کہ ترجمہ کی مدد سے سنسکرت کی عبارت بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے - اس قسم کے ایک ترجمے کی کتاب میرے پاس ہے - جیمس آر بلنٹائن کے مشورہ اور ہدایت کے مطابق یہ ترجمہ کیا گیا ہے — سنسکرت کتاب ہتوپادسا کی یہ پہلی فصل ہے - اور پنڈت بدری لال نے اس ترجمے میں وہ حصے چھوڑ دئے ہیں جنھیں طالب علموں کی کتاب میں رکھنا کسی طرح مناسب نہ تھا —

حال ہی میں کلکتہ میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ شام کے وقت علمی اور ادبی مجالس منعقد کرے تاکہ ہندوستانی اور یورپین آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلاط بڑھا سکیں - اس میں دونوں کا نفع مدنظر ہے - ہندوستانی یورپین لوگوں کے میل جول

سے بہت سی ایسی باتیں سیکھ سکتے ہیں جن سے وہ مطلق بے خبر ہیں - یورپین لوگ اگر ہندوستانیوں کے ساتھ میل جول بڑھائیں تو اس سے انھیں ان کے مزاج اور طبیعت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور ہندوستانی زبان و ادب کا ان میں ذوق پیدا ہوگا —

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے - شہر دہلی میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے چار مدارس کھولے گئے ہیں - لڑکیوں میں بھی علم کا شوق پیدا ہوچلا ہے - ایک پانچواں مدرسہ اور حال ہی میں قائم کیا گیا ہے اس مدرسے میں صرف تیموری خاندان کی شہزادیاں داخل ہوسکتی ہیں اس وقت ۵۰ شہزادیاں تعلیم پارہی ہیں - شہر 'بنارس' میں با حیثیت ہندؤں کی ایک انجمن قایم کی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندو عورتوں میں تعلیم کو رواج دیا جاے - اس کے ساتھ ساتھ انجمن کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ ہندی زبان میں لڑکیوں کے لئے کتابیں چھاپی جائیں- کتاب صرف اس وقت انجمن کی طرف سے چھاپی جاتی ہے جب کہ انجمن کا صدر اور ارکان کی اکثریت اس کتاب کے متعلق اپنی پسند کا اظہار کردے - * 'بمبئی' میں ایک دولتمند پارسی مانک جی 'کرستجی' نے اپنے خاندان کی لڑکیوں کو یورپی طرز کی تعلیم دینا شروع کی ہے - موصوف نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے مکان کے ایک حصے کو لڑکیوں کے مدرسہ کے لئے وقف کردیں گے - ان کا ارادہ ہے کہ اس میں ایک مدرسہ قایم کریں اور تعلیم دینے کے لئے ایک انگریز استانی کو رکھیں - ان کی دو صاحبزدایاں بھی اپنے ہم وطنوں کی ہمدردی میں اس مدرسہ میں

---

* ملاحظہ ہو Delhi Journal اور Delhi Gazette (Allen,sInd, Mail Nov. 27, 1862.)

کام کریں گی - 'بمبئی' کے گورنر لارڈ 'الفنسٹن' نے اس تجویز کی پورے طور پر ہمت افزائی کی ہے - لارڈ موصوف نے اس مدرسہ کی تجویز کے متعلق فرمایا کہ دنیا میں جہاں کہیں عورتوں کو تعلیم دی گئی ہے وہاں لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت بڑہ گئی ہے اور خود مردوں کے اخلاق پر عورتوں کی تعلیم کا اچھا اثر پڑتا ہے - ہم یورپ میں مشکل ہی سے ان عورتوں کی حالت زار کا اندازہ کر سکتے ہیں جو سلسرا کی زندگی میں بہت جلد اپنا حسن و شباب کھوچکتی ہیں اور ان کے چاہنے والے ان کی طرف سے بے پروائی برتنا شروع کر دیتے ہیں بقول ایک شاعر :—

پڑ مردہ اور ذلیل

کلیوں نے انہیں توڑ کر ایک طرف بے پروائی سے پھینک دیا تازگی فنا ہوگئی اور ان کا حسن کمھلا گیا —

اب وہ قابل نفرت چیزیں ہیں - سبھوں نے انہیں چھوڑ دیا - اب ان کا ہر قدم بربادی کی جانب اُٹھہ رہا ہے —

میری طرح جن صاحبوں کو گذشتہ ماہ ستمبر میں ان دونوں پارسنوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ غالباً میرے اس دعوے کی تائید کریں گے کہ مانک جی کو اپنی بیٹیوں کے انگریزی تعلیم دلانے میں پورے طور پر کامیابی ہوئی - یہ 'پارسن' پہلی ہندوستانی عورتیں ہیں جو یورپ آئی ہیں - وہ ہندستانی میں جو ان کی مادری زبان ہے اور انگریزی اور فرانسیسی میں بلا تکلف گفتگو کر سکتی ہیں - مسٹر 'مانک جی' پہلے پہل سنہ ۱۸۴۱ ع میں یورپ آے تھے - اس دفعہ وہ اپنے دو بیٹیوں کے ساتھہ دوبارہ آے ہیں تاکہ 'لندن' جاکر ان کے قیام و تعلیم کا انتظام کریں - 'لندن'

میں پہلے سے کئی ایک پارسی موجود ہیں جو نہایت دولتمند ہیں۔ موصوف 'لندن' سے واپسی پر 'پیرس' میں چند روز ٹھہرے تاکہ اپنی صاحبزادیوں کو شہر پیرس کی سیر کرائیں —

حضرات! ہم یہ دعوی کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو زبان دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ چنانچہ بمبئی گزٹ مورخہ ۲۷ فروری سے مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بنگال اور بہار و اڑیسہ کے زمینداروں اور دوسرے باشندوں نے وائسرائے گورنر جنرل بہادر کو ایک عرضداشت بھیجی ہے جس میں یہ درخواست کی ہے کہ جدید ہائی کورٹ میں اردو زبان میں کاروائی کی جاے —

'اودھ' کے صوبے میں صرف ان وکلاء کو وکالت کی اجازت ملتی ہے جو اور دوسری شرائط کے ساتھ اردو دانی کی شرط بھی پوری کریں۔ ان کا امتحان بول چال اور تحریر دونوں میں لیا جاتا ہے تاکہ ان کی اردو دانی کی پوری تصدیق ہوجاے —

حال میں متعدد اشخاص کو حکومت برطانیہ نے استار آف انڈیا (ستارۂ ہند) کا خطاب عطا کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو تقریبیں ہوئیں ان میں اردو زبان ہی میں تقریریں کی گئیں۔ اسی طرح نومبر سنہ ۱۸۹۱ع میں مہاراجہ 'کشمیر' کی گدی نشینی کے موقع پر 'جموں' میں جو دربار منعقد ہوا اس میں مسٹر 'ڈیوس' نے اُردو میں تقریر کی۔ مسٹر ڈیوس اس موقع پر گورنمنٹ ہند کے نمایندہ تھے۔ جب موصوف نئے راجہ کے سینے پر تمغے لگا چکے تو راجہ نے بھی ان کی تقریر کا جواب اردو میں دیا —

ہندوستان کے ایک دوسرے حصے بنگال میں جس وقت سوجے پی گرانٹ سابق لفٹنٹ گورنر یورپ واپس جا رہے تھے تو 'کلکتہ' کے باشندوں

نے ۱۹ اپریل کو ایک جلسہ منعقد کیا جس میں موصوف کی خدمات عزیزی اور خلوص کا اظہار کیا - جلسہ کی صدارت راجہ 'رادھا کانت دیو' بہادر نے کی - موصوف بڑے فاضل آدمی ہیں اور ایک ضخیم سنسکرت کی لغت کے مصنف ہیں - اس موقع پر موصوف نے جو تقریر کی وہ اردو میں تھی - ان کی تقریر کے بعد راجہ 'کالی کرشن' بہادر کھڑے ہوئے - موصوف بھی مشہور مصنف ہیں اور آپ نے 'گے' (Gay) کی کہاوتوں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے - آپ نے بھی حسب موقع اردو میں تقریر کی نہ کہ بنگالی میں - ہندوستان کے اخباروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر جان 'گرانٹ' کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا - اس میں تشکر و احترام کے جذبات کا اظہار تھا - اور ان گرانقدر خدمات کا ذکر تھا جو موصوف نے اپنے زمانے میں صوبۂ بنگال کی کیں - یہ سپاس نامہ تجویز کی شکل میں جلسہ میں متفقہ طور پر منظور ہوا - اس کے بعد راجہ اپروا کرشن نے اردو میں تقریر کی اور یہ تجویز پیش کی کہ کلکتہ میں کسی جگہہ سر جان گرانٹ کا مجسمہ نصب کیا جائے —

(Haileybury کے کالج کی جگہہ Woolwich) کی فوجی اکاڈمی میں مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا - یہاں مسٹر کاگن ماتھر ہندوستانی زبان کی تعلیم دیتے تھے - مگر اب لندن کے (King's Collage) کنگس کالج میں مشرقی علوم کا ایک علحدہ شعبہ قایم ہوا ہے - (Haileybury) کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد منتخب اشخاص نے ملکی نظم و نسق اور علم و فضل میں بڑا نام پیدا کیا تھا - امید ہے کہ وہی روایات اب بھی قایم رہیں گی - (King's College) کے مشرقی شعبہ میں مسٹر فٹز ایڈورڈ ہال اردو زبان کی تعلیم دیتے ہیں اور مسٹر بلنٹائن سنسکرت پڑھاتے ہیں - اس

شعبے میں صرف درس ہی نہیں ہوں گے بلکہ یہیں سے تحریری اور زبانی امتحانوں کے بعد قابلیت کے اعتبار سے سند ملے گی - اس سند کی بدولت ہندوستان میں سرکاری خدمات بآسانی مل سکیں گی —

میں اپنے پچھلے خطبوں میں ذکر کر چکا ہوں کہ آکسفورڈ اور کیمبرج میں بھی اردو کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے - سنہ ۱۸۵۶ م میں ڈبلن یونیورسٹی میں بھی اردو فارسی اور عربی کی تعلیم شروع ہو گئی ہے - لندن کے یونیورسٹی کالج کی طرح ڈبلن میں بھی ایک ہندوستانی عالم مولوی اولاد علی ان زبانوں کی تعلیم دینے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں —

حضرات ! ہمیں چاہئے کہ اپنے سامنے ایک اعلیٰ علمی نصب العین رکھیں - دوسرے ممالک کے لوگ ہم فرانسیسیوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ سارا عالم فرانسیسی بولتا ہے مگر فرانسیسی سوائے اپنی زبان کے اور کوئی زبان نہیں بولتے * ہمارا فرض ہے کہ اس الزام کو اپنے سر سے دور کرنے کی کوشش کریں - ہمیں غیر زبانیں بولنے کی عادت ڈالنی چاہئے - اور غیر زبانوں سے میری مراد صرف یورپی زبانیں ہی نہیں بلکہ مشرقی زبانیں بھی ہیں - ہمیں اپنے پڑوسیوں ( انگریزوں ) سے اس باب میں سبق لینا چاہئے —

مسٹر جان 'میور' نے جو مسٹر ڈبلو 'میور' کے بھائی ہیں' یہ خوب کیا کہ ۴۰ ہزار روپے کی رقم اپنے شہر 'ایڈنبرا' کی یونیورسٹی میں سنسکرت ادب اور مقابلتی لسانیات کی "چیر" قایم کرنے کے لئے وقف کردی - حکومت کی طرف سے اس رقم میں اور اضافہ کیا جاے گا اور

---

* 'فرانسیسی کا خیال ہے کہ سب لوگوں کو چاہئے کہ اس کی زبان سمجھیں - خود اس کا یہ فرض ہے کہ سوائے اپنی زبان کے اور کوئی دوسری زبان نہ بولے" ( The Forgery - G . P . R . James. ) —

اس طرح یہ ممکن ہوگا کہ سنسکرت کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو یہاں اردو کی بھی تعلیم شروع ہو جائے ہمیں پوری توقع ہے کہ یہ انتظام جلد مکمل ہو جائے گا اور علم لسانیات کو ترقی دینے کی ایک شکل پیدا ہو جائے گی - یہ علم کیا بہ اعتبار اپنی دلچسپی اور کیا بہ اعتبار اپنے مفید ہونے کے نہایت اہمیت رکھتا ہے - اس سے فلسفۂ تاریخ اور دینیات دونوں مستفید ہو سکتے ہیں - چنانچہ میرے اس دعوے کا اگر آپ ثبوت تلاش کرنا چاہیں تو وہ 'میکس ملر' کے "لکچروں" میں موجود ہے - موسیو سینٹ ہلیر نے ان لکچروں کا خلاصہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے - لسانیات کے متعلق میں اس وقت صرف ضمناً اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے زمانے کے ماہرین لسانیات نے صرف و نحو کے اعتبار سے زبانوں کو تین خاندانوں میں تقسیم کیا ہے - ایک انفرادی ( Monosyllabic ) دوسری سلاحقی ( Agglutinative ) تیسری تصریفی ( Amalgamic )

پہلی قسم کے تحت چینی زبان آتی ہے - دوسری قسم کے تحت ترکی اور دوسری تورانی زبانیں اور تیسری قسم کے تحت آریائی زبان میں آتی ہیں - ان میں ایرانی اور انڈو آریائی زبانیں سب شامل ہیں - اردو زبان دوسری اور تیسری قسموں کے تحت آتی ہے اس میں تورانی اور ایرانی عناصر پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں - صرف و نحو کے اعتبار سے اردو زبان ایرانی ہے اور الفاظ کے اعتبار سے سامی * —

---

* 'گارساں دتا سی' کی اس رائے کو آج ماہرین لسانیات تسلیم نہیں کریں گے - لیکن ہمیں یہ ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جس زمانے میں اس نے اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی اس وقت علم لسانیات کی ابتدا تھی - تقریباً ۸۰ سال کی تحقیق نے پرانے نظریوں کو بالکل درہم برہم کر دیا — مترجم

سوسیو ' دیو پان ' نے جو انسٹیٹیوٹ کے رکن اور سینیٹ کے ممبر ہیں اور ایک فاضل شخص ہیں اپنی کتاب " اقوام کی پیدائشی قوت " میں ہندوستان کے متعلق ایک باب رکھا ہے - اس باب کا عنوان " تصویر ہند " ہے - اس میں وہ کہتے ہیں کہ برطانوی ہند کی مردم شماری سرکاری کاغذات کے مطابق اس وقت ۱۸ کروڑ ۷۰ لاکھ ہے - آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس تقریباً ۲۰ کروڑ نفوس کے درمیان جو چیز ایک مشترک رشتے کا کام دیتی ہے وہ اردو زبان ہے - یہ زبان پورے یورپ کے برابر رقبہ زمین میں بولی جاتی ہے - اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہے کہ آج یہ بیس کروڑ انسانی نفوس برطانیہ کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں - اس انتظام میں یقیناً مشیت ایزدی کو دخل ہے —

# باغ کہن

## "گلزار شہادت"

از

فلام همدانی مصحفی تصنیف سنه ۱۲۱۶ ھ

( یہ مثنوی میرے کتب خانے کے دیوان مصحفی کے قلمی نسخے سے نقل کی گئی ھے اور اس کا مقابلہ اور تصحیح جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا پانکی پوریٹنہ نے اپنی مہربانی سے خدابخش خاں لائبریری کے نسخے سے کی ھے - "ر خ" سے مراد نسخہ خدابخش خاں ھے - خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانے میں یہ مثنوی دیوان پنجم مصحفی میں ھے - میرا نسخہ غالباً مصحفی کی زندگی ھی میں لکھا گیا تھا - خدا بخش خاں مرحوم کے کتب خانے کا نسخہ مصحفی کی وفات کے دو ایک برس بعد لکھا گیا ھے - اس میں دو شعر زیادہ ھیں ' باقی ایسے اختلافات جو قابل لحاظ تھے حاشیے میں درج ھیں - یہ مثنوی جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ھے سنہ ۱۲۱۶ ھ میں تصنیف ھوی - مثنوی " بحرالمحبت " کا زمانۂ تصنیف بھی اسی کے قریب ھوگا کیونکہ یہ مثنوی بھی خدا بخش خاں لائبریری کے دیوان پنجم میں موجود ھے ) —

ادیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# مثنوی عشقیہ

(۱) ہے یہ جو نئی سی ایک حکایت — ایک زن سے ہے اسکی یوں روایت
(۲) یعنی کہ ہے مجکو اس قدر یاد — ہمسایہ مری تھی ایک پری زاد
(۳) سن دس کی دوازدہ کی تھی وہ — میں حور جو تھی تو تھی پری وہ
(۴) کھیلیں تھیں ہمیشہ ہو بہم شاد — ہم جولی مری تھی وہ پری زاد (ب)
(۵) باہم یہ رہے تھا عہد و پیماں — یعنی کہ سنو ہو میری بھینناں (ن)
(۶) جس وقت کہ بیاہ ہو تمہارا — ملنا مت چھوڑیو ہمارا
(۷) یا پہلے میں ہی بیاہی جاؤں — جس وقت کہ تم بلاؤ آؤں
(۸) چاہت میں ہماری اور تمہاری — آوے نہ فراق و اضطراری
(۹) ناگاہ بگردش ستارہ — منسوب ہوئی وہ ماہ پارہ
(۱۰) بیاہی گئی ایک مغل کے گھر میں — رہنے لگی قید بام و در میں
(۱۱) اتنے میں بحکم اعتقادی — کچھہ گھر میں اوتھی ہمارے شادی
(۱۲) عورات قبیلہ ہر طرف سے — آئیں کچھہ اپنے ساتھہ لے لے
(۱۳) شادی کی سنی جو ہیں ادائی — بن ٹھن کے وہ رشک مہ بھی آئی
(۱۴) اوتری جو محافہ میں سے وہ ماہ — کی دیکھہ کے آسمان نے بھی آہ
(۱۵) چھوٹی بہن اوسکی چشم بددور — یہ حور تو وہ تھی (ن) بچہ حور
(۱۶) وہ خود بتجمل عروسی — چھوٹی کا لباس سندروسی
(۱۷) نسبت میں وہ ماہ اور یہ ناہید — صورت میں سہا یہ اور وہ خورشید

---

(۴) ن خ بہم ہمیشہ دل شاد — (۵) ن خ گوئیاں — (۱۵) ن خ وہ بھی

(۱۸) پوشاک بلا تو زیور آفت　　در نو بہنیں سراسر آفت

(۱۹) کانوں میں جڑاؤ اوس کے بالا　　ہو جیسے ستارہ دار ہالہ

(۲۰) بیٹی کی چمک جبیں پہ ایسی　　جو ڈانک نہو نگیں پر ایسی

(۲۱) نتھہ ناک میں ہالۂ قمر تھی　　یا قلزم حسن کے بھنور تھی

(۲۲) کانوں میں وہ بالیاں طلائی　　کرتی تھیں ادا سے کج ادائی

(۲۳) بازو پہ کسا ہوا وہ بھوجبند　　تھی جس کی پری بھی آرزو مند

(۲۴) الماسی کڑے کلائیوں میں　　حل کردہ قمر صفائیوں میں

(۲۵) ہاتھوں میں وہ پور پور چھلے　　تھے جن سے بخوں طپاں معلے

(۲۶) جگنو وہ گلے میں ماہ پارہ　　جوں ماہ کے پاس ہو ستارہ

(۲۷) الماس کی اربسی وہ سادہ　　موتی کوئی ہو ئے جو بیادہ (ن ا)

(۲۸) پاؤں میں وہ موتیوں کی پازیب　　ہو جاوے پری کو جس سے آسیب

(۲۹) پھر تسپہ کڑی غضب وہ خمدار　　ہو جس کی صدا (ن) سے فتنہ بیدار

(۳۰) پھر رنگ کفک وہ تشنۂ خون　　لیلیٰ ہو جائی جس کی مجنون

(۳۱) با ایں ہمہ شان خود نمائی　　جب پردہ اوٹھا وہ باہر آئی

(۳۲) نزدیکی میں اک جوان سادہ　　تھا کرسی رت پر ایستادہ

(۳۳) دیکھہ اُوس کو یہ باطل نظارہ (ن)　　کرسی سے گرا وہ جوں ستارہ

(۳۴) ہو کر کے خدنگ خوردۂ عشق　　دل اوس کا ہوا فشردۂ عشق

(۳۵) سو جان سے ہو وہ اوس پہ شیدا　　لیلیٰ نے کیا ہے قیس پیدا

---

(۲۷) ن خ (بجلسہ بیادہ)　　(۲۹) ن خ کھنک

(۳۳) اغلب یہہ ہے کہ "باطل نظارہ" کی جگہ جو دونوں نسخوں میں ہے "بآول نظارہ" ہو اور پہلے مصرعہ میں "یہ" نہ ہو جو غیر ضروری ہے۔

(۳۶) دل اوس کا بلنا تمام(ن)حسرت کچھہ اوس میں رھی نہ تاب و طاقت
(۳۷) ہم عہد ہوا بناصبوری مرنا ھی پڑا اوسے ضروری
(۳۸) حیرت زدہ ہو نگاہ رہ گئی آکر کے لبوں پہ آہ رہ گئی
(۳۹) برق ایک دھاک میں اوس پہ پڑگئی تھی طاقت تن سو سب نبڑ گئی
(۴۰) سودے نے کیا مقام سر میں اوٹھنے لگی سول سی جگر میں
(۴۱) مژگاں ہوئیں اشک خوں سے تر (ن) رنگیں بنی (ر) برج عقد پروئیں
(۴۲) وہ سادہ بعالم جوانی آیا بہ بلائے نا گہانی
(۴۳) الفت میں زبس کہ نو ہوس تھا خود وہ بمقام شعلہ حس تھا
(۴۴) دیکھی جو یہ حسن کی تجلی بے خود ہو گرا بسان سوسی
(۴۵) لب خامش و شور و نالہ دل میں ایک طرفہ خروش آب و گل میں
(۴۶) اوس شادی کے گھر میں ایک زن تھی گویا بشگفتگی چمن تھی
(۴۷) گھر کا بس اوسیکی دم سے تھا بند وہ زن یہ کہے تھی سری نند
(۴۸) گہ پردے میں اوس کے حلوا سوہن بھیجا تا کھاویں اوس کو سب زن
(۴۹) گہ لونگ چڑے بایں بہانہ ارسال کئے درون خانہ
(۵۰) گہ پھولوں کے ہار مول لیکر بھیجے پئے نذر آں سمن بر
(۵۱) تا دیکھے وہ گل بھی خوئے الفت آوے اوسے دل سے (ن) بوئے الفت
(۵۲) القصہ تمام دن وہ بیتاب اوس روز پہ رہا بسان سیماب
(۵۳) وہاں سب کو وہ شب کٹی بشادی دل اوس کے پہ داغ نامرادی
(۵۴) انکھیں سوئے چرخ باز اوس کی جوں چشم نظارہ ساز اوس کی
(۵۵) تاروں سے وہ زخم دل فلک سود لب پر وہی آہ حسرت آلود
(۵۶) سودے کا سا ایک خیال دل میں اک دغدغہ کمال دل میں
(۵۷) حرماں سے بمرگ دل نہادہ بد ناسی کا اوس کی در زیادہ

---

(۳۶) ن خ میں "تمام" ھی ہے لیکن حاشیہ پر لفظ "مقام" لکھا ہوا ہے۔
(۴۱) ن خ آنکھیں بنیں (۵۱) ن خ اون سے

( ۵۸ ) یہ سوچ کہ دیکھوں صبح کیا ہو تن میں رہے جان یا ہوا ہو
( ۵۹ ) ہے شاہ ی کے گھر وہ آج مہمان کل ہوویگي اپنے گھر میں پنہان
( ۶۰ ) میں غمزدہ آہ کیا کروں گا بن آئی اجل ہی سر رہوں گا
( ۶۱ ) کاری ہے خدنگ عشق پرشور خوننابہ کرے ہے جسم ( ن ) پر زور
( ۶۲ ) اس خستہ کي آہ کیا کہوں بات یہ تھااوسي گفتگو میں بس (ن)رات
( ۶۳ ) جو اتنے میں مرغ صبح بولا سورج نے در فلک کو کھولا
( ۶۴ ) ہوئی روز کی روشنی نمایاں رخصت لگے ہونے شب کے مہمان
( ۶۵ ) تا چاشت وہ مہمان خانہ باہم ہوئے پیش و پس روانہ
( ۶۶ ) آیا جو میانہ اوس پری کا تھا کشتہ یہ جس کی کافری کا
( ۶۷ ) جون اوس میں ہوئی سوار یہ شنگ تھے اس میں اور اوس میں لاکھہ فرسنگ
( ۶۸ ) کرکے وہ قہار (ن) اوس کو پامال روح اوس کی گئی انھوں کے دنبال
( ۶۹ ) لیاں کی گئی اودھر سواری مجنوں کے لگي ادھر کٹاری
( ۷۰ ) دل خون ہو چشم تر کو آیا یعنے یہ فراق رنگ لایا
( ۷۱ ) بے ساختہ چاہ کام کر گئی کیا جانئے جی پہ کیا گزر گئی
( ۷۲ ) بال اوس نے بڑھائے اپنے سر کے در ہم ہوئے لوگ دیکھہ گھر کے
( ۷۳ ) ناخن بھی کئے سب اوس نے ناشی سودے میں برائے دل خراشی
( ۷۴ ) فوج غم اوس پہ جو پڑی ٹوٹ کھانا پینا بھی سب گیا چھوٹ
( ۷۵ ) کھائے تن زار نے زبس پیچ جوں موئے کمر وہ رہ گیا ہیچ
( ۷۶ ) جان ہونٹوں پہ آئی اوس کی سوبار پر اوس سے کیا نہ اس نے انکار
( ۷۷ ) دیکھے شب و روز عشق کے جور ایک سال بسر کیا اسی طور
( ۷۸ ) اس حال سے تھی وہ بی بی آگاہ لے گئی یہ فسانہ پیش آ نہاہ

---

) ۶۱ ) ن خ چشم ( ۶۲ ) ن خ اوس ( ۶۸ ) ن خ کہار

( ۷۹ ) کاے رشک پری ہے ایک نوزاد ہمسر بجنون قیس و فرہاد
( ۸۰ ) مہمانی کے روز تجھہ کو اوس نے دیکھا تھا محافہ سے اوترتے
( ۸۱ ) اوس دن سے ہوا ہے وہ بد احوال دو دو انگل کے سر پہ ہیں بال
( ۸۲ ) لب خشک ہیں اور چشم تر ہے مژگاں پہ چکیدۂ جگر ہے
( ۸۳ ) دشوار ہوا ہے اوس کو جینا سب بھول گیا ہے کھانا پینا
( ۸۴ ) کچھہ اوس کو نہ تن بدن کا ہے ہوش جامہ کا نہ پیرہن کا ہے ہوش
( ۸۵ ) رہتا ہے وہ دل گرفتہ غمناک عریانی تن ہے اوس کی پوشاک
( ۸۶ ) نہ منہہ سے کبھی کہے ہے کچھہ بات ہے جذب کی طور اُس کے حالات
( ۸۷ ) رہتا ہے اوسے ملال تیرا سودا تیرا خیال تیرا
( ۸۸ ) تھی وہ جو صنم بحسن مغرور اور آپ کو سمجھے تھی بہت دور
( ۸۹ ) کانو سے سنا تو گرچہ قصا پر کچھہ نہ دیا جواب اس کا
( ۹۰ ) خاموش رہی وہ سن یہ مذکور پر دل نے کہا ہوا میں نا سور
( ۹۱ ) ہوئی جا کے وہ صاحب تامل پوشیدہ بقلعۂ تغافل
( ۹۲ ) کچھہ دھیان نہ اوس کا دل پدلائی بیگانۂ طور آشنائی
( ۹۳ ) جب اوس کی سنی تو ٹال دی بات کچھہ اور وہیں نکال دی بات
( ۹۴ ) دلبستۂ عیش و ناز رکھا رسوائی سے خود کو باز رکھا
( ۹۵ ) مقدور تلک رہی وہ خندان گہر ارمں کا رہا بہ از گلستان
( ۹۶ ) یوں یہاں سے لکھے ہے کلک تحریر افسانۂ عاشق جوان سیر
( ۹۷ ) اوس کہنہ شراب کا وہ مخمور یعنی وہ جو تھا کمال ( ن ) رنجور
( ۹۸ ) جب تنگ ہوا رواق اوس پر اور ٹوٹ پڑا فراق اوس پر
( ۹۹ ) وہ سال دگر بھی کاٹ اسی طور کر کر کے وداع عقل فی الفور

( ۹۷ ) ن ع بحال

(۱۰۰) ہو وادئی عشق میں پیادہ　　مجنوں سے قدم رکھا زیادہ
(۱۰۱) ہجراں کی جو دیکھی محنت شاق　　تن سوکھ کر اوس کا ہوگیا قاق
(۱۰۲) آنکھیں یرقان گرفتہ ہوگئیں　　پلکیں اوسے خون میں ڈبو گئیں
(۱۰۳) چہرے پہ جو رنگ زعفراں تھا　　لب خندہ میں ابھی (ن) وہ جواں تھا
(۱۰۴) تھا کلفت دل سے جو مکدر　　خاک اوڑتی تھی بھیگتی مسوں پر
(۱۰۵) وہ طاقت زور نوجوانی　　تھا مصرف چرخ ناتوانی
(۱۰۶) بالوں نے کیا اوسے نمد سو　　تن جیسے بتاب شاخ آہو
(۱۰۷) آنکھیں بہیں منہ پہ دجلہ ہوکر　　پھر رونے لگا اوٹھا جو سو کر
(۱۰۸) سونا تو نصیب میں کہاں تھا　　ایک خواب غشی کا وہ سماں تھا
(۱۰۹) دن رات اوسے نصیبوں سے جنگ　　ایک کوچہ رہ ہزار (ں) فرسنگ
(۱۱۰) رنگ اوس کا بہار میں زریری　　حال اوس کے سے جلوۂ فقیری
(۱۱۱) کپڑے سو وہ تیلیا بدن میں　　جیتا ہے اجل کے وہ دہن میں
(۱۱۲) سو پر دیس میں وہاں وہ رشک خورشید　　یہاں ایک جھلک تلک یہ نومید
(۱۱۳) تنہائی میں پاس اوس کے غم خوار　　پاس اوس کے نہ غیر چار دیوار
(۱۱۴) اس عرصہ میں وہ زن وفادار　　آئی گئی درمیان میں سو بار
(۱۱۵) جب خوب یہ سوکھکر ہوا زار　　گو بندہ کہے ہے آخر کار
(۱۱۶) با وصف غرور کبریائی　　اس کی بھی طبیعت ایدھر آئی
(۱۱۷) گھر والوں سے اپنے بیٹھ کر دور　　سننے لگی جیسے اس کا مذکور
(۱۱۸) پایا جو مزاج نازیدہ (ر ن) کو　　وہ زن ہوئی اوس سے یوں سخن گو
(۱۱۹) کاے حور نژاد ہے وہ مہجور　　دوری سے تری کمال رنجور

---

(۱۰۳) ن خ آپھی　　(۱۰۹) ن خ رہ و ہزار　　(۱۱۸) ن خ اودھر

(۱۲۰) آزردۂ رنج شاق ہے وہ مد قوق تپ فراق ہے وہ
(۱۲۱) مشتاق نظر وہ جاں بلب ہے دیدار کی اوس کو بس طلب ہے
(۱۲۲) تب اوس نے کہا یہ بہر دم سرد میں کیا کروں زن ہوں وہ تو ہے مرد
(۱۲۳) زن پر اگر آے مرد کا دل پھر کیا کوئی ہو جو پاے در گل
(۱۲۴) افتادہ میان چار دیوار تم جانتی ہو کہ ہوں میں لاچار
(۱۲۵) ہوں لاکھہ قفس میں اک تو محبوس اس پر مانع ہے پاس ناموس
(۱۲۶) دن رات ہے اتنی قید مجھہ پر رکھہ سکتی نہیں میں پاوں بر در (ن)
(۱۲۷) روزن ہے جو گھر کا دہدباں ہے نظارہ کی جا کہو کہاں ہے
(۱۲۸) ناموس سے سہل تھا گذرنا مجھکو تو پڑا ہے غم میں مرنا
(۱۲۹) چارہ نہیں کچھہ مگر کہ اس سال ایک شادی ہے گھر میں میرے فی الحال
(۱۳۰) آویں گی قبیلہ کی زناں سب یعنی مرے رت جگا ہے اس شب
(۱۳۱) پہنا کے اوسے زنانی پوشاک اور تال کے چشم فتنہ میں خاک
(۱۳۲) بھجواونگی یہاں سے میں میانا ساتھہ اپنے سوار کر لے آنا
(۱۳۳) ٹھہرا جو مدار وصل اس طور جب آئی وہ رات اس نے فی الفور
(۱۳۴) پوشاک زنانی اور زیور پہنوا دئیے اوس کو خوان میں دھر
(۱۳۵) جوڑا وہ برنگ زعفرانی ہو دیکھہ جسے پری دیوانی
(۱۳۶) کمخواب کی وہ ازار گلبدہ تارے کرتے تھے جس کو اسپند
(۱۳۷) معجر وہ برنگ لالہ تر دیکھا کرے جس کو چشم اختر

---

(۱۲۶) ن خ در پر

ن خ میں شعر نمبر ۱۳۶ کے بعد یہ شعر ہے جو میرے نسخے میں نہیں ۔

" تسپر وہ ازار بند زریں جوں دامن کہکشاں میں پرویں "

(۱۳۸) پھر تسپہ وہ سینہ بندگل دروز　　جو گل سے فرشتہ کے چلے سوز
(۱۳۹) پھر نہمتنہ وہ دام بابل　　کاڑھے ہوے جس میں سیکڑوں گل
(۱۴۰) پھر کفش وہ رشک ماہ و خورشید　　ہم پنجہ بتاج فرق جمشید
(۱۴۱) جب گھر میں میدنجی کے یہ پوشاک　　آئی ہوئی (ن) دیکھکر (ن) طارب ناک
(۱۴۲) اوس زن نے کہ تھی وہ محرم کار　　اور رہتی تھی ہردم اوسکی غمخوار
(۱۴۳) کنگھی چونٹی کر اوس جوان کی　　دی وضع نکال سب زنان کی
(۱۴۴) پوشاک جو اوسکو وہ پہنائی　　حور اکے تئیں پری دیکھائی
(۱۴۵) زیور سے کیا جو پھر تزئیں　　پڑنے لگی اوسپہ چشم پروین
(۱۴۶) انکھونمیں دیایہ وہ اس کے کاجل　　جو دیکھہ کے اسکو شب گئی جل
(۱۴۷) چونٹی گوندھی وہ بور یا بات　　چون مار سیاہ ہو پس قات
(۱۴۸) رکھا وہ ذقن پہ خال میگوں　　جو چشم فرشتہ جس سے پر خوں
(۱۴۹) از بس جعلی نہ تھے جو وہ بال　　تھی مانگ کی اوس کی تہیک تمثال (ن)
(۱۵۰) سینہ پہ وہ چھاتیاں چکنی سی　　تھیں تعبیہ کی ہوی روئی کی
(۱۵۱) اون پر وہ مصالحہ (ن) دار انگیا　　جسسے عجب ایک بناؤ پیدا
(۱۵۲) پورونپہ وہ خندقین بنائیں　　جو حور و پری کے جی کو بھائیں
(۱۵۳) رھار وہ تو دو کوی بال طاؤس　　پہار مد نگاہ دست افسوس
(۱۵۴) القصہ بناو اوس کا کر خوب　　ہوتا ہے جو بانکی زن کو مطلوب
(۱۵۵) اوس رشک پری کے جب وہ آئی　　ایک حور پری کی گھر میں لائی
(۱۵۶) الفت نے جو اوسکی جوش مارا　　وہاں سب سے جدا اوسے اتارا

---

(۱۴۱) ن خ ہوا - ن خ دیکھہ وہ
(۱۴۹) ن خ میں شعر نمبر ۱۴۹ کے بعد شعر نمبر ۱۵۲ ہے - ن خ میں شعر ۱۵۲ حاشیہ پر درج ہے - غالباً نسخہ خ کی ترتیب صحیح ہے —
(۱۵۱) ن خ مسالہ

(۱۵۷) ایک حجرہ نفیس وفرش معقول قالیں پہ ہزار رنگ کے پھول
(۱۵۸) وہ چاندنی اوسپہ رشک مہتاب ہو آئینہ جسکو (ن) دیکھہ سیماب
(۱۵۹) ایک گوشہ بچھا پلنگ سادہ گل تکیہ سر ہانے دو نہادہ
(۱۶۰) بے دخل فشار وبوس و آغوش ایک اوسپہ پڑا ہوا پلنگ پوش
(۱۶۱) شادیہیں ایدھراودھر وہ پویاں یہ نشنہ نظر نظارہ جویاں
(۱۶۲) انکھوں سے سرشک وصل جاری دل پر وہی جوش بیقراری
(۱۶۳) اوس عین خوشی میں ہجر کا غم اجزائے نشاط وصل درہم
(۱۶۴) آجانا ایدھر اودھر سے اوسکا پاس اپنے فلک زدے کے تنہا
(۱۶۵) پھر وہیں ٹہر کے ایک دو دم کرنا اوسے غم کو غم میں مدغم
(۱۶۶) تہیں عمدہ زناں جو قوم کی وہاں تمکیں میں رہیں وہ اوسکی حیراں
(۱۶۷) کہتی تہیں یہ بی بی ہے بہت دور دیکھی نہیں ہمنے ایسی مغرور
(۱۶۸) نہ حجرہ سے باہر آتی ہے یہ نہ ہمکو وہاں بلاتی ہے یہ
(۱۶۹) نہ ہنستی ہے اور نہ بولتی ہے یہ عقدۂ دل کو کھولتی ہے
(۱۷۰) خجلت نے دیا ہے جام اس کو ہمدم سے ہے اپنے کام اسکو
(۱۷۱) کرتی نہیں یہ گھمنڈ اسپر ہم پاس بھی ہے لباس و زیور
(۱۷۲) ہر ایک کو جواب دے وہ عیار آئی دل شب ادھر بیکبار
(۱۷۳) چوسر کی دوبازی کھیلیں اوس سات بس اس ہی میں کی سوکی کوئی یہ بات
(۱۷۴) تنہا وصل سے بس کہ وہ تراسا اولٹا پڑتا تھا اوسکا پاسا
(۱۷۵) وہاں عرصۂ تنگ ہمدمی کو یہاں ہارے ہوئے یہ اپنے جی کو
(۱۷۶) اس امر محال پر نظر کر اس تنگ وصال پر نظر کر
(۱۷۷) پھر اوٹھہ گئی وہاں سے دے تسلی مجنوں نے کیا وہ کام لیلی

(۱۵۸) ن خ شکل

(۱۷۸) پھر اس کا کلیجہ منہ کو آیا خون جگری نے جوش کھایا
(۱۷۹) آنکھوں سے گرے وہ اشک خونیں جو اون سے ہوا بساط رنگین
(۱۸۰) اتنے میں پیام روز آیا منہہ صبح وداع نے دیکھایا
(۱۸۱) زایل ہوئی وہ سیاہیء شب تاریک ہوا وہ نور کوکب
(۱۸۲) انجم چھپے آفتاب نکلا رخصت کا پڑا جو گھر میں غوغا
(۱۸۳) پہلے کر اوسی جواں کو رخصت اوس نے بھی کیا وداع طاقت
(۱۸۴) ہو بازی چرخ سے مشوش آپہی وہ جلی مثال آتش
(۱۸۵) بدنامی کا لاکے دل میں وسواس ناموس کا اپنے یوں رکھا پاس
(۱۸۶) بعد اوس کے زنان قوم ساری رخصت ہوئیں اوس سے باری باری
(۱۸۷) آشوب جو شب کا تھا ہوا کم وہ رہ گئی اور گھر کے محرم
(۱۸۸) کر یاد وصال دوست روئی محرم اوس کا ولے نہ کوئی
(۱۸۹) وہاں جو کیا تھا بادل زار بستر پہ کراہی ہوکے بیمار
(۱۹۰) آئی جو ہوائے اُنس اوسے راس بھجوانے لگی اصیل اوس پاس
(۱۹۱) پردہ وہ حجاب کا ہوا دور موصول ہوے یہ دونو مہجور
(۱۹۲) کہتے ہیں رہا وہ خستہ و زار اوس سوچ میں نو مہینے بیمار
(۱۹۳) آخر کو گذر گیا جہاں سے دھو بیٹھا ہی ہاتھہ اپنی جاں سے
(۱۹۴) بے شربت وصل یار جانی ہوئی اوس کو جو تلخ زندگانی
(۱۹۵) ٹوٹا جو یہ کوہ ہجر اوس پر صحرائے فراق میں گیا مر
(۱۹۶) پرسش کو اجل جو اوس کے آئی ماں اوس کی نے سر پہ خاک اوڑائی
(۱۹۷) اوس گھر سے اوٹھی نوائے ماتم گھر ہوگیا اوس کا خانۂ غم
(۱۹۸) یعنی بفراق روئے دلدار دنیا سے گیا وہ عاشق زار
(۱۹۹) ہمسائیہو یار اور برادر آئے جو یہ مرگ تازہ سنکر

(۲۰۰) جوں ابر بہار زار روئے آہستہ (ن) نہ بل پکار روئے
(۲۰۱) ایک یار نے وہاں پچھاڑ کھائی دندان زدہ اک نے کی کلائی
(۲۰۲) سر پیٹ کر ایک غش میں آیا ایک سینہ زنی کا سانگ لایا
(۲۰۳) ایک خستہ نے پیرہن کیا چاک ایک روتے نے سر پہ ڈال لی خاک
(۲۰۴) جب آہ و فغاں ہوی فلک رس آ صبر نے یوں کہا کہ بس بس
(۲۰۵) نہلا چکے اتنے میں جو غسال پہنا کے کفن بھی اوس کو فی الحال
(۲۰۶) پھر بوریہ پر سے جو اٹھایا تابوت میں لاش کو لٹایا
(۲۰۷) وارث چلے اوس کے بلال زار لے کر وہ جنازہ رو ببازار
(۲۰۸) تابوت پہ سبز ایک دوشالا لا کر پے زیب و شان ڈالا
(۲۰۹) چادر پھولوں کی لہلہاتی پھٹتی تھی صبا کی جس سے چھاتی
(۲۱۰) یوں سبز دوشالہ کی تھی تزئیں جس طرح کہ آسماں پہ پرویں
(۲۱۱) تابوت کہ تختۂ چمن تھا جس تختہ پر جوش نسترن تھا
(۲۱۲) پہونچا جوقریب(ن)کوئی معشوق آئی اوسے رو ہیں بوئے معشوق
(۲۱۳) تابوت‌کش‌اورطرف (ن) رواں تھے یہاں پاوں میں رسی تواماں تھے
(۲۱۴) جاتے تھے کھچے اوسی گلی کو ٹک دیکھیو جذب رفتگی کو(ن)
(۲۱۵) معشوق کا تھا جہاں در و بام سنگین محل اوس مکاں کا تھا نام
(۲۱۶) پیش در خانۂ بت چین جاکر کے ہوا جنازہ سنگین
(۲۱۷) تا دیر رہا وہ ہو گراں بار حمالوں کی سر پہ بیستیں وار

---

(۲۰۰) ن خ ہوکر کھڑے داڑھیں مار روئے (۲۱۲) ن خ قرین (۲۱۳) ن خ سو
(۲۱۴) ن خ میں اس کے بعد یہ شعر ہے —
تابوت کے ساتھہ نوحہ کرتے آخر سب اوسی گلی کو گذرے

(۲۱۸) از بس کہ ہجوم جزو و کل تھا　　اوس واقعہ سے گلی میں غل تھا
(۲۱۹) حیران تھے نظارگیٔ بازار　　بر وقفۂ مردۂ گرانبار
(۲۲۰) کھلتا ہی نہ تھا سبب کسی پر　　ہنگامہ تھا ایک اوس گلی پر
(۲۲۱) ہر گھر کے نظارگی دواں تھے　　مرد اور زن(ن) پیش و پس رواں تھے
(۲۲۲) پہونچی یہ خبر اوسے بھی جوہیں　　کر غسل وہ رشک ماہ و پروین
(۲۲۳) پردے پردے کے بیچ رو کر　　جان اپنی سے اپنے ہاتھہ دھو کر
(۲۲۴) ہوی از رہ فرط بیقراری　　آمادۂ مرگ اختیاری
(۲۲۵) لے ہاتھہ میں پیش قبض شوہر　　آئی ایک بار کوٹھے اوپر
(۲۲۶) از بہر طوات کشتۂ خویش　　مشتاق تھی بس کہ وہ جگر ریش
(۲۲۷) گردن کو اوٹھا کے جوہیں جھانکا　　دیکھا کہ جنازہ ہے جواں کا
(۲۲۸) چلتا نہیں جا سے اڑ رہا ہے　　کہرام گلی میں پڑ رہا ہے
(۲۲۹) بس دیکھتے ہی اوسے پھر اک آہ　　مارا بشکم وہ دشنہ ناگاہ
(۲۳۰) تھا بدرقہ جوئے عاشق زار　　کیا بدرقہ مل گیا ہے ایک بار
(۲۳۱) جب خون میں تر ہوا وہ خنجر　　تھی رشک چمن وہ لالۂ تر
(۲۳۲) ملبوس جو اوس کا لالہ گوں تھا　　بے دشنہ ہی گرچہ غرق خون تھا
(۲۳۳) پر خون نے اور تہ چڑھادی　　اور آگ کو آگ سی لگادی
(۲۳۴) عمداً وہ موئی برائے عاشق　　روح اوس کی گئی قفائے عاشق
(۲۳۵) تھا گرچہ لباس اوس کا گل گوں　　تھی اوس سے زیادہ سرخی خون
(۲۳۶) افتادہ بخون وہ کوٹھے اوپر　　خاموش زبان بریدہ خنجر

---

(۲۲۱) ن خ مرد و زن

(۲۳۷) اتنے میں کسی نے جو یہ سرار (ن) جانا کہ کھلی لہو کی گلزار
(۲۳۸) ناگاہ محل میں پڑ گیا غل یعنے کہ سوئی وہ غیرت گل
(۲۳۹) دیکھا جو اسے در آب و آتش شوہر بھی بہت ہوا مشوش
(۲۴۰) الفت کا جو راز تھا گیا کھل خم ہو گئے صد سر تامل
(۲۴۱) یکبار اٹھا جو شور و شیون گئے پردۂ گوش اسمان چھن
(۲۴۲) تھی بام پہ غرق خون وہ گلفام خور شید ہو جیسے بر لب بام
(۲۴۳) ہوسا یہ بھی رہ گئے عجب میں باقی تھا کچھہ ایک وصول سب (ن) میں
(۲۴۴) ہر ایک وہاں جو پر عجب تھا دندان کے ساتھہ ربط لب تھا
(۲۴۵) کہتے تھے کہ ان میں چاہ ہوگی مدت سے دلوں میں راہ ہو گی
(۲۴۶) دے غسل اوسے ہاتھوں ہاتھہ ایکبار اوس کا بھی کیا جنازہ تیار
(۲۴۷) صندوق میں رکھہ دفینۂ عشق معلوم کیا قرینۂ عشق
(۲۴۸) بازار میں اوس کو جب نکالا منھہ اپنا کیا فلک نے کالا
(۲۴۹) سقوں کی چلو میں آب پاشی تابوتوں پہ پیر گلاب پاشی
(۲۵۰) معشوق کا تھا جنازۂ در پیش پیچھے وہ جنازۂ جگر ریش
(۲۵۱) دونوں وہ جنازے جب رواں تھے حیرت زدہ پیر اور جواں تھے
(۲۵۲) کہتے تھے یہ طرفہ ماجرہ ہے کیا مردہ نے زندہ کو لیا ہے
(۲۵۳) عاشق معشوق کا جو ہے سات بس آج کھلی ہے ہم پہ یہ بات
(۲۵۴) آخر کو اونھیں بہ تکیۂ بھیم جا کرکے (ن) کیا بخاک تسلیم
(۲۵۵) تا شاہ رہیں وہ دونو غمناک یک چند میان خلوت خاک
(۲۵۶) یہ عشق عظیم بیگ مرزا رکھتا تھا (ن) جو عشق بیگمان کا

---

(۲۳۷) ن خ خون بالسرار (۲۴۳) ن خ ف ب ۴۲۵ ن خ لیکھا کے ن خ تھا کشتۂ حسن

( ۲۵۷ ) اک طرفہ فسانہ ہے جنوں خیز ہر حرف ہے جس کا وحشت انگیز

( ۲۵۸ ) تھا بس کہ گمان عیب سے پاک مدت سے رہا تھا اس کو میل تاک

( ۲۵۹ ) ماہ رمضان کی تیرھویں شب کر نظم اسے کیا مرتب

( ۲۶۰ ) تاریخ رقم ہوئی ہے اس کی بارہ سے سولھہ سن ہجری

( ۲۶۱ ) کی ہے جو یہ مثنوی میں ارقام گلزار شہادت اس کا ہے نام

( ۲۶۲ ) یہ صنعت کلک مصحفی ہے ہر حرف میں اس کے ساحری ہے

( ۲۶۳ ) خواننده کو چاہیے جو ہو شاد
مجھہ کو بھی بفاتحہ کرے یاد

§ * §

# اُردو کے اَن پڑھ شعرا

از

[ جناب مرزا فدا علی صاحب ' خنجر ' لکھنوی ]

———()*()———

## غلامی

" غلامی تخلص - در شاهجهاں آباد بود - از قوم اردل "

" به پیشهٔ خبرداری نوکری داشت لیکن در فن شعر "

" بکمال بے خبری بسر می برد مگر طبع موزونے داشت "

" از تذکرہ مہر حسن "

یہ شاعر بھی اُسی تھا اور کسی ادنیٰ طبقے سے متعلق - دھلی میں پیدا ھوا اور وھیں زندگی کے دن گذار دئے - ھرکارہ یا جاسوسی کی خدمت انجام دے کر پیٹ پالتا تھا - شاعری کا عروج اور طبیعتیں ذوق سخن سے آشنا ھورھی تھیں - سچ تو یہ ھے اُن دنوں ھوا نے ذوق پاشی کا اثر پیدا کر لیا تھا - ھندو مسلمان ' یہود و نصارا لیلائے سخن کے والہ و شیدا ھو رھے تھے - گھر گھر سے نغمہ شعر و سخن بلند تھا - عالموں کی کون کہے جہلا بھی طبع آزمائی میں ھم عصروں سے پیچھے نہ تھے - اگر امرا کے کاشانوں میں نور سخن جگمگاھٹ اور چکاچوندہ پیدا کر رھا تھا تو غربا کے جھونپڑوں

میں بھی آفتاب شاعری کی شعاعیں ضیا بار دکھائی دیتی تھیں - پھر غلامی کا شوق سخن جائے عجب "کیوں ہو" ؟ اُس نے بھی دور حاضرہ کے بہاؤ میں بہنا شروع کیا -- افسوس ! اِس کے حالات بالکل دریافت نہ ہوئے میر حسن نے اِس کی نسبت بہتر رائے قائم نہیں کی -- اُن کی رائے ہمارے لئے چراغ ہدایت ہے -- پھر بھی اُسی ہونے کی جہت سے اُس کی سعی و کوشش اور ذوق فطری اِس قابل ہے کہ ہم اُسے داد دیں - اِس کے نام سے صرف ایک مطلع دیکھا گیا جو نمونۂ کلام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے —

سرخ لاتی ہیں نشے بیچ جو تورے آنکھیاں
دل زخمی پہ لگاتی ہیں ٹکورے آنکھیاں

---

## غمگین

میر عبداللہ نام غمگین تخلص - میر حسین تسکین کے فرزند تھے جو سرکار رام پور کے دامن دولت سے وابستہ تھے - حسن مردانہ میں یوسف وقت ولاثانی تھے - عادات و اطوار پسندیدہ - مزاج میں انکسار و تواضع بکثرت - کس و ناکس سے جھک کے ملنا اور خندہ جبینی سے پیش آنا شعار تھا - جس صحبت میں جاتے عزت سے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے -- طبیعت مرنج مرنجاں واقع ہوئی تھی - احباب کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملنے پایا - شرم و حیا کی تو گو یا مجسم تصویر تھے —

حب وطن نے دہلی سے کبھی قدم نکالنے کی اجازت نہ دی -

۔ حسین " تسکین " کا قیام رام پور میں تھا جو " غمگین " کی تعلیم علمی کے نقصان کا باعث ٹھہرا اور یہ علم کی طرف سے بالکل کورے رہ گئے لیکن شرافت خاندانی نے ہمیشہ تہذیب و شائستگی کا پابند رکھا - شاعری کا شوق بچپنے ہی سے پیدا ہوا - گویا یہ میر " تسکین " کے خون کا اثر تھا - پہلے بطور خود کہا کئے پھر اپنے والد سے مشورۂ سخن کرنے لگے - فن لطیفہ کے لئے طبیعت مناسب واقع ہوئی تھی - جو شعر نظم کے سانچے میں ڈھلتا فصاحت کی جان معلوم ہوتا - عنفوان شباب کے کیف اثر و لولوں نے رنگینی پیدا کردی - متانت و سنجیدگی نے جا بجا نمایاں ہو کر لطف شعر کو اور بھی دو بالا کردیا - تھوڑی ہی مشق میں وہ پختگی پیدا ہو گئی جو دوسروں کو سالہا سال کی محنت میں نصیب ہوتی ہے - افسوس ! زندگی نے وفا نہ کی اور یہ جواں طبیعت شاعر عالم شباب میں میر حسین " تسکین " کو غم مفارقت سے بے تسکین و غمگین کر گیا - بقول مولوی عبدالغفور خاں " نساخ " ان کا انتقال رام پور میں ہوا - واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ دہلی میں رہتے رہتے طبیعت اچاٹ ہوئی - ہم جلیسوں کی صحبت کا رنگ پھیکا پڑا - خاک رام پور نے کشش کی اور اجل راہبر بنی یعنی " غمگین " وطن ( دہلی ) سے نکل کر عازم رام پور ہوئے - ان کے حسن صورت و حسن سیرت نے احباب کو گرویدہ کرلیا تھا - سب کو ان کی مفارقت کا قلق ہوا - بعض بے تکلف احباب نے روکنا چاہا لیکن یہاں تو قضا دامن گیر تھی - کسی کی بات نہ سنی اور اپنے والد میر حسین " تسکین " کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو گئے - رام پور کی سکونت کو چند روز گذرے تھے کہ بیمار پڑے - غم نصیب باپ نے تا مقدور دوڑ دھوپ کی لیکن موت سے زور

نہ چلا اور غمگین با دل غم زدہ رام پور میں پیوند زمیں ہوگئے - سدا جاتا ہے " غمگین " بڑے پر گو واقع ہوئے تھے - ایک دیوان غزلیات بھی جمع کر لیا تھا جو زمانہ کی نا مہری سے رواج نہ پاسکا - طراوش سخن کا اسلوب ملاحظہ ہو —

شور بختی نے مزہ زور چکھایا دل کو نالہ ' سو زخم جگر پر نمک افشاں نکلا

---

حشر میں فریاد کیا کرتا مجھے یاد آگیا قہر آلودہ نگہہ سے دیکھنا جلاد کا
وہ خبر ہی جانگزا تھی جس کو سن کر مرگیا ورنہ اک تیشہ سے ہوتا کام کیا فرہاد کا

---

اُمت نوح پہ طوفاں ہی آیا یارو ! شکر یہ ہے کہ مرا دیدۂ خوں بار نہ تھا

---

ہر چند رشک ہے ' پہ بنی اب تو جان پر توہی صبا اُلٹ کہیں گوشہ نقاب کا

---

آتے زرا نہ اور تو مرہی چلے تھے ہم تم نے تو کہہ دیا کہ ہمیں کچھہ خبر نہیں

---

عدو سے کیوں ہنسے تم جو اُٹھایا اس نے طوفان کو
بہانا ہوگیا رونے کا مہری چشم گریاں کو

---

کہی کریں جگر و دل تو کیا کروں یارب ! کچھہ اور دے مجھے مژگان خون فشاں کے لئے

---

اب آ - یو نہیں مرے سینے سے لگ جا گرہ وا ہو چکی بند قبا کی

---

چاہئے تھا مرے مرنے کا بہا نا دل کو تم چلے روٹھ کے ' اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

---

کی مری متی عزیزوں نے خراب ہائے ! لاکر خانۂ خمار سے

---

## فصاد

نمو نا م فصاد تخلص تھا - ایک حجام تھا جس کی زندگی کا آغاز و انجام دھلی میں ہوا - شاہ نصیر کا زمانہ پایا تھا - اکثر اُن کی خدمت میں حاضر رہتا - شاہ نصیر کے گرد دائرہ صد ہا شاگردوں کا ہجو م رہتا - ہر وقت شعر و شاعر ی کا چرچا ہوا کرتا - کوئی نؤ تصنیف غزل سناتا ' کوئی شعرائے وقت کے چیدہ چیدہ اشعار پڑھتا اور شاہ نصیر اُن منتخبات سے ہر ایک کی طبیعت اور ذوق سخن کا اندازہ کر تے - اِس صحبت میں فصاد کو بھی بیشتر نکات شعر ی سننے کا موقع ملتا اور اکثر باتیں حافظے میں محفوظ ہوتی جاتیں - آخر صحبت شعرا رنگ لائے بغیر نہ رہی - دل میں گد گدی شروع ہوئی - جذبات و حسیات ہمکے اور فصاد نے شعر گوئی کا آغاز کیا - پیشے کی مناسبت سے فصاد تخلص اختیار کیا - اِس فن لطیف کے لئے طبیعت بالکل ہی نا مناسب واقع ہوئی تھی اُس پر بے علمی المضاعف - بہت کچھ زور لگائے لیکن ذوق صحیح نہ پیدا ہونا تھا نہ ہوا - اس کی شاعر ی کا زیادہ تر حصہ تک بند ی اور مہملات پر دلالت کرتا ہے - اُستاد کی اصلاح سے جو اشعار درست ہو گئے ہیں اُن میں بھی تخیل کی پستی نے پھیکا پن پیدا کر دیا ہے - نمو نتاً ایک شعر

درج تذکرہ ہوتا ہے —

بادہ کے ہمیں پینے سے کیا کام ہے ساقی مئے خون جگر، آبلہ ہے جام ہمارا

---

## فضل

فضل مولا خاں نام فضل تخلص — وحید العصر افضل الشعرا خطاب ہے جو ایک مدحیہ قصیدے کے صلے میں حضرت ظل سبحانی ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی المتخلص بہ " شعاع " بن شاہ عالم ثانی " آفتاب " کے دربار فیض آثار سے حاصل کیا تھا - ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں کھیل کود کر بچپنے کا زمانہ بسر کیا اور جوان ہوئے - ان غریب کے خاندان پر اوائل سے کچھہ ایسی مصیبتیں نازل ہوئیں کہ یہ لکھہ پڑھ نہ سکے - مگر نہایت خلیق و متواضع - پابند وضع اور بھی خواہ خاص و عام واقع ہوئے تھے - کبھی کسی کی برائی مد نظر نہ ہوتی - دوسروں کی امداد و استعانت کے واسطے دربے، قدمے، سخنے موجود رہتے - آفریں عالم کی بارگاہ سے کمال حسن صورت و وجاہت پائی تھی اُس پر جامہ زیبی بلا کی تھی - ہر وضع و ہر لباس غضب کا کھلتا - گویا میر عبدالحیٔ " تاباں " کی طرح ان کا حسن و جمال بھی مشہور آفاق تھا - ان خوبیوں اور اوصاف کے ساتھہ ساتھہ معروالمزاجی کا عیب بھی موجود تھا - ذرا ذرا سی بات میں روٹھہ جانا اور غصہ کرنا تو کوئی بات ہی نہ تھی - اپنی ذات کو اول ترین ذات تصور کرتے اور دوسروں سے فخر و مباہات کا اظہار ہوتا - اس نقص نے بیچارے کو ساری عمر

چین نہ لینے دیا - جہاں گئے وہاں والوں سے ان بن رہی اور ایک جگہ اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا —

انھیں بارہ برس کے سن سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا تھا - اس فن کے لئے دل و دماغ بھی مناسب و موزوں ودیعت ہوا تھا - شعر کہتے اور خوب کہتے تھے - اس فن میں کسی مقامی شاعر کے شاگرد تھے - بہر نوع فضل ان پڑھ شاعر تھے اور اپنے ہم جنس شعرا میں پایہ امتیاز رکھتے تھے - جس طرح اور ان پڑھ شعرا حافظے کے تیز اور زود گو ہوتے ہیں ان میں یہ وصف نہ تھا - کم کم شعر گوئی کا اتفاق ہوتا - جو کچھ کہتے کسی سے لکھوا لیتے - بعض اوقات ایسے وقت طبیعت حاضر ہوتی جب کوئی لکھنے والا نہ ہوتا تو اشعار حافظے سے اُتر جاتے - ان موقعوں پر ان کی جھلاہٹ دیکھنے کے قابل ہوتی - ان میں فصاحت کا عنصر بہت کافی تھا - جب باتوں کا لچھا باندھتے تو سننے والے الف لیلہ کی دل چسپ کہانیوں کو بھول جاتے - جس صحبت میں جاتے عزت کے ہاتھوں لئے جاتے - کبھی کبھی طبیعت داری اور مزاج کی شوخی بداخلاقی کا موجب ہو جاتی اور یہ دوسروں کے چیدہ اشعار بطور تفریح اپنے نام سے پڑھ دیا کرتے —

یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق ان کے اس عیب کو مشتہر کیا ہے —

انھوں نے ایک مرتبہ فکر معاش سے تنگ آکر لکھنؤ کو خیر باد کہا اور ساماں سفر سے آراستہ ہوکر " دہلی " کا عزم کیا اُن دنوں شاہان مغلیہ کی حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا - ملک پر انگریزوں کا قبضہ تھا لیکن اورنگ حکمرانی پر ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی برائے نام جلوہ گستر

تھے - قلعہ کے باہر ایسٹ انڈیا کی حکومت اور قلعہ کے اندر بادشاہت کا دور دورا تھا - قدامت پرستی کے اُصول پر معمولاً دربار آراستہ ہوتا ' اراکین جمع ہوتے ' احکام نافذ اور انعامات و خطابات کی تقسیم ہوتی -

اکبر شاہ ثانی کو شاعری کا اتنا شوق تو نہ تھا جو اُن کے والد شاہ عالم ثانی " آفتاب " یا اُن کے خلف دوم بہادر شاہ " ظفر " کو تھا لیکن دستور قدیم کے موافق شاعروں کی قدردانی و حوصلہ افزائی فرماتے - گاہ بگاہ خود بھی میدانِ سخن کا جام نوش کرتے - مقطع میں اپنا تخلص " شعاع " جو آفتاب کی مناسبت سے ہے نظم کرتے - اس فن میں فخر الشعرا میر نظام الدین ممنون کو شرف اصلاح عنایت ہوا تھا - شعرائے وقت میں شاہ نصیرالدین ' نصیر ' غالب علی خاں ' سید ' آشفتہ وغیرہم درباری شاعر تھے - اسی زمانے میں فضل بھی وارد دہلی ہوئے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ موزوں کرلیا تھا ' کوشش کرکے دربار میں رسائی پیدا کی - اگرچہ وہاں بھی بعض ان پڑھ شاعر موجود تھے لیکن ان کی شاعری اس حد پر نہ تھی جو فضل کے مقابلے میں لائی جاتی - ہر شاعر کو ان کی بے علمی اور پختہ کلامی پر تعجب تھا - خصوصاً دربار میں جب قصیدہ پڑھا تو لوگ حیرت زدہ ہوگئے ! شاہ اکبر نے ان کا کلام بے حد پسند کیا - قصیدے کے صلے میں خلعت فاخرہ اور وحیدالعصر افضل الشعرا خطاب عطا کرکے امتیاز و اعزاز بخشا - اس روز سے فضل بھی شعرائے دربار کے زمرے میں داخل ہوکر وظیفہ خوار ہوگئے لیکن وہی نقص لاف زنی جس کا مذکور ہوچکا ہے باعث بے لطفی ہوا - شعرائے دہلی نے ان کی باتوں کو نا پسند کیا اور آپس میں نزاع پیدا ہوئی جس کا خاتمہ فضل کے اخراج پر ہوا اور انہیں چار و ناچار ملازمت ترک

کرکے مرشدآباد کا طول و طویل سفر اختیار کرنا پڑا جہاں دہلی سے زیادہ قدر و منزلت ہوی - نواب ناظم نے فوراً خلعت و انعام دے کر درباری شعرا میں شامل کرلیا اور رفتہ رفتہ مصاحب خاص ہونے کی عزت حاصل ہوگئی - اطمینان ہوتے ہی انہیں زمین شعر میں مضامین تازہ بتازہ کے باغ لگانے کا کافی موقع ہاتھ لگا - ہر عید بقر عید میں قصائد کا صلہ پاتے اور سرکار نظامت کے عروج و ترقی کے لئے دست بہ دعا رہتے —

اس زمانے میں جانعالم 'اختر' مٹیا برج (کلکتہ) میں مقیم تھے - بیس ہزار سے زیادہ نمک خوار دامن دولت سے وابستہ تھے - برق' بحر' قلق' اسیر' یاور اور صدہا شعرا کا مجمع تھا - شاہزادوں کے یہاں مشاعرے منعقد ہوتے' شعر و سخن کا چرچا رہتا - مولوی عبدالغفور خاں 'نساخ' بھی کلکتے ہی میں موجود تھے - فضل بھی گئے اور شعرا کے گروہ میں شعر خوانی کرکے داد کلام حاصل کی - وہاں کے اساتذہ سے صحبتیں رہیں بڑے بڑے معرکہ خیز مشاعروں میں شریک ہوئے - مولوی عبدالغفور خاں 'نساخ' سے بھی مراسم دوستانہ پیدا کئے - جب تک کلکتے میں قیام رہا شعر و شاعری کا چرچا رہا - افسوس! اس ان پڑھ و خطاب یافتہ شاعر نے عین عالم شباب میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر عالم ہستی کو وداع کیا - اس سے زیادہ افسوس کے قابل یہ امر ہے کہ ایسے طبیعت دار شاعر کا کلام بھی دستبرد زمانہ سے تلف ہوگیا اور آج اس کی یاد تازہ کرنے کے لئے بجز ان چند بیتوں کے کچھ نہیں جو ناظرین تذکرہ کی ضیافت طبع کے واسطے درج تذکرہ ہوتی ہیں —

کبھی تو چشم عنایت حضور کی ہوگی کبھی تو ہم بھی نکالیں گے حوصلہ دل کا

اے 'فضل'! خاک قبر بھی برباد ہو چکی نکلا نہ اس کے دل سے ابھی تک غبار حیف
اودی و مسی اس کی، کہ مینے پہ حرت ہے لب وہ، کہ لعل کے بھی نگینے پہ حرت ہے

---

دل خیال زلف سے اس کی زبس رنجور ہے صبح محشر بھی مجھے شام شب دیجور ہے
جس جگہ جا بیٹھنا، ناصح کو کچھ کہنا ضرور کیا کرے عادت سے وہ بیچارہ خو مجبور ہے

چارہ گر کس کو نکالے، کس کو چھوڑے کیا کرے
ہر دھان زخم میں سو فاراک مستور ہے

---

# ترکوں کی اسلامی خدمات

( ایک خطبہ جو جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد میں پڑھا گیا )

نوشتہ ڈاکٹر جولیس جرمانس

مترجمہ

مولوی سید وہاج الدین صاحب ، لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد

( ڈاکٹر جولیس جرمانس ~~ایچ~~ پروفیسر ہیں یونیورسٹی میں علوم اسلامی کے پروفیسر ہیں - کچھ عرصہ ہوا ریاست حیدر آباد دکن کی طرف سے سر راہندر ناتھ ٹیگور کی درخواست پر ان کی یونیورسٹی شانتی نیکیتن میں اسلامیات کی ایک پروفیسری قائم کی گئی تھی - ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمات تین سال کے لئے سر راہندر ناتھ ٹیگور نے اپنی یونیورسٹی کے لئے مستعار لیں - ڈاکٹر صاحب ترکی اور عربی زبانوں کے عالم اور اسلامی تہذیب و شائستگی اور مذہب کے ماہر دلدادہ ہیں - بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اچھے خاصے مسلمان ہیں - جامعۂ عثمانیہ کی درخواست پر انہوں نے تین توسیعی لکچر حیدرآباد میں دئے جو نہایت پسند کئے گئے اور بڑے شوق سے سنے گئے پہلے لکچر کو جس کا ترجمہ اس وقت شائع کیا جارہا ہے اگرچہ بظاہر رسالہ "اردو" کے مقاصد سے کوئی تعلق نہیں لیکن کسی قوم کی زبان و ادب کو بخوبی سمجھنے کے لئے اس کی نسلی حقیقت اور اس کے تمدن و تہذیب اور مذہب کا جاننا ضروری ہے - گویا یہ لکچر مقدمہ ہے آیندہ دو لکچروں کا جو ترکی زبان و ادب کے متعلق ہیں —

پروفیسر صاحب موصوف کی نظر اس مبحث میں بہت وسیع

اور قائل ہے اور انھوں نے ترکوں کے تمدن اور ان کی زبان و ادب کی کیفیت اس دلآویزی اور جامعیت کے ساتھہ بیان فرمائی ہے کہ متعدد کتابوں کے پڑھنے کے بعد بھی یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی - یہ گویا ڈاکٹر صاحب کے وسیع مطالعہ اور ایک مدت کے غور و خوض کا نچوڑ ہیں —

ہم ڈاکٹر جرمانس کے نہایت ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی خاص عنایت سے ان لکچروں کا ترجمہ " اردو " میں شایع کرنے کی اجازت دی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ " اردو " کے ناظرین انھیں بڑے شوق اور غور سے مطالعہ فرمائیں گے اور ان معلومات سے مستفید ہونگے جو انھیں اردو میں تو کیا کسی دوسری زبان میں بھی اس طرح یکجا نہیں ملیں گی —

ان لکچروں کے عمدہ ترجمے کے لئے ناظرین کو مولوی سید وہاج الدین صاحب بی اے بی ٹی کا شکر گزار ہونا چاہئے جو ایسے وقت پر اکثر ہمارے کام آتے ہیں — [ اڈیٹر اردو ]

وسط ایشیا کا بے آب وگیاہ کوہستان جو ہمیشہ سے خانہ بدوش اقوام کی جولان گاہ رہا ہے ' غالباً ان نسلوں کا بھی اصلی وطن ہے جنھیں اگرچہ ہم عام طور پر ' ترک ' کہتے ہیں ' لیکن جو نسلی خد و خال اور عادات زندگی نیز اشتراک زبان کے اعتبار سے منگولوں سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں ' ان ترکوں کی تاریخ تحریری دستاویزات سے بھی قدیم تر ہے - اور انسانیاتی ( Anthropological ) اور لسانیاتی ( Linguistic ) حیثیت سے نسلوں کی جو تقسیم اور درجہ بندی کی گئی ہے ' اس سے بھی بہت پہلے ان کا اثر ایشیا کی تاریخ میں نظر آتا ہے - چینی زبان کے تاریخی وقائع میں ' ہیں ان کا ذکر سنہ ۱۲۰۰ قبل مسیح

میں ملتا ہے ' اور دوسری صدی قبل مسیح ہی میں 'ہمیں ان کے گروہ چین کی شمالی سرحد پر تاخت و تاراج کرتے نظر آتے ہیں 'جو گویا ان کی آیندہ تاریخ کا پیش خیمہ تھا - یہ " ہیونگ نو " ( Hiung - Nu ) ' جو غالباً آگے چل کر از منہ وسطیٰ میں ہن ( Huns ) کہلائے ' اور " یوئن یو ئن " ( Yuen Yuen ) جو عاید بعد میں " اوار " ( Avar ) اور توکیو ( Tu-kiu ) کے ناموں سے معروف ہوئے ' جنگجو قبیلے تھے ' جو آپس میں متحد ہو کر کسی طاقتور سردار کی ماتحتی میں ' بیگانوں اور یگانوں دونوں کے خلاف لوٹ مار کیا کرتے تھے - اس زمانہ میں ان کے گروہوں میں کسی طرح کا قومی یا نسلی احساس موجود نہ تھا ' بلکہ ان من چلوں کی صفوں میں اکثر غیر ترکی عناصر بھی موجود رہا کرتے تھے ' اور ان کے دوش بدوش لڑتے تھے - چونکہ پاستانیوں کی طرح سے از منہ وسطیٰ کے باشندوں کے کان بھی باریک لسانیاتی فرقوں سے آشنا نہ تھے ' بلکہ وہ صرف دوسروں کے مسلک زندگی اور عادات و خصائل ہی پر توجہ کرتے اور انہی کی بنا پر ان کے نام مقرر کرتے تھے ' اس لئے ' بجائے اس کے کہ وہ لسانیاتی نقطہ نگاہ سے ان قبیلوں کا کوئی نام تجویز کرتے ' انھوں نے انہیں " سی تھی ین " ( Scythians ) یا " ہیونگ - نو " ( Huing - nu ) یا " ترک " کہا - ان قبائل کی کوئی مشترک زبان نہ تھی - " یورالی " ( Uralian ) " ایرانی " " منگولی " تینوں زبانیں ان کے جرگوں میں بولی جاتی تھیں - لیکن ان کی داخلی تنظیم ' اور ان کا ابتدائی مسلک آتش پرستی جس نے رفتہ رفتہ " شامانیت * ( Shamanism ) " بدھ مت "

---

* ایک مذہبی فرقہ ہے ' جس میں سحر پرستی اور ارواح پرستی کی جاتی ہے ' یہ اب بھی وسطی اور مغربی ایشیا کے بعض حصوں میں پایا جاتا ہے - شامان روح اعلیٰ ہے ' جس کے تابع دوسری ارواح خبیثہ ہوتی ہیں ۱۲ - مترجم

اور بعد کو " مسیحیت " اور اسلام کی شکل اختیار کی، علاوہ بریں ان کی نسلوں میں نئے خون کی آمیزش اور پھر ان کی مخصوص خانہ بدوشی کی زندگی - یہ سب باتیں ان میں اور ایرانی آباد کاروں، چین کے چاول بونے والوں، ہندوؤں، اور یورپ کے مسیحی آریاؤں کے درمیان مابہ الامتیاز تھیں - ان کی اس داخلی تنظیم کو، جس کا مرکز ایک ایسا سردار ہوتا تھا جو اپنے ماتحت متحدہ قبائل پر مطلق العنانی کے ساتھہ حکومت کرتا تھا، اور جس کی معاشی اور سیاسی حیثیت صرف یہ تھی کہ یہ لوگ زرخیز خطوں کو رعایا پر تصرف اور غلبہ حاصل کرکے انھیں تو صنعت و حرفت کے پر سکون مشاغل سپرد کر دیتے تھے اور خود اپنی توجہ تمامتر انتظامی امور پر مبذول کرتے تھے، ہم تورانی تنظیم کہہ سکتے ہیں - واضح رہے کہ یہ لفظ تورانی کسی لسانیاتی مفہوم پر دلالت نہیں کرتا، اس لئے کہ اس اصطلاح میں اکثر یورل الطائی ( Ural - Altain ) اور آرین باشندے بھی داخل تھے، بلکہ ایرانیوں، اور ان مستقل زندگی بسر کرنے والے شہری باشندوں کے بالمقابل جو اپنا ایک الگ مسلک، اپنی علیحدہ دینیات اور اپنی ایک مخصوص معاشرتی تنظیم رکھتے تھے، تورانیوں کی اصطلاح ان خانہ بدوش جرگوں پر حاوی ہے جو ہمیشہ ایک مرکز پر مجتمع ہوتے، پھر بکھرتے، پھر جمع ہوتے رہتے تھے، اور جن کا اپنا کوئی خاص تمدن نہ تھا، بلکہ جن باشندوں سے ان کا سابقہ رہتا تھا ان کے اجزاے تمدن کا ایک خاصہ معجون مرکب تھا - حکمراں طبقہ کی زبان عموماً ترکی ہوتی تھی - گمان غالب یہ ہے کہ اتیلا * ( Attila )

---

* ہنوں کی جماعت کا سردار، پانچویں صدی عیسوی میں گزرا ہے، یہ لوٹ مار کرتا ہوا جرمنی اور فرانس تک پہونچ گیا تھا - ۱۲ - مترجم

بیان ( Bayan ) ' بلکہ شاید چنگیز خان کی مادری زبان بھی ترکی ھی تھی - اس کا ایک ثبوت یہ ھے کہ ان کے تمدن کے جو چند تحریری آثار آج تک موجود ھیں ' مثلاً وی اینا ( Vienna ) کے عجائب خانہ میں ' اتیلا ' کے سونے کے ظروف وغیرہ ' ان پر ترکی کتبے موجود ھیں ' اس کے علاوہ ' " اورخان " ( Orkhan ) اور ' ینی سی ' ( Yenisey ) کے کتبوں کی زبان بھی ترکی ھی ھے —

اپنی اسی حد درجہ بے چین اور سیال معاشرت ھی کی بدولت تورانی حدود چین سے لیکر مشرقی یورپ تک دھاوے مارتے رھتے تھے ' اور چونکہ اثر قبولیت بھی ان کی معاشرتی خصوصیت خاصہ تھی ' اس لئے انھوں نے تمام تمدنوں کا رنگ قبول کیا - نسطوری مسیحیت اور ایرانی مجوسیت کو چین تک پہونچانے والے یہی لوگ تھے ' خشکی کے راستہ چین اور ھندوستان کے درمیان آمد ورفت کا سلسلہ بھی انھی کی بدولت قائم ھوا ' اور آگے چل کر سر زمین یورپ میں اسلام کا بیج بونے والے بھی یہی ھوے —

ولادت مبارک آنحضرت صلعم کے زمانے میں یہ لوگ ' بازنطین ' ( Byzantium ) کو ' چین ' کے ریشم کی برآمد کیا کرتے تھے ' اور اسی تجارت کی وجہ سے ان میں اور ایرانیوں میں تصادم ھوا ' انھوں نے ' بازنطین ' اور ' حبش ' کے ساتھہ سمجھوتا کرلیا - کتنی حیرت انگیز بات ھے کہ ' جاپان ' کے قدیم ترین بودھہ مت کے مندر میں ایرانی اشیاء موجود ھیں ' جنھیں ایشیاء پار لانے والے یقیناً یہی ترکی کاروان ھوں گے —

تورانیوں کی ریاستوں کی بنیاد ھمیشہ شخصی نفوذ اور سطوت پر ھوا کرتی تھی - چونکہ ان کے گروھوں میں دو براعظموں کے باشندے داخل تھے ' اس لئے انھوں نے کبھی بھی کوئی قومی شکل اختیار نہیں کی - لیکن اگر

کوئی اولوالعزم شخصیت نظر آجاتی تو اس کی اطاعت یہ لوگ دل و جان سے کرتے ' اس کی ساتھتی میں ایک مرکز پر جمع ہوجاتے - اور ایک جری ' اور جوال ' اصول حرب کی ماہر ہستی کا خیمہ ہی سلطنتوں کا محور بن جاتا - ترک اطاعت اور قیادت دونوں کے گروں سے بخوبی واقف تھے ' اور ایک باعزیمت ہستی کی کشش بات کی بات میں لاکھوں ترکوں کو مطیع اور فرمانبردار بنا دیتی تھی - تورانی سلطنت کے انحل بے جوڑ عناصر کی شیرازہ بندی کرنے والی ہمیشہ کسی ایسے ہی صاحب قوت و ارادہ فرد کی ذات ہوا کرتی تھی ' اور جب کبھی اس شخصیت کا اثر مٹتا ' یا کوئی دوسری قوی تر شخصیت اس کی مد مقابل ہو جاتی ' تو سلطنتیں جس آسانی سے بنی تھیں اسی سرعت کے ساتھ متزلزل ہو جاتیں ' اور ان کی بنیادوں پر دوسری سلطنتیں قائم ہوجاتیں - تورانیوں کے مزاج پر ان کے مخصوص جغرافی طبعی حالات اور ان کی تاریخ کے نقوش اتنے گہرے بیٹھے ہیں کہ آسانی سے مٹ نہیں سکتے - چنانچہ آپ ان کی صدیوں کی تاریخ پڑھ جائیے ' آپ یہی دیکھیں گے کہ تورانی باشندوں کی سیاسی تشکیل ہمیشہ ایک سی رہی ہے ' یعنی مخوت آبادی پر مسلح معسکر کی حکومت ' اور اس حکومت سے ہمیشہ ایک مرکب تمدن پیدا ہوا ہے ' جو بجائے اس کے کہ قوم سے منسوب ہو ' بانی خاندان کے نام سے معروف ہے - واقعہ یہ ہے کہ تورانی اقوام ہمیشہ بڑی بڑی شخصیتوں کے ناموں سے معروف رہی ہیں —

تورانی نوجوان ہمیشہ ایک زبردست " شخصیت " پیدا کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا - واضح رہے کہ شخصیت کا مفہوم ان کے یہاں ہندوؤں کی طرح سے گیان دھیان کرنے والی اور مادی دنیا کو تج کر ذات مطلق میں

ضم ہو جانیوالی ذات کا نہ تھا ' شخصیت سے مراد ان کے یہاں ' جنگجویانہ فعالیت ہوا کرتی تھی : یعنی فتح وتسخیر ' حکومت ' عمل ' اور اگر سیاسیات بھی ایک طرح کی فعالیت ہی ہے ' تو ماننا پڑے گا کہ ترک پیدائشی سیاست دان تھے ' اور ایک اکیلی ان کی قوم نے جتنی سلطنتوں کو مٹایا اور قائم کیا ہے ' اس کی نظیر دنیا کی کوئی اور سلطنت نہیں پیش کر سکتی - مثلاً ' سلجوقوں ہی کو دیکھ لیجئے کہ وہ ایک غیر معروف خاندان کی حیثیت سے منصہ شہود پر آتے ہیں اور اپنی خوش بختی اور جانبازی کی بدولت تین سلطنتوں کو اپنے زیرنگیں کر لیتے ہیں- اور پھر ان کی مثال کو سامنے رکھکر ایک اور ترکی قبیلہ یعنی ' غزنویہ ' ہندوستان میں اپنی سلطنت کا پایہ رکھتا ہے - ترکی سورما ہمیشہ ہر بطل اعظم کو صدا پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے تھے ' اور اگرچہ انھوں نے ' ایران ' ' شام ' ' ایشیائے کوچک ' ہندوستان ہر جگہ اپنی سلطنتیں قائم کیں ' لیکن اپنی قومیت کی طرف سے انھوں نے اتنی بیگانہ منشی برتی کہ ایرانی تمدن کو اختیار کرلیا اور ایرانی المذاق بن گئے- کیا بوالعجبی ہے کہ ' شاہ نامہ ' جس میں تورانیوں کے مقابلہ میں ان کے حریف ایرانیوں کے رزمیہ کارناموں کو زندہ جاوید بنایا گیا ہے ' ایک ترکی النسل بادشاہ کی سرپرستی میں لکھا جاتا ہے ' اور ایشیائے کوچک کے سلجوق بادشاہوں کے محلوں میں فارسی کے اشعار آبدار کندہ نظر آتے ہیں !

یہ سلجوق ترکوں ہی کا کارنامہ ہے انھوں نے شام کے صلیبی مبارزوں کے مقابلہ میں عباسیہ کی زوال آمادہ سلطنت کو سنبھالے رکھا ' اور ایشیائے کوچک

میں سلطنت قائم کی ' جس نے دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک اسلامی تمدن کے بیج وہاں بوئے - " قونیہ " میں ( جس کا قدیمی نام " آئی کونی " یم تھا ) " سینٹ پال کے غاروں سے صرف چند میل کے فاصلہ پر ایک سبز گنبد کے نیچے ' ایران کے بزرگ ترین شاعروں میں سے ایک شاعر - یعنی " مولانا جلال الدین رومی رح " دفن ہیں - سلجوقوں کے مدرسے اور محل ' جن کا طرز تعمیر ایرانی ہے ' اور بازنطینی یونانی فن تعمیر کی آمیزش لئے ہوے ہے ' آج تک ان کے اعلیٰ اور شستہ مذاق اور علم و فن کی سر پرستی کی یاد تازہ کئے ہوے ہیں —

بازنطینی سلطنت ' جو مشرق میں مسیحیت کا بعید ترین ناکہ تھی ' فرقہ وارانہ جنگوں کی بلا میں گرفتار اور ایسی بد نظمی کا شکار تھی جس کی نظیر مشکل سے ملے گی جبری محصولوں ' دربار کی عیاشیوں اور سفارش گردیوں * نے اس سلطنت کو ' جس کا شمار کسی زمانے میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں ہوتا تھا ' ساری قوتوں کو چوس لیا تھا ' اور اگر یہہ اپنی سخت جانی سے ایک مدت دراز تک سنبھالے لیتی رہی ' تو اس کی وجہ یہہ نہ سمجھنا کہ اس میں اندرونی طور پر کچھہ جان باقی تھی ' بلکہ صرف رعایا کا جمود ' اور بعض جنگ جو قیصروں کی عارضی کوششیں اس کے ڈھچر کو سنبھالے ہوے تھیں - اس کا انجام بد یقینی تھا ' اور اس کے زرخیز علاقے اور بد دل باشندے خدا سے چاہتے تھے کہ کوئی فاتح آے اور ملک میں نظم و نسق

---

* ہم نے یہہ ترجمہ انگریزی لفظ Favouritism کا کیا ہے ' شاید سند قبول حاصل کرے ۱۲ مترجم —

اور ضبط قائم کرے —

منگولوں کے حملہ کی آندھی نے ' جو اسی قسم کی اور آندھیوں کی طرح ' " چین " کے حدود سے اُٹھی ' اور کوہ " ایلپس " تک بڑھتی چلی گئی ' سارے " ایشیا " کو تہ و بالا کر ڈالا ' کچھہ قومیں تو بالکل ھی نیست و نابود ھوگئیں ' بعضوں کے پاؤں اکھڑ گئے ' ترکوں کے چھوٹے چھوٹے جرگے بھی ' جن کا تعلق " کے خان " ( Kay khan ) کے قبیلہ سے تھا ' اسی کی رو میں " کوہ قاف " کے پار ایشیائے کوچک تک پہونچ گئے ' یہاں پہونچکر انھوں نے " علاؤالدین کیقباد " سلجوق کے دربار میں پناہ لی ' جس نے ان کی خدمات کے صلہ میں انھیں " انگورہ " کے پاس متوطن ھونے کی اجازت دیدی - مزید خدمات کے معاوضہ میں ' ان کی جاگیروں میں اضافہ کیا گیا ' جو ایشیائے کوچک کے مغرب رخ واقع تھیں - " انا طولیہ " میں ' سلجوقیوں کی سلطنت کی آخری ساعت آن لگی تھی - جب منگولوں نے تازہ دم ھوکر اس پر دوبارہ تاخت شروع کی ' تو ماتحت امرا اور جاگیرداروں نے سلطنت کا ساتھہ نہ دیا ' بلکہ اس تاک میں رھے کہ موقع ملتے ھی کچھہ علاقہ دبا بیٹھیں - " کے خان لی " ترکوں نے بھی ایشیائے کوچک کے شمال مغربی سواحل پر یونانیوں کے کچھہ قلعے تسخیر کر لئے ' اور کمال ھوشیاری کے ساتھہ بعض مقامی عیسائی جاگیرداروں کے ساتھہ ساز باز کر کے " عین گل " " بلے جیک " اور " یار حصار " پر قبضہ کر لیا - رفتہ رفتہ " کے خان لی " قبیلہ کا شمار زوال آمادہ سلجوقی سلطنت کے زبردست ترین جاگیرداروں میں ھونے لگا —

اپنے پیش رووں کی طرح ' جنھوں نے ایشیائے کوچک میں بود و باش

اختیار کرلی تھی ' " کے خان لی " بھی ترک ھی تھے ' البتہ ان کی بولی ذرا اُن سے مختلف تھی - ایک اور فرق یہہ تھا کہ سلاجقہ تو صدیوں سے اسلام لا چکے تھے ' لیکن یہہ نووارد ھنوز اپنے قدیم ' خانہ بدوشی کے زمانہ کے ' مسلک پر قائم تھے - ان کے سردار " ارطغرل " کے بیٹے " عثمان " کی شادی کے متعلق جو روایت مشہور ھے ' اس سے ھمارا یہہ قیاس حق بجانب ھے کہ انھوں نے ایشیاے کوچک کی اسلامی فضا میں داخل ھونے کے بعد اسلام قبول کیا - " عثمان " نے سنہ ۱۳۰۰ ع میں سلجوقی سلطنت کے جوے کو اتار پھینکا ' اور یونانیوں کو پسپا کرتا ھوا آگے بڑھا ' سنہ ۱۳۲۶ ع میں اس کا انتقال ھوا ' اور اس وقت اس کی سلطنت کی حدود جنوب میں " قتیہہ " شمال میں بحر " مار موره " اور " سقاریہ " اور " ادرانوس " کی وادیوں تک پھیلی ھوئی تھیں ' اور اس کی ساری قلمرو میں نظم و نسق بخوبی قائم ھو چکا تھا —

سلجوقیوں کے زوال کے بعد ' " قرامان اوغلو " ان کی مملکت کا وارث جائز بن بیٹھا تھا ' لیکن متعدد جاگیرداروں نے اس کی شہنشاھیت کو تسلیم نہیں کیا ' اور خود مختار ھوگئے - " اے دین " " ساروخان " " منتشہ " " قرمیان " اور کئی دوسرے باجگزار امیروں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنے الگ دربار جمالئے تھے ' وادیوں میں ترکمان قبائل گشت کرتے پھرتے تھے - چونکہ " عثمان لی " خاندان نے عروج پاکر شمال مغرب میں اپنی بنیادیں مستحکم کرلی تھیں ' اس لئے جغرافی محل وقوع کے اعتبار سے اسے اپنے دوسرے حریف قبائل پر تفوق حاصل تھا ' جو فوجی قوت کے اعتبار سے اس سے بڑھے ھوے تھے - " قرامان لیون " کا راستہ سمندر کی طرف بند تھا ' اور چونکہ وہ گرد و پیش حریفوں میں گھرے

ہوے تھے ' اس لئے ان کی حدود میں توسیع کی گنجائش نہ تھی ' باقی رہے ' " اے دین " " منتشہ " اور " قرمیان " کے قبائل ' تو ان کا محل وقوع سمندر کے بالکل نزدیک تھا ' اور اگر وہ ادھر ادھر ہاتھہ بڑھاتے ' توصلیبی مبارزین ان کی تعزیر کے لئے موجود تھے - " عثمانی " یا " عثمان لی " جو دوسرے ترکوں کی طرح سے ' آئندہ اپنے بہادر سردار (عثمان) کے نام سے موسوم ہوے ' اناطولیہ کے زرخیز ترین علاقوں میں آباد تھے ' اور بازنطینی سلطنت کے دارالسلطنت کے پڑوس ہی میں تھے - یورپ کے صوبجات تک ان کی رسائی بہت آسان تھی ' جہاں کی رعایا حکومت کے جبر و تعدی سے اس حد تک عاجز آگئی تھی کہ اب نہ تو ان میں مقاومت کی تاب ہی تھی ' اور نہ اس کا کوئی خیال - ' عثمان ' اور اس کے جانشین ' اورخان ' اور ' مراد ' اگر چاہتے تو لالچ میں آکر ایشیاے کوچک کو بہت آسانی کے ساتھہ فتح کرلیتے اور سلجوقی سلطنت کے وارث بن سکتے تھے ' لیکن اس پالسی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انہیں اپنے حریفوں کے ساتھہ تباہ کن لڑائیاں لڑنی پڑتیں ' اور چونکہ ان کے پاس مشرق اور جنوب میں فوجی نقل و حرکت کے لئے کوئی مرکز نہ تھا ' اور نہ کوئی بیڑہ تھا ' اس لئے بازو کی طرف سے آکر ایجین ( Aegian ) ترک انہیں گھیر لیتے ' غرض کہ یہ پالسی عثمانی خاندان کے حق میں پیام مرگ ثابت ہوتی - سلجوقیوں کے دارالسلطنت کا محل و قوع ' یعنی ایک طرف بحیرہ ' مارمورا ' اور دوسری طرف وسط ' اناطولیہ ' کا کوہستان - ایسا تھا کہ اگر کوئی اسے فتح کرنا چاہتا تو اسے چکر کاٹ کر آنا پڑتا - غرض کہ مشرق کی طرف کے حریفوں سے بے خدشہ ہوکر ' عثمان لیون نے بلقان کو اپنی تگ وتاز کا مرکز قرار دیا - بہت پہلے ہی ' یعنی سنہ ۱۳۶۶ ع میں ' وہ دھاوے مارتے اور لوٹ مار کرتے ہوئے دریاے ' ڈینیوب ' کے نشیبی حصہ تک پہونچ چکے تھے اور ' لوی آت آن ژو ' کو

اس بری طرح شکست دے چکے تھے کہ وہ بمشکل اپنی جان سلامت لیکر بھاگ سکا تھا - 'فلپا پولس' اور 'ادرنہ' اس سے بھی چند سال پہلے * ان کے ہاتھہ میں آچکے تھے —

'بروسا' صرف چالیس سال تک اس نوخیز سلطنت کا دارالخلافہ رہا' اور اس کے بعد مرکز ثقل جزیرہ نمائے بلقان کی طرف منتقل کردیا گیا جہاں 'ادرنہ' ان کا دارالخلافہ قرار پایا - اس کار روائی نے 'یورپ' کو سراسیمہ کردیا' اور وہ بدحواس ہوکر عثمانیوں کو نکالنے کے لئے فوجیں جمع کرنے لگا' لیکن دوسری طرف ان کے ایشیائی حریفوں کو اس کا گمان بھی نہ تھا کہ یہ (ترک) آئندہ چل کر ان کے حق میں کتنے خطرناک ثابت ہوں گے' اور وہ ان کی طرف سے بالکل مطمئن تھے - یہاں تک کہ سنہ ۱۴۵۳ ع میں' 'قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد' 'سلطان محمد فاتح' نے اپنی ظفر یاب عساکر کی عنان اناطولی حکمرانوں کی طرف بھی پھیر دی —

عثمانی فتح و ظفر کا یہ سیلاب بے مزاحمت برابر آگے بڑھتا گیا سنہ ۱۴۹۲ ع میں انہوں نے 'استیریا' + (Styria) کو تاخت و تاراج کیا اور اس طرح اگر ایک طرف 'اندلس میں اسلام کا آخری مرکز' مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا' تو دوسری طرف اسی زمانے میں ترکوں نے اپنی فتوحات سے اس کی بخوبی تلافی کردی - ادھر 'اندلس' میں مور جنگ 'تورز' (Tours) میں ہزیمت اٹھانے کے بعد 'ہسپانیہ' کے قصبوں میں منتشر

---

* 'سلطان مراد اول' نے 'ادرنہ' سنہ ۱۳۶۱ ع میں تسخیر کیا تھا' اور سنہ ۱۴۵۳ ع میں فتح 'قسطنطنیہ' کے زمانے تک یہی مقام ترکوں کا دارالخلافہ رہا — ۱۲ - مترجم -

+ یہ سلطنت آسٹریا کا ایک صوبہ تھا - ۱۲ مترجم —

ہوکر اسلامی تعلیم کے فروغ و نشو و نما میں مشغول تھے ' ادھر مشرق میں یورپ کا نیا دشمن ' یلغار کرتا ہوا ' وی اینا ( Vienna ) کے دروازوں ' بحیرۂ اوقیانوس اور بحیرۂ اسود کے شمالی سواحل تک بڑھ گیا تھا ' خصوصاً ' فتح مصر ' کے بعد تو ترکی سلاطین کے کلاہ تفاخر میں " خادم الحرمین الشریفین " کا طرۂ امتیاز بھی لگ چکا تھا - غرض کہ دو صدی کے اندر اندر ' ایک چھوٹے سے دیہاتی قبیلہ نے یہ عروج حاصل کیا کہ اب اس کا شمار دول عالم میں ہونے لگا تھا ' اور اس کی سلطنت اپنی وسعت ' قدرتی وسائل کی مالا مالی اور تمدن کی بوقلمونی کے اعتبار سے تاریخ عالم کی بزرگ ترین سلطنتوں کی ہم پایہ ہو چکی تھی - اگرچہ مذہبی اور تمدنی حیثیت سے سلطنت ترکی اسلامی تھی ' لیکن وسط ایشیا کے علاف زاروں کی ساری خو بو اس میں موجود تھی - اس کی رعایا میں یونانی ' کرد ' ایرانی ' عرب ' البانی ' سلاوی ' ہنگروی ' جرمن غرض کہ سب ہی ملکوں اور ملتوں کے باشندے داخل تھے - ترک کا نام ہی ہیبت پیدا کردینے کے لئے کافی تھا ' اور انہیں شکست دینا یا ان کی قوت کو تباہ کرنا ایک ناممکن امر سمجھا جاتا تھا - لیکن جو چیز انسانی کوششوں کے لئے امر محال تھی ' زمانہ کے ہاتھوں پوری ہوکر رہی ' امتداد زمانہ اور توارث نظام حکومت کی اندرونی خامیاں ترکوں کی قوت کو توڑ کر رہیں - سنہ ۱۶۰۰ ع وہ زمانہ تھا جب کہ عثمانی شوکت و عظمت کا آفتاب نصف النہار پر تھا ' لیکن ایک صدی بعد ہی اس کا زوال شروع ہوگیا تھا - ' ہنگری ' کے صوبجات ان کے قبضہ سے نکل چکے تھے ' اور اس کے بعد سے جلد جلد اور پے در پے ناکامیوں اور ہزیمتوں کا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوا کہ بدنصیب ترکی حکمراں کی نالایقی کو موردالزام ٹھہرانا ' یا دشمنوں کی اعلیٰ قابلیت

اور حسن تدبیر کو اس کا سبب قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا ' بلکہ ماننا پڑتا ہے کہ اصل میں یہ مرض نظم سلطنت کا تھا ' جس کی معاشرت ' طرز حکومت' اور اصلی روح کو گھن لگ گیا تھا - چونکہ ہم ایک ایسی سلطنت سے بحث کر رہے ہیں جو یورپ کی دشمن تھی ' اس لئے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کون سے اسباب تھے ' جنھوں نے عثمانیوں کے مقابلہ میں یورپ کو ضعیف کردیا تھا ' اور پھر کون سے اسباب اٹھارویں انیسویں صدی عیسوی میں اس کے (یورپ) از سر نو عروج کے محرک ہوے —

یورپ کے ضعف کے اسباب کچھ داخلی تھے ' اور کچھ خارجی - اپنے عروج کے زمانہ میں ترکوں نے جن قوموں سے لڑائیاں لڑیں ' ان کے مقابلہ میں خود ان کا (ترکوں کا) محل وقوع حربی نقطہ نگاہ سے بہت بہتر اور مفید مطلب تھا ' اور پھر ان قوموں کی سلطنت کے کل پرزے بالکل فرسودہ ہو چکے تھے ' اور وہ مساوی تعداد کی فوجوں سے بھی ' ترکوں کی زیادہ مسلح اور زیادہ جوشیلی سپاہ کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے - مسیحی یورپ آپس کے نفاق کا شکار بنا ہوا تھا - باقان کی چھوٹی چھوٹی ہمسایہ سلطنتیں ایک دوسرے پر خار کھاتی تھیں ' اور جب کبھی ان کی متحدہ فوجیں میدان جنگ میں ترکوں کے مقابلہ کے لئے اتریں ' تو کئی مرتبہ بری طرح سے شکست کھائی - حد تھی کہ سارا یورپ چالیس ہزار باقاعدہ فوج بھی ترکوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں نہ لاسکتا تھا ' جس کی جانثاری افواج کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ان سے بڑھکر میدان کا دھنی یورپ میں اور کوئی نہیں ہے - یورپ کے جاگیری نظام نے سلطنتوں کی مرکزیت کو توڑ کر ' ان میں ضعف پیدا کردیا تھا ' مغرور اور سرکش امرا قوت پکڑ چکے تھے ' اور سلطنتوں کی پالیسی ' اور حربی کار روائیوں کا انحصار

صرف انھیں امرا کے رحم و کرم پر رہ گیا تھا ' جو لڑائی کو قوموں کی زیست و موت کا سوال نہیں ' بلکہ صرف جھوٹ دکھانے کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے - ان کے مقابلے میں ترکی عساکر کی جان ' " جانثاری " تھے ' جو فطرتاً جیالے ' فوجی ضبط کے سانچہ میں ڈھلے ہوے ' سخت مزاج اور بہادر افسروں کے سدھاے ہوے کار آزمودہ سپاہی تھے ' اور کٹھ پتلیوں کی طرح ترکی سلطان کے اشاروں پر چلتے تھے - تورانی تہذیب جتلی پچکلیان تھی اتنی ہی ان کی فوجی قابلیت اور فنون جنگ پر محل اور مناسب موقع ہوا کرتے تھے - اگرچہ وسط ایشیا کے گیاہ زاروں کے حربی اصول اصل میں قدیم ایرانی حربیات سے ماخوذ تھے ' لیکن ترک ' چونکہ پیدائشی سپاہی تھے ' اس لئے ان کی تیز نگاہیں بدلے ہوے حالات کو فوراً تاڑ لیتی تھیں ' اور نئی نئی ایجادوں ' یا نئے نئے حالات کے اقتضاء سے وہ فوراً اپنے فنون جنگ میں بھی رد و بدل کردیا کرتے تھے - ترکی فوج کے پاس سارے یورپ کے مقابلے میں جدید ترین اسلحہ موجود تھے ' حالانکہ جس واحد یورپی سلطنت پر انھوں نے حملہ کیا ' اس کا ساز و سامان صرف تھوڑا بہت جدید تھا - انھوں نے توپ خانے کی اہمیت اور ضرورت کو بھی بہت جلد سمجھ لیا تھا ' اور مختلف دھانے کی توپیں ڈھالنے میں ایسا کمال دکھلایا تھا کہ کوئی قلعہ ان کی تباہ کن گولے باری کی تاب نہ لاسکتا تھا - قسطنطنیہ کے محاصرے میں انھوں نے ۴۵ سنتی میٹر دھانے کی برنجی توپیں استعمال کی تھیں - مشرقی یورپ کے تمام قلعے صرف سواروں کے حملے اور ہلکی توپوں کی گولہ باری کی رعایت سے بنائے گئے تھے ' اور اسی غرض سے ان کی دیواریں سیدھی اور اونچی رکھی گئی تھیں ' لیکن ترکوں کی بھاری توپوں کو دیکھکر ' سولھویں صدی کے آخر زمانے میں نئے اصولوں پر قلعوں کی تعمیر

ہونے لگی ' یعنی ان کی فصیلیں ڈھلواں اور نیچی بنائی جانے لگیں۔ ان فنی حیثیتوں سے بڑھے ہوے ہونے کے علاوہ ' ترک جوش شجاعت میں بھی یورپ والوں سے بدراتب زیادہ تھے ' ہر فتح کے بعد ان کی ہمتیں بلند تر ہو جاتی تھیں ' مال غنیمت ان کے ہاتھہ آتا تھا ' اور جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ان میں جوش زن ہو جاتا تھا۔ ترکوں کی پے در پے فتوحات میں ' اسلام اور اس کی مجاہدانہ تاثیر کا بہت کچھہ دخل تھا۔ پہلے وہ بت پرستوں کی حیثیت سے محض غارت گری اور نام آوری کے خیال سے لڑا کرتے تھے ' لیکن اسلامی تبلیغ و اشاعت کے بعد جوہر ایمان کی آمیزش سے ان کی شجاعت کا ایک اخلاقی نصب العین پیدا ہو گیا تھا ' اور اس سے ان کی جنگ جوی کے جوہر اور کھلتے تھے۔ ان کے شروع زمانے کے سلاطین کی تربیت بھی معسکر کی سادہ اور صحت بخش فضا میں ہو ئی تھی ' ان کے خمیر میں بھی ' اپنے سپاہیوں کی طرح ' شجاعت اور بسالت کے جوہر موجود تھے ' اور ان کی حربی قابلیت بھی اپنے تمام ہم عصر بادشاہوں سے کہیں زیادہ تھی —

جب ترکوں نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا ' تو انھیں صرف زوال پذیر بازنطینی سلطنت اور ریاست ہاے بلقان ہی سے مقابلہ کرنا پڑا تھا ' لیکن جب وسعت حدود کے اعتبار سے عثمانی قوت اپنے پورے عروج پر پہونچی ' تو اب اسے متعدد قوی تر دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حربی نقطہ نظر سے اب اس کا محل وقوع بھی کمزور ہو گیا تھا ' اس لئے کے جیسے جیسے حدود سلطنت 'انا طولیہ ' سے دور ہوتی گئیں سلسلۂ رسل و رسائل طویل ہوتا گیا۔ اُدھر ' سترویں صدی میں یورپ بھی ایک نیا جنم لے چکا تھا۔ نئی نئی ایجادیں اور اکتشافات ہو چکے تھے ' تحقیق کے علمی

اصول بن چکے تھے ' جنگ ھاے اصلاح ( Wars of Reformation ) ختم ھوچکیں تھیں ' قومی احساسات رکھنے والی مستقل قومی سلطنتیں مستحکم ھوچکی تھیں ' اور از منہ وسطیٰ کے دور جاگیریت کے کم مایہ اور نیم علم افراد کی بجاے ' اب یورپ والوں کی ایک قابل نسل پیدا ھوچکی تھی - سلطنتوں کے آپس کے سمجھوتوں اور صلح ناموں نے لشکر آرائی کا راستہ کھول دیا تھا ' اور اب باقاعدہ یورپی فوجیں ' جو فنی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کی اور روحانی اعتبار سے ترقی یافتہ ھو چکی تھیں ' ترکوں کے حق میں خطرناک اور نا قابل تسخیر دشمن بن گئی تھیں - سترھویں صدی میں امریکہ کی دریافت ' اور اس کی پیداوار کی خرید و فروخت نے بحیرہ قلزم کی بجاے بحر اوقیانوس کو دنیا کی تجارت کا راستہ بنا دیا تھا - افریقہ کا چکر کاٹ کر جانے ' اور دنیا کی تجارتی گزرگاھوں میں تبدیلی ھو جانے کی وجہ سے ترکی کی ترقی میں بہت کچھہ خلل واقع ھوا ' اس لئے کہ اب وہ ' ایک اعتبار سے ' ترقی یافتہ قوموں کے ربط و اختلاط سے محروم ھو گیا - مذکورۂ بالا اسباب نے ترکی کی طرح ' اٹلی کو بھی اقتصادی حیثیت سے نقصان پہونچایا ' لیکن اس نے پھر بھی اپنی تہذیب اور تمدن کے سرمایہ کو محفوظ رکھا ' بلکہ اس کی توقیر بھی کی ' لیکن ترکی میں ' جیسے ھی فتوحات کا سلسلہ بند ھوا ' ویسے ھی وہ اپنی مفتوحہ طبا ع قوموں کے تہذیبی سرمایہ سے بھی محروم ھو گیا ' اور اس کا تمدنی ارتقاء رک گیا .. وہ دنیا سے الگ تھلگ اور نئی ترقی یافتہ خیالات سے محروم ھو گیا ' چنانچہ ھم دیکھتے ھیں کہ یورپ کو تو ان جدید خیالات نے ھمیشہ نئی زندگی بخشی ' اور اسے مشرقی تہذیبوں

کے تقابلی مطالعہ پر آمادہ رکھا ' لیکن ترکی انہیں فرسودہ نظامات کا پابند ' اور انہیں بوسیدہ اداروں کو سنبھالے رہا - یورپ نے تو اصلاح کے بعد سے توہمانہ اور ملا یانہ خیالات کو بالائے طاق رکھہ دیا ' لیکن ترکی ایک ایسے مخصوص مراعات رکھنے والے طبقہ کا شکار بن گیا ' جس نے اسلام سے ارتقاء کی روح کو سلب کرنے کی کوشش کی —

جن داخلی اسباب نے ترکی کو کمزور بنایا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جیسے جیسے اس کی حدود میں توسیع ہوتی گئی ' ویسے ویسے رسل و رسائل کے طویل سلسلوں کی کماحقہ نگرانی ناممکن ہوتی گئی ' اور سرحدی مقامات کے ساتھہ سلسلہ اخبار و اطلاعات برقرار رکھنے کے لئے بعض درمیانی علاقوں کو ایک طرح کی نیم خود مختاری دیدی گئی ' مثلاً " گریمیا " " والیشیا " اور " ھنگری " ان کے علاوہ ' " عرب شمالی " افریقہ " " مصر " " طرابلس " اور الجزائر ' نیم خود مختار صوبجات تھے - ان صوبجات کا علاقہ وطنی حکومت ' یعنی ایشیائے کوچک کے ساتھہ کچھہ زیادہ استوار نہ تھا - جیسے جیسے سلطنت بڑھتی گئی ' اس کے باشندوں کی قومیتوں اور مذھبوں کی بوقلمونی بھی زیادہ ہوتی گئی ' جن میں اور حکمران قوم میں کوئی وجہ اشتراک نہ تھی ' اور اندرونی فاچاقیوں اور شورشوں نے ھیئت سیاسیہ کو کمزور کرنا شروع کردیا —'

سلطنت ترکیہ کے اختلال کا خاص الخاص سبب اس حس حکمرانی یا ملکہ بادشاھی کا زوال تھا ' جو پہلے حکمران کی شخصیت میں مجسم ہو کر ظاہر ہوا کرتا تھا - ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ تورانی سلطنت کا مدار تمام و کمال شخصیت پر ہوتا تھا ' اور اس قسم کا نظام حکومت ' بہت آسانی

کے ساتھہ مذہب اسلام سے میل کھا سکتا تھا ' اس لئے کہ اگرچہ اسلام کی اصلی روح جمہوریت ھی ھے ' لیکن ساتھہ ھی ساتھہ مطلق العنان بادشاھوں کا ریاست کے جملہ عاملانہ اختیارات کو اپنی ذات واحد میں جمع کر لینا بھی اسلامی اصول کے منافی نہیں ھے - خلیفہ بحیثیت اعلی ترین محافظ شریعت کے - اور سلطان بحیثیت ترکوں کے ارضی حکمران کے ' ان دونوں فرائض کے ایک ذات میں جمع ھو جانے کی وجہ سے ترکی سلطان کی شخصیت بمراتب زیادہ ھو گئی تھی ' وہ سلطنت کا مالک تھا اور ساری رعایا اس کی حلقہ بگوش تھی - ھیئت سیاسیہ کی تنظیم سے تو ھم بعد میں بحث کریں گے - سردست اسی قدر کہہ دینا کافی ھے کہ حکمران کی قوت میں ضعف کے نمودار ھوتے ھی یہ سارا ڈھچر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگا - سلطان سلیم " مست " کے زمانہ تک جتنے بڑے بڑے سلاطین گزرے ' وہ سب کے سب جواں اور جنگ جو بادشاہ تھے ' جو نظم و نسق مملکت کی باگ اپنے ھاتھہ میں مضبوطی سے لئے رھتے تھے اور بہ نفس نفیس جنگی کار روائیاں کیا کرتے تھے -- لیکن " سلیم " کے بعد جو آٹھہ سلاطین یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے ' ان میں سے پانچ تو کسی فوجی مہم میں شریک تک نہ ھوے ' بلکہ رعایا سے روپوش ھوکر حرم سرا کے اندر رھنے لگے -- ان کے ولی عہدوں اور شہزادوں کو شروع میں تو سازش کے ڈر سے قتل کر دیا جاتا تھا ' لیکن بعد کو انھیں عمر قید دی جانے لگی - ان میں سے بعض ' آئندہ چل کر تخت نشین ھوے ' لیکن چونکہ ان کی ساری زندگی خواجہ سراؤں اور دوسرے غیر ذمہ دار جلیسوں کی صحبت میں گزری تھی ' اس لئے ان میں سلطنت کا بار گراں اٹھانے کی اھلیت مطلق باقی نہ رھی تھی - سلاطین ' خائن عہدہ داروں کے ھاتھہ میں نری کٹھہ پتلیاں تھے -

رشوت، سازش، غیبت، ان سب کا اثر محل سرا تک پہونچنے لگا تھا، اور صوبجات کے والیوں نے مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر، ہر ناجائز طریقہ سے دونوں ہاتوں سے دولت سمیٹنی شروع کردی تھی - غرض باز نطینی سلطنت کی ساری شامتیں اور بیماریاں اس لاجواب ہیئت سیاسیہ پر مسلط ہوگئیں جسے ابتدائی سلاطین نے اپنی قابلیت سے قائم کیا تھا، اور ترکی قوم نے جس سلطنت کو اپنے خون سے سینچا تھا، اس کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں - نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کی توسیع یک لخت بند ہوگئی، علاقوں پر علاقے ہاتھ سے نکلنے لگے، جس سے خزانہ شاہی میں تشویش انگیز کمی واقع ہونے لگی، لیکن نا عاقبت اندیش اور رنگین مزاج عمال سرکاری کے حلقوں میں بدستور رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں- بغاوتوں، شکستوں، اور تاوانوں کی گرانباری نے غریب رعایا کو، جس کی مصیبتیں دن بدن بڑھتی جاتی تھیں، پیس ڈالا - جان نثاری افواج بھی، جو ہمیشہ سے فوج کی جان اور ترکوں کی فتح کی ضامن تھیں، بکتا شیوں اور دوسرے شورہ پشت عناصر کے ساتھ جاملیں، اور ملک کے امن و امان کے حق میں دشمن ثابت ہونے لگیں، یہاں تک سلطان محمود ثانی نے جو ایک مصلح اعظم تھا، انہیں نیست و نا بود کر ڈالا - سلطنت کا نظم و نسق، خواہ بہتر سے بہتر طریقہ ہی پر کیوں نہ کیا جاتا لیکن فرسودہ اور از کار رفتہ ہوچکا تھا، اور تنگ نظر اور قدامت پرست رعایا اور خائن عمال کی مخالفت کی وجہ سے اسے توڑنا اور اس کی جگہ بہتر اور مفید تر نظام قائم کرنا ممکن نہ تھا —

معاشرت کے اعلیٰ طبقوں سے ہوتا ہوا یہ اندرونی مرض آہستہ آہستہ ادنیٰ طبقوں میں سرایت کرتا گیا - اور صدیوں تک ترکی سوسائٹی نے اخلاقی کش مکش کی وہ سختیاں اٹھائیں کہ کوئی اور قوم اس طرح تھکتے دل سے اسے گوارا نہ کرتی، نظم و نسق نے بد سے بدتر صورت اختیار کی، ترکی جنرلوں کے دامن تک رشوت ستانی کے دھبہ سے آلودہ ہوگئے، لیکن آفریں ہے ترکی قوم کو کہ ان کی معصوم سادگی اور دیانت میں آج تک فرق نہیں آیا ! —

عثمانی تہذیب کی خصوصیت خاصہ اور اس کے اجزا کیا تھے ؟ ہم دیکھہ چکے ہیں کہ جیسے جیسے وہ وسط ایشیا سے مغرب کی طرف بڑھتے گئے' جن جن باشندوں سے ان کا سابقہ پڑا' ان کی تہذیب انھوں نے اختیار کی - اسلام کی عجمی شکل' نیز شیعیت اور "صوفیت" نے' جن کے گروہ اسی زمانے میں منظم ہوچکے تھے' ترکوں کے تخیلات کو اپنی طرف کھینچا - ایشیاے کوچک صدیوں سے مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کا سنگم رہ چکا تھا - تو ہم پرستی کے زمانہ کے باقیات' بازنطینی' یونانی' اور سلجوقی ایرانی تہذیبوں کے اجزا خلط ملط ہوکر ایک ایسا طرفہ معجون بن گئے تھے' جس کے اجزاے ترکیبی کی تحلیل تو ممکن ہے' لیکن جو خود محض ان مفرد اجزا کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک دوسری ہی چیز ہوکر رہ گیا ہے - ایشیاے کوچک سلجوقیوں ہی کے زمانہ میں ترکی رنگ میں رنگا جاچکا تھا' اور 'کے خاں لی' نو واردوں کو جن کی کل تعداد بمشکل دو ہزار سواروں سے زیادہ ہوگی' اپنی فوجی مہموں اور نئے مفتوحہ علاقوں کو بسانے کے لئے ہمیشہ کافی تعداد میں ترک مل سکتے تھے - تعداد ازدواج کے دستور نے بھی ترکوں کو بڑا فائدہ پہونچایا' اس لئے کہ مسلسل جنگوں میں انسانی جانوں کی جو زبردست قربانیاں انھیں دینی پڑیں' اس کی تلافی اضافہ آبادی سے ہوجاتی تھی - لیکن اس کے باوجود ترکی قوم آج تک یہ نہ کرسکی کہ اپنے علاقوں کو اپنے ہم قوموں سے آباد کردے' یا وہاں کی رعایا کو اپنی قومیت کے اندر جذب کرلے —

ترکی ہیئت سیاسیہ کا شروع ہی سے یہ خاصہ رہا ہے کہ حکمران طبقہ جمہور سے بالکل الگ تھلگ رہتا ہے- قومیت کے جدید تصور کی رسائی ترکی جمہور کے ذہنوں تک آج تک نہیں ہوئی ہے' اور عربی اسلام کے برخلاف جس نے مذہبی تبلیغ کے ذریعہ غیر اقوام کو معرب بنا دیا' ترک نہ تو بلقان کو "ترکا" سکے اور نہ اناطولیہ کو بلکہ محض آباد کاروں کی حیثیت سے رہے اور کسی قسم کی قومی یک جہتی نہ پیدا کرسکے- ترکی

تشکیل سیاسی میں ہمیں ایک عجیب دو رنگی نظر آتی ہے' جو صرف اس حد تک کہ سلطان کی اطاعت شعاری کا تعلق ہے نسلی رشتوں کو منقطع کرکے سب کو ایک اسلامی شیرازہ میں منسلک کردیتی ہے - غیر ملکی اور غیر وطنی لوگ بھی اسلام قبول کرکے' سلطان کی ملازمت میں داخل ہوسکتے تھے - یہ گویا نسلی انضمام کی ایک ترغیب تھی' اور عثمانیوں کی تاریخ میں ہمیں اس کی مثالیں بکثرت نظر آتی ہیں کہ لوگ برضا و رغبت اسلام لاکر' حکمران طبقہ کی تعداد میں اضافہ کا باعث ہوے ہیں - عیسائیوں پر مسلمانوں کے مقابلہ میں محاصل کا بار زیادہ تھا' اور شاید اس کی وجہ سے بھی اسامی اور کاشتکار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوے - وسط اناطولیہ میں قراسانی' اور مغربی اناطولیہ کے باشندے نسلی حیثیت سے ترک نہیں ہیں بلکہ مذہب اور بعد کو زبان کے اثر سے ترکی بن گئے ہیں - جب ترکوں نے اپنی سلطنت کا پایہ رکھا' تو اس وقت بھی ان کا نظم و نسق وہی قدیمی پیچکلیان قسم کا تھا' اور انتظام ملکی تقریباً تمامتر نو مسلموں کے ہاتھوں میں تھا - اس سے ایک نیا اور مصنوعی طبقہ پیدا ہو گیا' یعنی حکمران طبقہ' جو با وصف نسلی اختلاف کے' ملازمت سلطانی میں آکر مسلمان ہوگیا تھا - سرور ایام سے اور جیسے جیسے فتوحات کا سلسلہ بڑھتا گیا' یہ طبقہ دن بدن کثیرالتعداد اور جمہور سے الگ تھلگ ہوتا گیا - یہ ایک عجیب و غریب تاریخی معما ہے کہ ترکی جمہور نے' جو قدیم‌الایام سے فتح و تسخیر کی قوت اور نظم و نسق کی صلاحیت میں بڑھی چڑھی تھی' غیر ترکی اجزا کی ایک ایسی فاتح فوج اور ایسی انتظامی جماعت پیدا کردی' جو اپنے کو خود ترکوں سے الگ اور بڑھا ہوا سمجھتی تھی - یہ لوگ خود کو' عثمان لی' کہتے تھے' جس کے معنی ہیں خاندان عثمان کے حلیف' اور جمہور کو جنہیں وہ ' ترک ' کہتے تھے ' نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے - 'عثمان لی' کے اس حکمران طبقہ کا صدر اعلیٰ سلطان ہوتا تھا ' جو اپنی رعایا کے جان و

مال کا حاکم علی الاطلاق تھا - اس استبدادیت کا اصول یہہ تھا کہ عوام الناس کے نفع کو مد نظر رکھتے ہوے ' ان کے ساتھہ پدری شفقت برتی جاے ' اور جمہور کی قوتوں پر اقتدار کلی حاصل رہے - اس ہیت سیاسیہ کی مثال بالکل لشکر گاہ کی سی تھی ' جہاں سالار عسکر اپنی افواج کی ضروریات زندگی مہیا کرتا اور جس طرح چاہتا ان سے کام لیتا ہے - رعایا سلطان کی غلام تھی - شروع میں " عثمان " اور " اور خان " جیسے سردار اپنے لئے قدیم ترکی لقب " بے " استعمال کرتے تھے ' سب سے پہلے " سلطان " اور " خان " کے القاب " یلدرم " نے اختیار کئے - رعایا کے حال پر ترکی سلاطین کی پدری شفقت کی مثالیں ہمیں شروع کے سلاطین میں نظر آتی ہیں ' جن کی زندگیاں بہت سادہ ہوتی تھیں ' اور جو جمہور کے قدیم مراسم و رواج پر کاربند تھے - جیسے جیسے ممالک محروسہ میں توسیع ہوئی ' اور محل کے عہدہ داروں کی تعداد بڑھی ' ویسے ویسے نمائش اور تصنعات بھی بڑھنے لگے ' اور سلطان اپنے مشیروں سے دور دور رہنے لگا - " سلطان محمد ثانی " اپنے وزیروں کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا - ایک مرتبہ ایک دھقان کچھہ فریاد لیکر ایوان میں آیا ' اور پوچھنے لگا کہ " تم میں سے سلطان کون ہے ؟ " اس واقعہ کے بعد سے سلطان دریچہ کے پیچھے بیٹھکر اپنے وزراء کی بحثوں کو سننے لگا - " سلیمان " کے زمانے سے یہہ دستور ہوگیا کہ اب سلطان مجلس وزراء میں شرکت کی زحمت گوارا نہ کرتا تھا ' بلکہ وزیر اعظم تخلیہ میں مجلس وزراء کے تصفئے گوش گزار کیا کرتا تھا اور سلطان کا حکم آخری اور قطعی ہوتا تھا - تعجب کی بات ہے کہ جیسے جیسے سلطنت میں زوال آنے لگا اور صوبجات یکے بعد دیگرے ہاتھہ سے نکلنے لگے ' ویسے ویسے

سلطانوں کا غرور اور تمکنت بڑھتے گئے اور ان تک باریابی دشوار ہوتی گئی ' اور ساتھ ہی محل سرا کے ناعاقبت اندیشانہ اور بد تر اثرات ان کی مرضی پر حاوی ہوتے گئے - شروع کے جنگ جو سلاطین اپنے بیٹوں کے اندر اپنی جنگی روح پھونکا کرتے اور ان میں سے اپنا جانشین نامزد کرتے تھے - " سلطان احمد اول " کے عہد سے قانون وراثت بدل دیا گیا اور اب تخت کی جانشینی خاندان کے بزرگ ترین رکن کے حصہ میں آنے لگی —

باب حکومت ' جو سلطان کی مجلس شوریٰ تھی ' ان ارکان پر مشتمل تھی - صدر اعظم ' دو قاضی عسکر ' قاضی قسطنطنیہ ' جانثاریوں کا افسر اعلیٰ ' نشانجی ( مہر بردار شاہی ) ' خزانچی اور سالار عساکر - باب حکومت کے اجلاس روزانہ صبح میں ہوتے تھے ' اور اس کی کارروائیاں اس طرح شروع ہوتی تھیں کہ رئیس الکتاب تجویزیں اور کاغذات پڑھکر سناتا تھا - " خوجگیان " احکامات قلم بند کر کے مختلف عہدہ داروں کے پاس روانہ کرتا تھا - اہم قانونی معاملات میں ' باب حکومت ہی اعلے ترین مجلس مرافعہ ہوتی تھی - اجلاس کے بعد سلطان تخلیہ میں صدر اعظم اور دوسرے وزراء کو طلب کرتا ' اور ان کی تجاویز سنتا تھا - نئے تقررات اور مختلف عہدوں کی خلعت بخشی بھی اسی موقع پر ہوتی تھی - سترھویں صدی عیسوی میں یہہ دستور العمل متروک ہوگیا ' اور اب باب حکومت کے جلسے گاہ گاہ صدر اعظم یا شیخ الاسلام کے محل میں منعقد ہونے لگے - جب " محمود ثانی " نے نظم و نسق کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور وزیروں کا تقرر کیا تو اس نے یہہ قاعدہ بنایا کہ صدر اعظم کی صدارت میں ہفتہ میں دو مرتبہ اجلاس ہوا کرے - وزیروں کو ' ان کے منصب کے

اعتبار سے سہ اسپ (*) دسہ نشان عطا ہوتا تھا اور صدر اعظم کو چہار اسپ دسہ - سلطان کے خیمہ کے سامنے سات دموں کے نشانات نصب کئے جاتے تھے - وزیر کے خیل و خدم میں بعض اوقات کئی کئی ہزار آدمی ہوتے تھے —

اصطلاحی حیثیت سے ' عثمانی نظم و نسق کے اہم شعبے ' یعنی دیوانی ' فوجی اور عدالتی آپس میں بہت کچھہ میں غلط ملط تھے 'لیکن ایک حد تک درجہ بندی کی کوشش بھی کی گئی تھی - ساری سلطنت کو ولایتوں ' سنجقوں اور قضاۃ میں منقسم کیا گیا تھا - ولایتوں اور سنجقوں کے والی فوجی افسر بھی ہوا کرتے تھے ' فوجیں ان کے جلو میں رہا کرتی تھیں اور لڑائی کے زمانے میں جاگیردار اور امرا جو فوجی دستے بھیجتے تھے ' ان کی سرداری بھی یہی والی کیا کرتے تھے - سنجق کے افسر اعلیٰ کو ایک اور ولایت کے والی کو دو نشان عطا ہوتے تھے - " انا طولیہ " اور " روملیا " ( یعنی یورپین ترکی ) کے " بے " ان کے اوپر دو بگلر بے مقرر ہوتے تھے ' جو فوجی دستوں کی کمان بھی کیا کرتے تھے - اگر میمنہ اور میسرہ کی کمان پر کوئی شہزادہ نہ ہوتا ' یہی دونوں ' بے ' میدان جنگ میں ان کی کمان پر مقرر کئے جاتے - ان اہم خدمات پر تقررات ایک خاص طریقہ پر ہوتے تھے ' جیسے " دوشرمہ " کہتے تھے ' یعنی بلقان اور دوسرے مقامات سے عیسائی بچوں کو اٹھالے جانا ' اور انھیں مسلمان بناکر ان مخصوص خدمات کے لئے تیار کرنا - یہہ لوگ سلطان کے خاص محافظ ہوتے تھے —

دوسری اہم خدمات یہہ تھیں: دفتر دیوانی ' جو مجلس وزراء کے

---

(*) یہہ ترکی نشان تھا ' گھوڑے کی دم نیزے کے سرے پر باندھی جاتی تھی ' دموں کی تعداد کی مناسبت سے ' پاشاے دو نشان پاشاے سہ نشان وغیرہ کہلاتے تھے - ۱۲ - مترجم —

فیصلوں کو ضبط تحریر میں لاتا اور دوسرے دفتروں کو بھیجتا تھا ' دفتر حقانی ' جس میں اراضیات کے متعلق کاغذات رہا کرتے تھے ' اور خزانہ - دیوانی دفتر کا صدر اعلیٰ رئیس الکتاب ہوتا تھا ' جو سفارت خانوں کے ساتھہ مراسلت کرتا ' اور غیر قوموں کے ساتھہ امور سلطنت کی گفت و شنید کرتا تھا —

ایک اور اہم عہدہ ' نشانجی یا رجسٹرار کا ہوتا ' جو زمینات کی تقسیم کرتا ' سلطانی فرامین پر مہر لگاتا اور نئے مفتوحہ علاقوں کے متعلق اندراجات کرتا تھا - ' دفتر دار ' کا عہدہ وہی تھا جو آج کل صدر المہام فنانس کا ہوتا ہے - ابتداء میں صرف ایک ' دفتر دار ' ہوتا تھا ' لیکن بعد کو یورپی اور ایشیائی مقبوضات کے لئے علیحدہ علیحدہ دفتر دار ہوتے تھے - وہ محاصل کی جمع بندی اور اخراجات کی نگرانی کیا کرتے تھے-

علماء کا طبقہ ' جو اسلامی ممالک کے سیاہ و سفید میں بہت کچھہ دخیل تھا ' ترکی میں محمد ثانی کے زمانہ میں وجود میں آیا - شروع میں ان کے فرائض قاضی عسکر کی حیثیت سے صرف فوج تک محدود تھے اور پندرویں صدی کے ختم تک مفتی اعظم کی کوئی علیحدہ خدمت نہ ہوتی تھی ' بلکہ قاضی بروسا ' یا قسطنطنیہ کا قاضی یا کوئی اور عالم جو بادشاہ کے اشاروں پر چلتا ' اس خدمت پر مقرر کیا جاتا - اس طریقہ تقرر سے ' اس اعلیٰ عدالتی عہدہ کی اہمیت بہت کچھہ کم ہوگئی تھی ' اور اگرچہ بعض قوی الارادہ شیخ الاسلام کبھی کبھی اپنے خاص اختیار کو کام میں لاکر سلاطین کی فضول خرچیوں کو روک دیا کرتے تھے ' لیکن عموماً ان میں سے اکثر سلاطین کے ہاتھوں میں محض بے جان آلہ کی حیثیت رکھتے تھے اور خلاف احکام شریعت ' فتاوے صادر کیا کرتے تھے —

ترکی حکمران طبقہ میں علماء کا طبقہ ہی خالص اسلامی عنصر تھا ' یعنی اس میں وہ عیسائی بچے شامل نہ کئے جاتے ' جو ترکی مقبوضات سے پکڑ کر لائے جاتے تھے ' بلکہ اس طبقہ کے افراد ترکوں اور عربوں کی اولاد ہوا کرتے تھے ' اور ان کی جماعت ' بعد میں غیر ملکی نسل کے عہدہ داروں کے خلاف بنی ہو گئی تھی ۔ اس ڈر سے کہ سلطان ' یا فوج ان کے اقتدارات میں مداخلت نہ کر سکے ' انہوں نے اپنے پیشہ کی حیثیت خاندانی اور موروثی بنادی تھی ' اور گود کے بچے بھی "علماء" ( بشک علمالی غی ) کہلاتے تھے ۔ اس مذموم طریقہ نے جس کی ابتداء محض حفاظت خود اختیاری کے طور پر اور عمال سلطنت کی مداخلت بیجا کو روکنے کے لئے کی گئی تھی ' آگے چل کر علماء کی علمیت اور اعزاز کو بہت کچھ نقصان پہنچایا ۔

عثمانی سلطنت کی مخصوص ہیت ترکیبی کے اعتبار سے اس کا اہم ترین طبقہ ' اور اس کی ساری قوت فوج تھی ۔ اس زمانہ میں بھی جب کہ اس سلطنت کی حیثیت محض ایک دیہاتی جماعت کی سی تھی ' اس کا دار و مدار اپنے جاگیری نظام اور فوجی تنظیم پر تھا ' مغربی ملکوں کی طرح سے ' ترکی کے جاگیر داروں کے فرائض میں بھی فوجی خدمت داخل تھی ۔ پندرہویں صدی کے اوائل میں ' اورخاں ' اور مراد نے جاگیرداروں کی متلون المزاجی سے محفوظ رہنے اور شورشوں کو فرو کرنے کے لئے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس نے تھوڑی ہی مدت میں ترکوں کو دنیا کی بہتر سے بہتر جنگی دول کے دوش بدوش کھڑا کردیا ' انہوں نے ایک نئی فوج "ینی چری" بھرتی کی ۔ عام روایت کے بموجب یہ سپاہ قلندروں کی جماعت بکتاشی سے بھرتی کی گئی ' لیکن زمانہ حال کی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ بکتاشیوں کی جماعتیں جانثاریوں کی بارکوں میں سولھویں صدی میں داخل ہوئیں ' اور

وہ بھی اس خیال سے کہ ان پر الحاد کا جو شبہ کیا جاتا تھا، وہ مٹ جائے۔ جانثاری فوج، طبعاً اور اخلاقاً، ایک زبردست اور ناقابل تسخیر اور ہر حیثیت سے قابل اعتماد فوج تھی، اس میں زیادہ تر ایسے بد نصیب افراد شریک تھے، جنھیں بچپن ہی میں گھروں سے پکڑ کر ایسی جکڑ بند اور ایسے ماحول میں رکھا گیا تھا کہ ان کے دل والدین کی محبت یا حب وطن کے جذبات سے قطعاً نا آشنا تھے۔ انھیں صرف ایک ہی اخلاق کی تعلیم دی گئی تھی، یعنی آقا کی اطاعت، اور ان کے دل میں صرف ایک ہی امنگ اور آرزو تھی، یعنی ترقی پانا، اور روپیہ کمانا۔ ظاہر ہے کہ فتوحات ملکی کے لئے اس بے جگر گروہ سے زیادہ اور کون موزوں ہو سکتا تھا۔ یہ نئی فوج سات طبقوں پر مشتمل تھی جو سب کے سب محل شاہی کے غلام (قاپو قلعہ) تھے، بارکوں میں رہتے اور شاہی خزانہ سے مقررہ مشاہرہ اور روزانہ بھتا پاتے تھے۔ اس باقاعدہ فوج کا بہت بڑا حصہ پیدل سپاہ پر مشتمل تھا۔ اس کے ۱۹۶ دستے تھے اور ہر دستہ میں مختلف اوقات میں ۶۰ سے لیکر ۲۰۰۰ آدمی تک ہوتے تھے۔ 'محمد ثانی' کے زمانہ میں جانثاریوں کی جنگی جمعیت بارہ ہزار کی تھی، 'محمد ثالث' کے زمانہ میں چالیس ہزار اور 'سلیم ثالث' کے عہد میں ان کی تعداد ہر زمانہ سے زیادہ یعنی ایک لاکھ دس ہزار تھی۔ ہر دستہ کی وردی، اس کی مخصوص خدمت کے اعتبار سے الگ رنگ کی ہوتی تھی، اور ہر دستہ کا اپنا الگ معرکہ تھا، کسی کا معرکہ کنجی تھا، تو کسی کا مچھلی اور کسی کا جہاز کا لنگر۔ یہ معرکے ان کے اپنے اپنے جھنڈوں پر بنے رہتے اور اکثر سپاہیوں کے بازوؤں اور پنڈلیوں پر گودنے سے گدے ہوتے۔ ہر دستہ کے مغنی اس کے ساتھ رہتے، اور جانثاری افواج کے روایتی فوجی مراسم ہمیشہ پابندی

کے ساتھہ پورے کئے جاتے - ' اور خان ' کے عہد میں ہر جانثاری کی روز کی تنخواہ ایک اقچہ تھی ' جس میں ایک ثلث درہم کے برابر چاندی ہوتی تھی - بعد کو روزانہ تنخواہ پانچ یا چھہ اقچہ ہو گئی تھی - اور خاص خاص افراد کو اگر کوئی کار نمایاں کریں تو آٹھہ اقچہ تک دئے جاتے تھے - بعد کو جب مالیات ملکی کی بد نظمی کی وجہ سے ' چاندی کے سکوں میں میل ہونے لگا اور ان کی قیمت میں فرق آگیا ' تو تنخواہ بھی بڑھا کر بیس اقچہ کر دی گئی - اس تنخواہ کے علاوہ ' ہر دستے کو باقاعدہ روغن ' روغن ' دال ' موم بتی اور ورد ی کی رسد ملا کرتی تھی - رسد کی تقسیم سہ ماہی ہوتی تھی اور ہر سہ ماہی کا نام اس کے مہینوں کے پہلے حروف ملا کر رکھا گیا تھا ' مثلاً " مصر " ( محرم ' صفر ' ربیع الاول ) ' " رجج ( ربیع الآخر ' جمادی الاول ' جماد ی الثانی ) وغیرہ —

رسد کی تقسیم ایوان باب حکومت کے سامنے ہوتی تھی ' اور اس کے لئے منگل کا دن مقرر تھا - تمام دستے فوجی ترتیب کے ساتھہ آگے بڑھتے ' صدر اعظم اور اس کے مقربین کو آداب بجا لاتے ' اور پھر اپنے سردار کا اشارہ پاکر کھانے بیٹھہ جاتے - کھانے میں شوربہ ' چاول ' اور گوشت ہوتا ' جو مطبخ سرا کے مطبخ میں پکایا جاتا - کھانے پر بیٹھنا گویا اس کی علامت تھا کہ وہ اپنے آقا کے نمک حلال ہیں - کھانے سے فراغت پاکر پھر سب ایوان کے سامنے جمع ہوتے ' یہاں ان کے کپتان دونوں ہاتھہ سینے پر باندہ کر " گلبانگ " ( جانثاریوں کا نعرۂ جنگ ) پڑھتے —

" لااله الاالله باش هر یاں ' سینه پریاں "

" قیلیچ آل قان - بو میداندہ نیجه باشلر "

" کسیلیر هیچ اولمان صوران - ایوالله "

" ایوالله قهر مُز قیلیجمز دشمانه زیان - "
" قوللغمز باد شاهه عیان - اوچار یدیلر "
" قیر قلر گلبانگ محمدی ' نور نبی کرم علی "
" پیرمز خدا وندکار مُز حاجی بکتا شی ولی "
" دمنه ' دو راننه هُو ' ه یبه لم هو ! "
( ترجمه : لااله الاالله ' برهنه سر اور سینه صاف
هوکر اے میری تلوار خون پی ؛ یہاں هزاروں
سر دھڑ سے جدا هوتے هیں اور کوئی نہیں پوچھتا
که کیوں ؛ والده ' بالله همارى فوج اور همارى
تلوار دشمنوں کے حق میں زیاں هے - هم
بادشاه کے نمک خوار هیں ' تین سات اور
اکتالیس نعره لگاؤ نور نبی ' کرم علی
اپنے پیر و مرشد حاجی بکتاش ولی کے لئے - نعره
لگاؤ اس کے نام کے " )

اس کے بعد ایک مقررہ اشارہ پاکر اپنی اپنی مقررہ جگہ کی طرف جھپٹ کر سکوں کی تھیلیاں اٹھا لیتے اور بارکوں میں جاکر انھیں تقسیم کرتے - پیستھویں دستے کو اس رسم میں شرکت کی اجازت نہ تھی ' اس لئے که ان پر شہزادہ عثمان کے قتل میں حصہ لینے کا شبہ تھا - چونکہ خود سلطان بھی جانثاریوں کے پہلے دستہ کا رکن سمجھا جاتا تھا ' اس لئے اس رسم کے چند روز بعد وہ جانثاری کی وردی پہن کر بارکوں میں جاتا اور تنخواہ لیتا تھا ' اور بارک کے دروازہ پر - گھوڑا ٹھیرا کر جانثاریوں کے افسر کا دیا هوا شربت کا پیالہ پیتا ' جس کا مطلب یہ هوتا که اب ان کی وفاداری پر

پورا پورا اعتماد ہے —

اس مخصوص فوج میں کسی باہر والے کو' الله اس صورت کے جب کہ اس میں کوئی خاص خصوصیت ہو ' شرکت کی اجازت نہ تھی - اگرچہ جانثاری افواج ' اپنی ترکیب کے لحاظ سے مخلوط تھیں ' لیکن ان کی حلقہ بندی اور رشتہ اتحاد مستحکم تھا ' البتہ سولھویں صدی کے آخر میں وہ بازیگر اور مسخرے بھی' جو اپنے کرتبوں سے شاہی محفلوں میں سلطان کی خوشنودی حاصل کر لیتے ' اس میں بھرتی کئے جانے لگے - اس کے بعد سے تو جانثاریوں کی بارکوں میں ہر قسم کے غیر معتبر بیرونی لوگ داخل ہونے لگے ' جس نے اس فوج کی روایتی یک جہتی اور شیرازہ بندی کو صدمہ پہونچایا ' اور ان کی جو خاص شان تھی اسے مٹا دیا - اب یہ لوگ شادیاں کرکے بارکوں کے باہر رہنے اور امن و امان کے زمانہ میں کوئی نہ کوئی کاروبار بھی کرنے لگے - غرض کہ وہی فوج جس کی بسالت اور ہیبت کی کسی زمانہ میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی ' اب اس کی حیثیت صرف ایک شورش پسند اور شورہ پشت انبوہ کثیر کی سو ہو گئی ' جس سے ملک کے امن و امان کے لئے اندیشہ پیدا ہو چلا - لڑائی کے کام کے تو یہ لوگ بالکل رہے ہی نہیں ' اور جب کئی مرتبہ ان کی جدید تنظیم کی کوشش کی گئی لیکن ناکامی ہوی تو آخر کار سنہ ۱۸۲۶ م میں اس فوج کو بالکل ہی توڑ ڈالا گیا —

مذکورہ بالا باقاعدہ اور مستقل افواج کے علاوہ ' جاگیری امرا ' "تیمار" "زیامت" اور ' خاص ' کی اپنی اپنی منتظم فوجیں بھی تھیں ' اور ان میں سے ہر ایک اپنی جاگیر کے شایان شان مسلح اور تربیت یافتہ سپاہ ' پیدل اور سوار ' معسکر سلطانی کو بھیجتا تھا - اپنے زمانۂ عروج میں ' سلطنت عثمانی ' بے خرخشہ اور صرف ایک لاکھ چالیس ہزار سوار میدان جنگ

میں لا سکتی تھی - نپولین کی جنگوں کے زمانہ تک یورپ کی کوئی سلطنت اتنا بڑی دل لشکر جمع نہ کر سکتی تھی - امرا کو جاگیریں خدمات سلطانی کے صلے کے طور پر عطا ہوتی تھیں، جن میں سے بعض تو حین حیات کے لئے ہوتیں، اور بعض ہمیشہ کے لئے اور یورپ میں تو جاگیری نظام اپنے غیر منفک موروثی حقوق کی وجہ سے مرکزی حکومت کے لئے خطرناک بن گیا تھا، لیکن ترکی کے امرا اور جاگیردار ہمیشہ اپنے بادشاہ کے پابند اور ماتحت رہا کرتے تھے - لیکن عثمانی سلطنت کو اپنے جاگیری نظام کی وجہ سے جو قوت حاصل ہوئی تھی، اس میں عام اخلاقی زوال اور بد ضبطی کی وجہ سے ضعف پیدا ہو گیا - بیگمات کے اثر اور رسوخ کی وجہ سے اکثر غیر مستحق لوگوں کو جاگیریں ملنے لگیں اور اکثر امرا اپنی جاگیروں سے دور بیٹھکر مزے کرنے لگے - جاگیروں کو پٹہ پر دینے کا دستور عام ہو گیا، اور اس نے اکثر جاگیرداروں کو تباہ کر دیا - کھیتوں سے کمال بے پروائی کے ساتھہ زیادہ سے زیادہ انتفام کیاجانے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ اراضی بنجر اور مردہ ہو گئی اور سارے ملک میں غلہ کی قلت ہو گئی - ترکی فوج کا بیشتر حصہ جانثاری اور جاگیری سپاہ پر مشتمل تھا - طلایہ یا دوسری معمولی خدمات کے لئے بے قاعدہ اور عارضی سپاہ استعمال کی جاتی تھی، ان کے پاس بندوقیں ہوتی تھیں، یا پھر سرنگیں بچھانے یا لشکر گاہ یا قلعوں میں خندقیں کھودنے کا کام ان کے تفویض ہوتا تھا - چونکہ بلقان کے مفتوحہ علاقوں کو بھی امدادی فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں، اس لئے ان میں سے اکثر عیسائی ہوتے تھے -

چونکہ سولھویں صدی میں سارا "بحرقلزم" ترکوں ہی کے زیر اثر تھا، اس لئے ان میں بحری فاتحین اور امیرالبحروں کا بھی ایک لاجواب جھمگڑا پیدا ہوا، مثلاً "خیر الدین بار بروسا" اور اس کا بیٹا "حسن"، "پیالہ تورغد،

'صالح رئیس' اور 'پیری رئیس' سب سے پہلا جہازی کارخانہ ( ترسانہ ) 'گیلی پولی' میں کھولا گیا تھا' جو 'سلیمان' کے عہد میں 'شاخ زرین' کو منتقل کر دیا گیا۔ 'قاپودان پاشا' یعنی امیرالبحر کا منصب صدراعظم کے بعد ھی ھوتا تھا ۔ ترکی کے تمام بحری افسر اور ملاح عیسائی والدین کی اولاد تھے۔ یہ تو ھر شخص جانتا ھے کہ ان لوگوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں سے یورپ کو کس قدر سراسیمہ کر دیا تھا' لیکن اس کے علاوہ ان میں بعض بہت قابل ھوئے ھیں اور سائنس دان مصنفین کی حیثیت سے بھی مشہور ھیں' مثلاً پیری رئیس نے بحیرہ ایجین اور بحیرہ روم کا ایک بحری نقشہ ( بحریہ ) تیار کیا تھا۔ وہ ان دونوں سمندروں کا چپہ چپہ چھانے ھوا تھا' اور اپنے نقشہ میں اس نے بحری روؤں' مختلف مقامات کی گہرائیوں' اترنے کی جگھوں اور بندرگاھوں کے متعلق جملہ معلومات فراھم کی ھیں ۔ اسی طرح سے ایک اور علمی ذوق رکھنے والا امیر البحر سیدی علی تھا' جس کا جہاز باد مخالف کی وجہ سے ھندوستان کے ساحل پر آن لگا تھا' وہ خشکی کے راستہ' یعنی سندہ' خراسان' بلوچستان اور ایران ھوتا ھوا ترکی واپس گیا تھا ۔ اس نے اپنے اس رسالہ سفر کی واردات لکھی ھے اور ساتھ ھی اصطرلاب کے استعمال پر ایک ھندسہ کی کتاب' اور ھندوستان کے سمندروں پر ایک کتاب "محیط" کا مصنف بھی ھے —

ترکی نے اپنے اعلیٰ درجہ کے منظم جہازی کارخانوں کی مدد سے ایک ایسا بیڑا تیار کرلیا تھا جس میں ھر خدمت کے لئے خاص طور پر تربیت یافتہ ملاح اور سپاھی' مامور تھے' ان کی ایک جماعت کو جاگیری دقیت اراضی کے طریقہ کی رو سے بحری خدمات انجام دینی پڑتی تھیں ۔ غلاموں' قیدیوں اور سزا یافتہ مجرموں سے جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کا کام لیا جاتا تھا' اور ان سے غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا ۔ دوسری اقوام کی فوجوں کے بر خلاف' ترکی

فوج کی وردیاں شوخ رنگ کی ہوا کرتی تھیں - چونکہ اس زمانہ میں لڑائیاں دست بدست ہوا کرتی تھیں، اس لئے خاکی وردی سے غنیم کو دھوکا دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی - وردی میں سر کا لباس خاص طور پر نمایاں ہوتا تھا۔ شلواریں، جن کی پنڈلیوں کے اوپر مختلف رنگوں کے تسمے بندھے رہتے تھے اور بے ایڑی کے پنڈلیوں تک کے جوتے جن کے ادھر ادھر بٹن ٹکے رہتے تھے - ان سے لمبے دھاوے مارنے میں سہولت ہوتی تھی - کوچ کی حالت میں لبادے کے دامن کمر پیٹی میں اٹکا لئے جاتے تھے تاکہ چلنے میں آسانی ہو—

عثمانیوں کے اسلحہ میں ایشیائی اسلحہ جیسے گرز، بسولے، تلواریں اور یورپی آتشیں اسلحہ دونوں مستعمل تھے - آتشیں اسلحہ میں سب سے پہلے توپوں کا استعمال شروع ہوا - اس کے بعد رائفلیں، جن کو سب سے پہلے جنگ کوسووو (Kossowo) سنہ ۱۳۸۹ ع میں استعمال کیا گیا تھا - لیکن عثمانی، جو اپنی فوج کی اصلاح کے لئے غیر ملکیوں کو ملازم رکھتے تھے، بھاری بھاری توپیں ڈھالنے میں اپنے دشمنوں سے بہت آگے تھے سوار فوج کے حملہ کی مدافعت کے لئے وہ گھومنے والی توپیں اور ایک قسم کی مشین گنیں استعمال کرتے تھے —

جب اعلان جنگ ہوتا، تو مختلف پلٹنیں مقررہ مقامات پر جمع ہوتیں۔ مغرب کی طرف جو لڑائیاں ہوتیں، ان کے لئے کوچ کا راستہ ادرنہ، سوفیا، نش اور بلغراد تھا - روس کی طرف ادرنہ، سوفیا، بداداغی، عراقچی اور دریائے نیس ٹر (Dniester) کے کنارے کنارے کوچ کیا جاتا - فوج کے لئے غلہ اور رسد کے ذخائر مہیا کرنے کے لئے بعض شاہراہوں کو اختیار کیا جاتا - ان سب راستوں کے پہلے ہی سے متعین ہونے کی وجہ سے اس کا اندازہ ہوجاتا تھا کہ معرکہ کہاں ہوگا،

یہ میدان جنگ عموماً ایسے وسیع میدان ہوا کرتے تھے جن کے چاروں طرف پہاڑیاں ہوتیں اور ہر فریق ان پر پہلے قابض ہونے کی کوشش کرتا تھا - ترکی فوجیں زمین پر لیٹ کر پیٹ کے بل چلتی تھیں اور اس لئے انھیں بعض مقررہ راستوں پر رہنا پڑتا تھا - جب فوج جنگ کے لئے روانہ ہوتی تو اس کے ساتھہ رسد پہونچانے والوں، مزدوروں، مغنیوں اور بازیگروں کا ایک جم غفیر ہوتا تھا - ترکی لشکر گاہ میں عجب رونق اور چہل پہل ہوتی تھی - دنیا کے ہر حصہ کی نسلیں اور لباس وہاں نظر آتے، اور ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی مشرقی شہر کا سارا بازار اپنےطرح‌طرح کے سامان اور تماشوں کے ساتھہ، فوج کے ہمراہ جارہا ہے- مشرق نے بلقان کے راستہ سے وی ایٹا (Vienna) کے کئی چکر اس طرح لگاے ہیں —

ترکوں کے حربی اصول، قدرتی طور پر، ان کے مخصوص فوجی نظام پر مبنی ہوتے تھے، اور ابھی زمانۂ حال تک ان میں وسط ایشیا کے میدانوں کی زندگی کے چربے نظر آتے تھے - شروع شروع میں تورانی اقوام نے قدیم ایرانیوں سے، جنھوں نے پیادہ اور سوار فوج میں اتحاد عمل کا ایک مخصوص طریقہ نکالا تھا، یہ حربی اصول سیکھا تھا کہ فوجوں کو کھڑی قطاروں کی بجاے صف میں پھیلا دیا جاے- ترکوں کی صف بندی اس طریقہ پر ہوتی کہ قلب میں تو پیدل سپاہ کا ایک مستحکم مرکز ہوتا جس کے آگے توپخانہ ہوتا اور میمنہ اور میسرہ میں سواروں کے دستے رکھے جاتے - لڑائی اس طرح شروع ہوتی کہ پہلے سامنے کی طرف سے بے قاعدہ رسالہ (آقنچی) چھاپے مارنا شروع کرتا، اور پھر جنگ مغلوبہ کے اصول پر اپنے کو شکست خوردہ ظاہر کرکے بے تحاشا بھاگتا - غنیم زعم میں آکر اس کا تعاقب کرتا، یہاں تک کہ توپخانہ کے ہیم دائرہ کی زد میں آجاتا، اب بے قاعدہ سواروں کے دستے (جنھوں نے چھاپہ مارا تھا) تو دائیں بائیں پھیل جاتے اور دفعتاً توپخانہ غنیم پر باڑھیں مارنا شروع کرتا - ساتھہ ہی میمنہ اور میسرہ کے رسالے کے دستے چکر کاٹ کر اسے منتشر کردیتے اور دوسری طرف سے جانباز

جانثاری پیدل فوج شکست خوردہ غنیم پر ٹوٹ کر اور تعاقب کرکے ان کا کام تمام کردیتی - اگر یہ حربی چالیں کارگر ہوتیں، تو پوری طرح سے فتح حاصل ہوتی اور میدان جنگ ہی میں غنیم کا کام تمام ہو جاتا - ترکوں نے اس طرح سے ایک ایک معرکہ میں سلطنتوں کی قسمت کے فیصلے کردئے ہیں - ترک پیدائشی سپاہی ہیں، اور جب انیسویں صدی میں یورپی تہذیب نے لمبی مار کے آتشیں اسلحہ تیار کئے اور پرانی حربی چالیں بے کار ہوگئیں، تو ترکوں نے نئے اصولوں کو بھی نہایت مستعدی کے ساتھ سیکھ لیا، اور ان میں بھی اگر دوسری قوموں کے آگے نہیں، تو کم از کم ان کے برابر وہ ضرور ہوگئے - ترک ہی اسلام کے بہترین مجاہد اور مبارز ہیں، اور ان میں آج بھی اعلیٰ درجہ کی خدا داد فوجی قابلیت رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں —

عثمانی سلطنت کا اگر کوئی کمزور تریں رخ تھا، تو وہ مالیات کا انتظام تھا، گویا کہ فطرت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ سپاہی اقتصادیات سے بے بہرہ ہو، وہ کبھی سلطنت کے محاصل اور مخارج کی میزان برابر نہ کرسکے - ان کے یہاں کوئی باضابطہ میزانیہ تیار نہیں کیا جاتا تھا، اور سلطان کی طبیعت کی لہر مالیات کی مستحکم ترین بنیادوں کو متزلزل کردیتی تھی - شریعت اسلامی کے بموجب ریاست کی آمدنی کی مدیں عشر، نمک کے محصول، جزیہ، مفتوحہ یا ماتحت دول کے خراج اور مال غنیمت کا خمس ہوتی تھیں، سلطنت کے عروج کے زمانہ میں محاصل مخارج سے کہیں زیادہ ہوا کرتے تھے، اس کے بعد یہ دستور ہوگیا کہ ہر سلطان تخت نشینی کے وقت جانثاری فوجوں کو بڑی بڑی رقمیں تقسیم کرنے لگا اور حرم سرا کے اخراجات بے تکان بڑھنے لگے - آمد و خرچ کا کھاتہ رکھنے کا تو کوئی طریقہ تھا ہی نہیں، صوبجات کا پیسہ پیسہ کھینچ لیا گیا اور

وہ مفلس ہوگئے، اور جب نیا دور تمدن شروع ہوا تو چونکہ ترکی زراعتی ملک تھا، اس لئے اسے اپنی مصنوعات باہر والوں سے خریدنی پڑیں۔ اگرچہ 'سلیمان' "ذی شان" کے زمانہ میں ترکی اوج کمال پر تھا، لیکن مالی مشکلات اسی زمانہ میں شروع ہوگئی تھیں۔ جاگیری حقیت کو وقف میں منتقل کردیا گیا تھا اور زمین کو پٹہ پر دینے کا طریقہ شروع کردیا گیا تھا۔ باضابطہ میزانیہ تیار کرنے کی کوشش پہلی مرتبہ سنہ ۱۶۰۹ ع میں کی گئی، پھر سنہ ۱۶۵۳ ع میں اور اس کے بعد سنہ ۱۶۶۰ ع میں —

اس زمانہ میں دو 'قوپرولو' * کے حسن انتظام سے مالیہ کی حالت کچھ سنبھلی، میزانیہ شکل سنہ ۱۸۶۲ ع تک رہی رہی، اس سال البتہ 'فواد پاشا' نے ملک کی مالی حالت کے متعلق جو رپورٹ پیش کی، اس کے ساتھ ایک باضابطہ میزانیہ بھی شریک کیا۔ یہ میزانئے کبھی صحیح نہیں ہوتے تھے اور کم عیار سکوں کی گردش اور سرکاری طور پر ضبطی جائداد کی کارروائیوں نے حکومت پر سے رعایا کا اعتبار بالکل اٹھالیا تھا۔

لیکن جب ہم ترکوں کے علوم و فنون اور خالص اسلامی تہذیب کی ترقی میں ان کا جو کچھ حصہ تھا، اس پر نظر ڈالتے ہیں، تو مذکورہ بالا ابتری کی کسی قدر تلافی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ترکوں کی طبیعت میں، کسی طرح کی جدت طرازی نہ تھی، تاہم ماننا پڑتا ہے کہ وہ ہمیشہ علم کے شیدائی اور دوسری اقوام کے ہونہار شاگرد رہے ہیں۔ ترکی علماء عجمی اور عربی تمدن پر گہری نظر رکھتے تھے، اور چونکہ

---

* یعنی ایک تو 'قوپرولی محمد' جو سنہ ۱۶۵۶ ع میں صدر اعظم ہوا تھا، اور دوسرا اس کا بیٹا 'قوپرولی زادہ احمد' جو سنہ ۱۶۶۱ ع میں وزیر ہوا۔ یہ دونوں البانی الاصل تھے — ۱۲ — مترجم

ازمنہ وسطیٰ میں علم کا مطلب ہی "علم دین" ہوتا تھا، اس لئے اسلامی دینیات کے مطالعہ کا شوق بہت جلد ترکوں میں پیدا ہو گیا - ان کے ابتدائی زمانہ کے سلاطین مسجدیں اور ان کے قریب مدرسہ تعمیر کراتے تھے، جہاں ستونوں کے سامنے زمین پر دو زانو بیٹھکر، ترکی شاگرد عربی کا نصاب پڑھا کرتے تھے - جنھیں اعلیٰ تر تعلیم مطلوب ہوتی وہ 'مصر' کے مشہور زمانہ مدارس میں جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے - جس طرح سے اس زمانہ میں یورپ میں درس و تدریس لاطینی میں ہوتی تھی، اسی طرح ممالک اسلامی کی علمی زبان عربی تھی، اس کی وجہ سے مختلف تمدنوں کے درمیان ایک طرح کا بین الاقوامی رشتہ اتحاد پیدا ہو جاتا تھا، جو آج کل اس وجہ سے نہیں پیدا ہوتا کہ "قومی زبان" کے شوق نے ہر ایک کی حد الگ الگ کردی ہے - شروع زمانہ کے ترکی علماء میں 'شیخ اودے بلی' جو سلطان 'عثمان' کا خسر تھا، 'درسون فاتی'، 'چندرالی قارا خلیل' وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس کے بعد 'ازنک' کے مدرسے نے شہرت حاصل کی، جو سلطان 'اورخان' کا قائم کیا ہوا تھا - ادرنہ اور 'قسطنطنیہ' کی تسخیر کے بعد مختلف سلاطین نے ان دونوں مقامات میں لاجواب مسجدیں اور مدرسے بنائے، جن میں 'ادرنہ' میں سلیم کے بنائے ہوئے مدرسہ کو اور 'قسطنطنیہ' کے مدرسہ 'سلیمانی' کو خصوصیت کے ساتھ علمی مرجعیت حاصل تھی، اور دور دور کے طلبہ وہاں تحصیل علم کے لئے آتے تھے - اساتذہ میں 'عسکری لی جمال الدین' اور 'سعدالدین تفتازانی' بہت مشہور تھے، جن کی تفاسیر آج تک اسلامی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں - 'شیخ بدرالدین' نے تصوف پر کئی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں، وہ اپنے ہم عصروں میں اپنے آزادانہ فلسفیانہ رجحانات و خیالات کی وجہ سے ممتاز ہیں - 'محمد فاتح' کے عہد

میں ' ملا خسرو ' نے کتب فقہ کے مصنف کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی - فقہ میں ان کی کتاب " غرر " اور اس کی شرح " درر " بہت معروف ہے - " سلیم اول " کے زمانہ میں " زینلی علی جمالی " اور مفتی اعظم " کمال پاشا زادہ " علم و فضل کا مرجع تھے اور علماء جوق جوق آکر ان کے آگے زانوے شاگردی تہ کرتے تھے - اسی طرح " سلطان سلیمان " کا عہد بھی " ابو سعود آفندی " اور " ابن کمال " جیسے صاحبان علم و فضل پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے - " ابن کمال " نے تفسیر اور کمالیات میں خاص شہرت حاصل کی تھی ' انھوں نے تاریخ پر بھی قلم اٹھایا ہے اور شاعر بھی تھے - ان کی ذات جامع العلوم تھی اور وہ اپنے زمانہ کے بزرگ ترین عالم سمجھے جاتے تھے - " ابن سعود " اپنے زمانہ میں شریعت کے سب سے بڑے عالم تھے اور اسی حیثیت سے معروف ہیں - عربی میں انھوں نے وہ زور قلم پیدا کیا تھا کہ کوئی اور ترک ان کی برابری نہ کرسکتا تھا - یہ دونوں علماء یعنی ' ابوسعود ' اور ' ابن کمال ' آج تک بزم علم و فضل کے مسند نشیں ہیں - عثمانی سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ترکوں کے قوائے روحانیہ میں بھی انحطاط نمودار ہوگیا ' اور اگرچہ ابھی کچھ زمانہ اُدھر تک ترکی کے مدارس میں ' کمالیات ' کا چرچا تھا ' لیکن فکر وخیال کی کوئی جدت ' یا فلسفہ ' کے میدان میں کوئی تازہ خیالی ہمیں نظر نہیں آتی - دینیات اور فلسفہ کی ترقی آج بالکل رک گئی ہے —

سائنس کے شعبہ میں ' ترکوں نے سب سے پہلے فن طب میں ترقی کی - قاموس الہشا ہیر میں ہزاروں نام ترکی النسل اطباء کے نظر آتے ہیں - سنگی تعمیر کا سب سے پہلا شفاخانہ ' بروسا میں ' بایزید ' نے سنہ ۱۴۰۱ ع میں بنوایا تھا - اس کے ساتھ ایک مطب بھی تھا - ' مدرسہ سلیمانی ' اور مدرسہ مسجد فاتح '

میں بھی طب ونانی کی تحصیل ذوق و شوق سے کی جاتی تھی یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اگرچہ علوم دینیہ و فلسفہ کی تحصیل کا ذریعہ عربی زبان ہی تھی ' لیکن کتب طب ترکی زبان میں لکھی جاتی تھیں - ترکوں نے دماغی امراض ' اور ارثی بیماریوں کے قوانین کی دریافت اور تحقیق کرکے فن طب کی خاص خدمت کی ہے - ان کے مشہور اطباء میں سے اسحاق اور حاجی پاشا ( جنھوں نے بعض بلند پایہ علمی رسالے لکھے ) " بایزید " کے زمانہ میں ہوے - اور محمد ' فاتح ' کے عہد میں ' التنجی زادہ ' ' خاویجی زادہ ' ' احمد ' ' علی احمد چلپی ' ' وسیم عباس ' و غیر ہم مشہور ہوے - فن جراحی میں ' خصوصاً کحل کی حیثیت سے ان لوگوں کی شہرت وسطی یورپ تک پہونچی ہوی تھی - دینیات اور طب کے علاوہ ' وقائع نویسی اور فن تاریخ میں بھی ترکی نے خاص مرتبہ پیدا کیا تھا - یہ صحیح ہے کہ ترکوں کے شعری سرمایہ کے مقابلہ میں ان کا سرمایۂ نثر نظر میں نہیں ' جچتا ' لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے ان کا تاریخی سرمایہ ہی بہترین اور علمی حیثیت سے سب سے زیادہ قابل قدر ہے - شروع میں وہ ایرانی طرز تاریخ نویسی کی تقلید کرتے تھے ' لیکن بعد میں لفاظی اور عبارت آرائی کا شوق پیدا ہوگیا ' اور حسن الفاظ حجاب معنی بن گیا - یہ عیب آج تک باقی ہے - سلاطین بھی وقائع نویسی کی قدردانی کرتے تھے ' اس لئے کہ اس سے ان کے کارناموں کو حیات جاوید ملتی تھی ' اور اگرچہ اکثر ترکی تاریخیں اسی یک طرفہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں ' لیکن اگر ان کے متن کی تحقیق اور تنقید کی جاے تو آج بھی ان سے بہت قابل قدر معلومات حاصل ہوسکتی ہے —

'عاشق پاشا زادہ' سب سے پہلا ترکی مورخ تھا - وہ 'بایزید ثانی' کے عہد میں

گزرا ہے' اور اپنے ہم عصر 'نشری' کی "جہاں نما" کی طرح' اس کی تصانیف میں بھی ترکوں کی لڑائیوں کا حال نہایت سادیس اور صاف زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ 'ادریس بطلیسی' نے بھی 'ھشت بہشت' کے عنوان سے فارسی میں ایک تاریخ لکھی ہے' جس میں ادبی رنگ موجود ہے۔ پندرویں اور سولھویں صدی عیسوی کے ترکی مورخین نے فتح 'قسطنطنیہ' سے پہلے کے جو حالات لکھے ہیں' وہ عثمانی شاہنشاہیت کے نقطہ نظر سے لکھے ہیں' وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ترکوں کی ابتدا ایک دیہاتی جماعت سے ہوئی تھی' اور وہ اناطولیہ میں اپنے حریفوں کو صرف اس وقت زیر کر سکے تھے جب "قسطنطنیہ" کی فتح کے بعد ان کا شمار دول عالم میں ہونے لگا تھا۔ "سلیمان" کے زمانے سے ہمیں ترکی تاریخوں میں مقفیٰ عبارت نظر آتی ہے' جس سے ان کا مطلب مبہم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر تو نرے قصیدے ہیں۔ سرکاری وقائع نویسوں کا سلسلہ "خوجہ سعدالدین صاحب تاج التواریخ" سے شروع ہوتا ہے' انہوں نے "سلیم ثانی" کے عہد کی تاریخ لکھی ہے' لیکن ان کا طرز تحریر نہایت مغلق اور بوجھل ہے۔ ترکی تاریخوں میں نائمہ کی کتاب سب سے زیادہ مستند ہے' اگرچہ اس کا طرز بیان بھی عیب سے خالی نہیں۔ دوسرے مورخین 'رشید محمد' 'اسمعیل عاصم' 'عزی سلیمان' 'واصف احمد' 'پچوی' 'سلانیک لی مصطفیٰ' "علی آفندی" 'کاتب چلپی' 'اور منجم باشی' گزرے ہیں۔ ان سب نے تاریخ ترکی کے انقلاب آفریں واقعات پر نظر ڈالی ہے۔ ان کی جامع اور مبسوط تاریخوں کے علاوہ' سیرت' ادبیات' حرم سرا کی زندگی وغیرہ پر علحدہ علحدہ رسائل بھی موجود ہیں' مثلاً مصطفیٰ پاشا کی 'نتائج الوقوعات' 'عطا ئی' کی 'انوروں تاریخی' 'علی آفندی' کی 'مناقب ہلروراں' وغیرہ 'نتائج الوقوعات

میں صرف واقعہ نگاری ہی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے بلکہ سلطنت کے نظم ونسق کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے - 'اندرون تاریخی' حرم سرا کی زندگی کا سچا خاکہ ہے' اگرچہ اس کے طرز تحریر میں تصنع بہت زیادہ ہے - اور اکثر مقامات پر تو ادبیات کے درجہ سے گر کر اس کی حیثیت صرف تک بندی کی سی رہ جاتی ہے قوچی بے کی تاریخی اور نقادانہ تصنیف میں زوال سلطنت عثمانی کے اسباب نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں —

اس مختصر تبصرے میں ترکی جغرافیہ دانوں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہو گا - حدود سلطنت کی وسعت خود جغرافیہ دانی اور جغرافی معلومات کی محرک تھی - اور سولھویں صدی کے بعد سے ہمیں ترکی زبان میں متعدد کتابیں جغرافیہ اور فن جہاز رانی پر نظر آتی ہیں - ان مصنفوں کے علاوہ جن کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے ' 'سپاہ زادہ محمد' اور "امیر محمد ابن حسن" نے سولھویں صدی میں امریکہ کے حالات پہلی مرتبہ ترکی زبان میں لکھے ہیں -

لیکن جو شخص باتفاق رائے ترکی کے باکمالوں کی بزم کا صدر ہے' وہ 'کیاتب چلبی' المعروف بہ 'حاجی خلیفہ ہے' جس نے 'کشف الظنون' کے عنوان سے ایک قاموس لکھی ہے - اس کے علاوہ فن جغرافیہ پر ایک کتاب 'جہاں نما' بھی اسی کی تصنیف ہے- اطلس خورد ( Atlas minor ) کا ترکی ترجمہ بھی اس نے کیا ہے' نیز بحری جنگ پر کئی تالیفوں کا سہرا بھی اس کے سر ہے - 'رئیف محمد' نے سلیم کے عہد میں ( سنہ ۱۷۸۹ ع - سنہ ۱۸۰۷ ع ) انگریزی زبان میں ایک جغرافیہ کی کتاب لکھی اور ایک اطلس ( Atlas ) مرتب کیا تھا —

ترکی ادبیات شروع ہی سے ترکی قوم کی دورخی زندگی کا عکس رہی ہے - حکمران اور تعلیم یافتہ طبقہ کو جمہور کی سادہ اور صاف زبان سے

نفرت تھی ' اس لئے رفتہ رفتہ ایک مصنوعی زبان پیدا ہو گئی ' جس میں فارسی اور عربی کے لغات کی اتنی تھرمار تھی کہ اس کا سمجھنا عوام کی قدرت سے باہر تھا - عثمانیوں کی نظر میں ادبیات کی اصطلاح سے یہی بھرتی کا اور مصنوعی طرز تحریر مراد لیا جاتا تھا جس میں فارسی کی بہت زیادہ تقلید کی جاتی تھی ' اور عوام کے جذبات کا سچا اظہار اگر کہیں نظر آتا تھا ' تو اوریون یا " مدہ " کی کہانیوں میں ' یا پھر " اوتا اوائے نو " کے سوانگ میں ' جو اس میں شک نہیں کہ بازنطینی سوانگوں سے ماخوذ تھا ' لیکن ترکی جمہور کی زندگی اور ذہنیت کا سچا خاکہ تھا - چین سے کٹھ پتلیوں کا ناچ ایشیا ہوتا ہوا ترکی بھی پہونچ گیا تھا ' اور اپنی اسلامی شکل میں بہت مقبول ہوتا تھا - ٹہلتی راتوں میں ' باغوں کی بھینی بھینی خوشبوؤں ' حقہ کی گڑگڑاہٹ اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترکی قہوہ کی سوندھی خوشبو کا مزہ لیتے ہوئے ' لوگ " مدہ " کی باتوں کو بڑے شوق سے سنتے اور اس کے ہاتھوں کے کرتب سے ' نیز اس کی دلچسپ یا مضحک کہانیوں سے بہت کچھ لطف اندوز ہوتے تھے - حرم سرا کی خواتین چوبولے بناتیں اور تہوار کے موقعوں پر مذاقیہ طرز میں انہیں پڑھتیں - پرانی ترکی بحروں کے عام پسند گیت بھی صدیوں تک لوگوں کے دماغوں میں محفوظ اور زبانوں پر چڑھے رہے ' اور بعض حلقے ' مثلاً لیسویون یا بکتاشیوں کے ' اپنے پر معنے گیت ترکی زبان میں بناتے تھے —

لیکن ان چند باقیات کو چھوڑ کر ' تعلیم یافتہ ترکی طبقہ کی ادبیات عروض اور جذبات دونوں حیثیتوں سے غیر ملکی تھی - جیسے جیسے جمہور کی سیاسی اہمیت بڑھتی گئی اور وہ اپنے حقوق کے لئے جد و جہد کرنے

لگے ' ویسے ویسے ' ادبیات نے بھی آہستہ آہستہ عوام کے جذبات کا رنگ قبول کیا - ترکی سر زمین پر سب سے پہلے ' اور سب سے بہتر تصنیف جو ادبیات پر ہوئی وہ " جلال الدین " رومی رح کی فارسی مثنوی تھی ' جس کے صرف دو ترکی شعر شاعر کی ترکی قومیت کا پتہ دیتے ہیں - ان کے فرزند " سلطان ولید " ترکی میں شعر کہتے تھے ' لیکن عروض عجمی تھی - سلطنت عثمانیہ کے قیام و استحکام کے بعد ' " عاشق پاشا " نے " غریب نامہ " اور " سلیمان چلبی " نے " مولودی " خالص ترکی زبان میں لکھے ' لیکن فارسی ادبیات نے بہت جلد ان سر سری کوششوں پر غلبہ پالیا ' اور " سلطان محمد فاتح " ہی کے عہد میں ہم ترکی زبان کو مفرس اور ترکی ادبیات کو فارسی اصل کی نقل پاتے ہیں - بحیثیت مجموعی یہہ کہا جاسکتا ہے کہ افق ایران پر جب کبھی کوئی درخشاں ستارہ طلوع ہوا تو اس کی کرنیں ترکی ادبیات پر ضرور پڑیں - مدرسوں کی عربی تعلیم کا اثر بھی تعلیم یافتہ طبقہ کے ادبی ذوق پر بہت کچھہ پڑا - ترکی ادبیات گویا مسلم ایران کے خیالات کا ذخیرہ ہے - حرمسرائے سلطانی میں ایک خاص قسم کی ادبیات پیدا ہوئی ' جس کا موضوع تمامتر تصوف تھا اور جس میں پروانہ کی داستان عشق و سوز بیان کی جاتی تھی - دیوان مرتب کرنے کا عام طور پر دستور تھا ' جن میں قصائد ' مدحیہ اشعار ' مناجات اور غزلیات ہوتی تھیں - " سلیمان ذی شان " کے عہد میں اس مذہب ادبیات کا سب سے پہلا اور مشہور نمائندہ " فضولی بغدادی " ہوا ' جس کی زبان اگرچہ غیر شستہ دیہاتی ترکی ہے ' لیکن اس کا دیوان اور " لیلی مجنوں " اس کے شاعرانہ کمال کا ثبوت ہیں " فضولی " سے زیادہ مشہور شاعر اور ( وہ بھی صرف شستگی زبان کے اعتبار سے ) " باقی " ہوا '

جس کا زمانہ سترھویں صدی کا ہے اور جسے ترکی غزل گو شعرا کا سر تاج کہا جاتا ہے ' لیکن جدت طبع کے اعتبار سے " فضولی " کا رتبہ " باقی " سے بڑھا ہوا ہے ۔ " باقی " کے ہم عصروں میں حسب ذیل مشہور ہیں ۔ " ذاتی " ( صاحب " شمع و پروانہ " ) " لامعی " " روحی " اور " یحییٰ بے " ( صاحب " شاہ و گدا " ) ۔ ترکی ادبیات کا طرز اور عام مذاق ہوبہو ایرانی اصل کی نقل تھا ۔ تقلید اور تصنع کا یہہ رجحان سترھویں صدی میں بہت زیادہ بڑھ گیا تھا ۔ " نفعی " اور اس کے معاصرین صرف صناعع لفظی پر جان دیتے تھے اور جذبات نگاری کی مطلق فکر نہ کرتے تھے ۔ خصوصاً " نرگسی ' نے تو اس بارہ میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ اس کا سارا کلام شاعری نہیں بلکہ محض رعایت لفظی ہے —

اٹھارویں صدی میں طرز ادا اتنا پیچ در پیچ ہوگیا تھا کہ بغیر مبسوط شرحوں کے شعر پڑھنا اور سمجھنا ممکن نہ تھا " ندیم " کا طرز ' جو غزل گو شعرا میں سب سے زیادہ رنگین بیان ہے ' البتہ کسی قدر صاف اور سادہ ہے ۔ " راغب پاشا " فلسفیانہ شاعری کے نمائندے ہیں ' اور " فطنت خانم " اس عصر کے نسائی جذبات کی آئینہ دار ہیں ۔ انیسویں صدی سے صاف اور سادہ شاعری کا دور شروع ہوتا ہے ' اور شیخ " غالب " ( " محمد اسد " ) کی مثنوی " حسن و عشق " اور ان کا دیوان متقدمین کی لفاظی اور لفظ بازیوں سے پاک نظر آتا ہے ۔ دیوان مرتب کرنے کا مذاق بھی اسی زمانہ سے گھٹنا شروع ہوتا ہے ' اور " سنبل زادہ " ۔ " وہبی " " سروری " اور " کے چی زادہ عزت ملا " اس رنگ کی ادبیات کے آخری نمائندہ ہیں ۔ مصلح اعظم " سلطان محمود ثانی " کے زمانہ سے یہہ محسوس ہونا شروع ہوگیا کہ سلطنت عثمانی ' ذہنی اور مادی دونوں حیثیتوں سے زوال پذیر ہوتی جارہی ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ کے مشہور مدبرین سلطنت ' مثلاً " پرتو " اور " عاطف پاشا " اور ان کے بعد ' " عبدالمجید " " رفعت " اور " رشید پاشا " سرکاری مراسلات کی مقفیٰ اور مرصع عبارتوں سے بہت بد دماغ ہوتے تھے ' اور سلاست کی کوشش کرتے تھے - ادبیات میں بھی اسی قسم کا رجحان نظر آتا ہے - ایک اور چیز جس نے ادبیات کے رخ اور مذاق کو دوسری طرف پھیر دیا ' 'یورپ' کا اثر تھا ' جس کے ساتھ ترکوں کے براہ راست تعلقات 'نپولین' کے زمانے سے پیدا ہوچکے تھے - اس اثر سے ادبیات میں ایک امید افزا نشاۃ ثانیہ نمودار ہوگئی —

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کرچکا ہوں ' ترکوں میں قدرت کی طرف سے تقلید اور اخاذیت کا ایک عجیب و غریب ملکہ ودیعت کیا گیا ہے ' جس کی وجہ سے وہ دوسری اقوام کی روح اور کارناموں کو اپنے اندر جذب کرکے ان سے اپنے حسب مطلب کام لے سکتے ہیں - ترکوں کی اس اخاذیت کی عظیم ترین یادگار ان کا فن تعمیر ہے - سلجوقی ترک ایران اور شام ہوکر آے تو اپنے ساتھ ' اناطولیہ میں عربی ۸ ایرانی طرز تعمیر بھی لاے اور یہاں بازنطینی طرز سے مدد لیکر اس میں مزید ترقی کی - ترکوں نے ان مختلف نمونوں اور طرزوں کی محض کورانہ تقلید ہی نہیں کی' بلکہ ان کی طباعی نے ان اجزا سے ایک مخصوص ترکی فن تعمیر پیدا کردیا ' جو بذات خود عربی ' ایرانی اور یونانی فن تعمیر کی تمام حسین اور دلکش خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے —

ترکی فن تعمیر کی سب سے پہلی یادگاریں 'ازنک' اور 'بروسا' میں ملتی ہیں جو ہونہار سلطنت عثمانی کا پہلا دارالخلافہ تھا - یہ زیادہ تر سلجوقی طرز کی پہلک عمارتیں ہیں ' مثلاً مسجد ' مدرسے ' مقبرے وغیرہ -

مسجدوں کی دیواروں اور گنبد میں سبز پتھر دیا گیا ہے ' جس کی وجہ سے وہ " اخضر " کہلاتی ہیں - سلجوقی تعمیر میں دروازوں پر کھدائی اور آرائش کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا - یاد رکھنا چاہئے کہ ایشیائے کوچک کی نسبتاً سرد آب و ہوا کی وجہ سے کھلے صحنوں میں مصلے نہ بنائے جاسکتے تھے ' اس لئے بند دالانوں کی ضرورت پڑی اور دروازوں کی اہمیت زیادہ ہوگئی - مسجدوں کی دیواروں پر اعلیٰ درجے کے رنگین پتھر لگانے کا طریقہ ایرانی ہے اور ' بورسا ' اور ' از نک ' کی مسجدوں میں بھی یہی استعمال کیا گیا ہے - مسجدوں کی مکانیت کسی قدر کم ہوتی تھی اور چھتیں بغیر ستون کے بنائی جاتی تھیں - چونکہ ترک بڑی جگہ کے اوپر ایک گنبد نہ بناسکتے تھے ' اس لئے انھوں نے گنبد کی تعداد زیادہ کرکے ان کا دور کم کردیا ' لیکن چونکہ یہ سب گنبد ایک ہی سطح پر ہوتے تھے جس سے بلندی کا اندازہ نہ ہوتا تھا ' اس لئے بہت جلد یہ ترمیم کرکے گنبد کے بیچ کا گنبد ادھر ادھر کے گنبد سے اونچا بنایا جانے لگا —

ویسے تو بازنطینی طرز تعمیر کا اثر پہلے ہی سے بالواسطہ ترکوں پر پڑچکا تھا ' لیکن فتح ' قسطنطنیہ کے بعد وہ اور نمایاں ہوگیا - چونکہ سلطنت بہت وسیع تھی اس لئے پبلک عمارات کی تعمیر کے لئے روپیہ کی کمی نہ تھی ' اور پھر معاشرتی ضروریات کے روز افزوں اضافہ ' سے مسجدوں اور مقبروں کے علاوہ دوسری عمارتوں کی بھی ضرورت پڑی مثلاً کنوے ' کاروان سرائیں ' بازار ' محلات وغیرہ - ' ایا صوفیہ کا یونانی گرجا ترکی مساجد کے لئے نمونہ قرار پایا اور ' مسجد بایزید ' ' مسجد شہزادہ ' ' مسجد سلیمانی ' ' مسجد سلطان احمد ' اور ' ینی جامع ' سب اسی نمونہ پر بنائیں گئیں - ان سب عمارتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ بیچ میں ایک بڑا بلند گنبد ہوتا ہے جس کے گرد و پیش چھوٹے چھوٹے چھوٹے گنبد ہوتے ہیں اور یہ سب کے سب نہایت پائدار گول

ستونوں پر قائم ہوتے ہیں - دیواریں اتنی موٹی اور بھاری نہیں ہوتیں جتنی کہ بازنطینی عمارتوں کی - محرابیں یا گول ہوتی تھیں یا نوکدار لیکن کشادہ بہت ہوتی تھیں ستونوں کی کارنس پر خوشہ نما کام ہوتا تھا - انھوں مسجد دالان در دالان ہوتے تھے اور اس کے پیچھے چوٹی چھوٹی گنبدیوں کے نیچے ' عمارت خانہ ' یعنی طالب علموں کے حجرے ہوتے تھے —

بازنطینی گرجوں کے سنہری پتروں اور مقدس تصویروں کی بجائے' مسجد کی اندرونی دیواروں پر عربی عبارتیں اور چاروں خلفاء کے نام کندہ ہوتے تھے - ایک ترمیم ترکوں نے ایسی کی جس سے بازنطینی طرز کی عمارتوں کا حسن دو بالا ہوگیا ' یعنی مینار کی تعمیر - عربی اور ایرانی طرز تعمیر میں میناروں کی شکلیں مختلف ہیں ' مگر ترکوں نے اس میں اس طرح سادگی کی شان پیدا کی کہ انھوں نے چکنے ' ستول اور بلند مینار بنائے جن کی چھت بہت سادہ ہوتی تھی ' البتہ برآمدوں پر گندھے ہوئے ہاروں کی طرح نقش و نگار بناکر ان کی شان دو بالا کردی جاتی تھی - جزیرہ نمائے ' استامبول ' کے اس حصہ پر جو آگے کی طرف نکلا ہوا ہے اور جو اپنے محل وقوع کے اعتبار سے دنیا کی بہترین جگہوں میں ہے ' ترکوں نے قدیمی بازنطینی محل کے موقع پر ایک محل تعمیر کیا تھا - اس محل کی تاریخ خاصی طویل ہے ' اس لئے کہ ہر سلطان نے اس میں متعدد عمارات کا اضافہ کیا ہے - اس کے سب سے زیادہ قابل توجہ حصوں میں ایک تو حرم ہے جس کی دیواروں پر پتھر کا کام لاجواب ہے ' اور دوسرا بغداد کو شک ہے جسے ' مراد چہارم ' نے دوبارہ بغداد فتح کرنے کے بعد تعمیر کیا تھا - ان عمارتوں کے معمار زیادہ تر نو مسلم یونانی تھے - انھیں میں سے ایک مشہور معمار ' صنعان ' تھا جس کی تخلیقی قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنی عمر میں کم وبیش

آسی ۸۰ مشہور پبلک عمارتیں بنائیں !

دنیاے اسلام میں ایک جامع مسجد ایسی بھی ہے جس کے چھ مینار ہیں - اسے سلطان احمد نے ' مشہور تاریخی رومی میدان پر ' تھیوڈوسی یس ' ( Thodosius ) کے مخروطی مینار ( Obelisk ) اور ' پلے ٹائیا ' ( Plataia ) کے میدان جنگ کے سامنے تعمیر کرایا تھا - اس کا معمار ' صنعان ' ہی کا ایک شاگرد ' محمد آغا ' تھا —

اٹھارویں صدی سے طرز تعمیر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے: اس زمانے میں چاہات اور محلات بکثرت تعمیر ہوے لیکن ان میں سے اکثر یا تو نذر آتش ہوگئے یا زلزلوں سے مسمار ہوگئے - 'احمد ثالث' کا بنوایا ہوا خوبصورت کنواں' اور مسجد نور عثمانی ' اور 'لالیلی جامع' جو دونوں حسین عمارتیں ہیں اسی زمانہ کی یادگار ہیں -ان معماروں کے کام میں ہمیں یورپی طرز تعمیر کا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ حد سے زیادہ نقش و نگار بنا دیے جاتے تھے — خفیف سا اثر نظر آتا ہے ' بعد کو نقش و نگار کی اس افراط ہی کی وجہ سے فن تعمیر میں زوال پیدا ہوگیا - انیسویں صدی کی عمارتیں تو بالکل ہی یورپی نمونوں کی نقل ہیں —

قسطنطنیہ' جس سے زیادہ خوبصورت موقع دنیا کے کسی اور شہر کو نصیب نہیں ہوا' بہت جلد 'شاخ زرین' کے دونوں کناروں پر پھیلنے اور بڑھنے لگا - لکڑی کی عمارتوں بننے لگیں جن کے منقش بالا خانے آگے کی طرف نکلے ہوتے تھے' اگرچہ یہ مکانات انسانی مسکن کی بجاے پرندوں کی کابکیں معلوم ہوتی تھیں' تاہم ان سے شہر میں ایک خاص شان اور بوقلمونی پیدا ہوگئی - جالی دار جھروکوں سے' جن کے پیچھے نازنینیں حرم رہا کرتی تھیں' خاموش اور پر سکون گلیوں میں ایک خاص پر اسرار کیفیت پیدا ہوتی تھی - امرا کے 'قونق' (محل) میں تو خیر بیش بہا قالین اور آرائش کی چیزیں ہوتی ہی تھیں' لیکن غریب سے غریب ترک بھی اپنے مکان کو صاف ستھرا اور قالین کے فرش سے آراستہ رکھتا تھا —

ہر اسلامی ملک کی طرح، ترکی میں بھی خانوادانی معاشرت کی یہ خصوصیت تھی کہ عورت اور مرد الگ الگ رہتے تھے۔ جب سلاطین کا اقتدار بہت بڑھ گیا تو امرا کے گھرانوں میں شادیاں کرنے کی بجائے وہ اکثر لونڈیوں کو اپنے حبالہ عقد میں لاتے تھے، اور ان سے اولادیں پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن یہ رسم امرائے سلطنت نے اختیار نہیں کی، وہ حسب دستور، شادی بیاہ کے قدیم طریقوں پر قائم رہے۔ اگرچہ غلاموں اور لونڈیوں کی کثیر تعداد کا رکھنا ان کے یہاں بھی فیشن میں داخل ہوگیا تھا —

ترکوں کی معاشرتی زندگی کے دو رخ ہوگئے تھے۔ مرد قہوہ خانوں میں بیٹھکر شعر شاعری یا قصہ خوانی سے اپنا دل بہلاتے تھے، عورتیں جمعہ کے روز کشتیوں میں بیٹھکر باغوں اور پھلواریوں میں تفریح کے لئے جایا کرتیں۔ شعر خوانی، موسیقی، اور ریشم اور سمور کے قیمتی لباسوں کی نمائش سے ان سیروں کا لطف اور دوبالا ہوجاتا تھا —

ترکی معاشرت کی اقتصادی بنیاد زمین اور اس کی پیداوار تھی۔ جاگیریں اسامیوں کو پٹہ پر دی جاتیں اور ان کی نگرانی بہت مشقت سے کی جاتی۔ یہی آبادی کی خوراک کا ذریعہ تھیں۔ زراعت کے علاوہ، صنعت و حرفت میں بھی، خصوصاً ایسی صنعتیں جن سے فوجی اغراض اور مشرقی زندگی کی ضروریات پوری ہوتیں، بہت جلد ترقی ہوئی، اور یہی شہری باشندوں کا وسیلہ معاش تھیں۔ ہر قسم کے صناعوں کی اپنی علحدہ علحدہ پنچائتیں تھیں، اور مختلف اہل حرفہ خود کو خاص خاص پیروں سے منسوب کرتے تھے۔ اولیائے چلبی نے جو سترویں صدی میں ترکوں کا سب سے بڑا سیاح ہوا ہے، پنچائتوں کے ایک جلوس کا نہایت مفصل حال لکھا ہے، اس میں ہمیں بعض ایسے پیشے بھی نظر آتے ہیں جو آج معدوم ہیں۔ بازار میں چوڑے، ٹین، تانبے، اون اور ریشم کا ہمہ قسم کا مشرقی سامان موجود رہتا، جو یا تو خود ترکی کا بنا ہوا ہوتا، یا پھر کاروانوں کے ذریعہ دنیا کے ہر

حصہ سے لایا جاتا - جنووا (Genoa) اور وینس (Venice) کے تجارتی بیڑے ایشیا اور یورپ کے سامان کی تجارت کرتے تھے - ترک بحری تجارت کی طرف سے غافل تھے انھوں نے اسے غیر ملکیوں یا اپنی عیسائی رعایا کے اوپر چھوڑ دیا تھا —

ترک بالطبع سپاہی اور منتظم، منصف مزاج، اور امن و امان کا محافظ تھا - اس کی ساری دولت، یا تو اس کی اپنی املاک ہوتی، یا پھر ذاتی تنخواہ - عیسائی رعایا تجارت کے تمام منافع اور شعبوں پر قبضہ کرکے اتنی متمول ہوگئی تھی کہ مسلمان، رعایا جن کی اولادیں سلطنت کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں سر کٹاتی تھیں ان کو رشک اور حسد کی نظروں سے دیکھنے لگی تھی - عیسائی فوجی خدمات سے مستثنیٰ تھے، جس کا بار سب سے زیادہ مسلمان ترکوں ہی کے اوپر تھا - اور جس شجاعت اور حکم الہی کی سچی اطاعت کے ساتھ یہ مسلمان ترک اس بار کو اٹھاتے تھے، وہ مستحق صد ہزار آفریں ہے - یہی لوگ اسلام کے بہادر ترین مجاہد تھے اور ایسے زمانہ میں جب کوئی اور مسلمان قوم یورپ کی چیرہ دستیوں کی تاب نہ لاسکتی تھی، اسلامی تہذیب، اسلامی علوم و فنون، اسلامی ادبیات، اور اسلامی زندگی کی خدمت کرنے والے اور اسے زندہ رکھنے والے یہی ترک تھے - اپنے کارناموں سے انھوں نے ثبات عزم اور قوت ارادی کی ایسی مثال دنیا کے سامنے پیش کردی ہے کہ اگر دوسری مسلمان قومیں اسے سمجھیں اور تہذیب اور تمدن کے شعبوں میں اس سے کام لیں، تو ان میں خودی کا احساس اور خود اعتمادی کی صفت پیدا ہوجائے۔

# ادبیات کی تعریف

از

( ترجمۂ مضمون ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور مترجمۂ جناب یلدت
و نھی دھر صاحب و دیا النکار لکچرار اورنگ آباد کالج

بیرونی دنیا ہمارے دل کے اندر داخل ہو کر ایک دوسری دنیا بن جاتی ہے - اس اندرونی دنیا میں بیرونی دنیا کی صرف شکلیں ' رنگ ' آواز وغیرہ ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے ساتھ ہماری پسند اور نا پسندیدگی ' ہمارا خوف اور حیرت اور ہمارا رنج و راحت بھی شریک رہتے ہیں - یہ بیرونی دنیا ہمارے دل کی مختلف حالتوں کے عجیب اور لطیف احساسات میں طرح طرح سے اپنا عکس دکھاتی ہے —

اِس دل کے احساسات کے رس میں ہم اس بیرونی دنیا کو تحلیل کر کے خاص طور پر اپنا بنا لیتے ہیں - جس طرح جن کے معدے میں عرق ہاضم کافی مقدار میں نہیں ہوتا وہ بیرونی اغذیہ کو جز و بدن نہیں بنا سکتے اُسی طرح دنیا میں جو لوگ دل کے احساسات کے عرق ہاضم کا استعمال کافی مقدار میں نہیں کر سکتے وہ بیرونی دنیا کو اندرونی دنیا اپنی دنیا یعنی انسانی دنیا نہیں بنا سکتے —

بعض لوگ اس طرح کی غیر حساس طبیعت رکھتے ہیں جن کے دلوں

میں دنیا کی چیزیں بہت ہی کم کشش رکھتی ہیں وہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے سے محروم رہتے ہیں - اُن کے دل کی کھڑکیاں تعداد میں کم اور وسعت میں تنگ ہوتی ہیں اور اسی لئے وہ دنیا میں رہ کر بھی اس دنیا سے الگ سے رہتے ہیں —

بعض اس طرح کے خوش قسمت لوگ بھی ہیں جن کی محبت، حیرت اور تخیل ہر جگہ بیدار رہتا ہے - فطرت کے گوشے گوشے سے انھیں ایک پیغام ملتا ہے - دنیا کی طرح طرح کی تحریکات اُن کے دل کی بین کے تاروں کو طرح طرح کی راگنیوں میں متحرک کر دیتی ہیں —

بیرونی دنیا ان کے دلوں میں احساسات کے مختلف رسوں، مختلف رنگوں اور مختلف سانچوں میں ڈھل کر کئی طرح کی شکلیں اختیار کر لیتی ہے —

حساس دل رکھنے والوں کی یہ دنیا بیرونی دنیا کی بہ نسبت انسان کی زیادہ اپنی ہے یہ دنیا دل کی مدد سے انسان کے دل کے لئے زیادہ قابل فہم بن جاتی ہے - یہ دنیا دل کے اثرات سے جو خصوصیت حاصل کرتی ہے انسان کے لئے وہی سب سے زیادہ قابل قبول ہوتی ہے —

اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ بیرونی دنیا میں اور انسانی دنیا میں بہت فرق پایا جاتا ہے - کونسی چیز سفید ہے کونسی سیاہ ہے، کونسی بڑی ہے، کونسی چھوٹی ہے انسانی دنیا صرف ان کی اطلاع ہی نہیں دیتی بلکہ کونسی چیز پسند ہے کونسی چیز ناپسند، کونسی اچھی اور کونسی بری اسی بات کو مختلف سروں میں کہتی ہے

یہی انسانی دنیا ہر انسانی دل میں سے بہتی ہوئی آتی ہے - اس کی یہ روانی گو ہمیشہ قدیم لیکن نت نئی ہے - نئے نئے حواس اور

نئے نئے داؤں کے اندر ہوکر یہ ازلی سوتا ہمیشہ سے فیا ہوکر بہ رہا ہے —

لیکن اسے کس طرح حاصل کیا جائے اور کس طرح اس پر قابو کیا جائے - اس عجیب و غریب و حسین دل کی اندرونی دنیا کو شکل دے کر دوبارہ ظاہر نہ کرسکنے پر یہ ہمیشہ پیدا ہوکر معدوم ہوتی رہتی ہے —

لیکن یہ چیز معدوم نہیں ہونا چاہتی بلکہ یہ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے بے چین رہتی ہے - اسی وجہ سے ازل سے انسان کے اندر ادبیات کی آمد کا تانتا بندھا رہتا ہے —

ادبیات کا خیال کرتے وقت دو باتوں پر غور کرنا پڑتا ہے - ایک تو یہ کہ مصنف کا دل دنیا پر کس قدر محیط ہے دوسرا یہ کہ وہ کس حد تک دوام کی شکل میں ظاہر ہوا ہے —

ہمیشہ ان دونوں کے بیچ میں اتحاد نہیں ہوتا اور جہاں ہوتا ہے وہاں سونے پر سہاگا ہوتا ہے - شاعر کا زندہ تخیل رکھنے والا دل جتنا بسیط ہوتا ہے اس کی تحریر کی گہرائی میں اُسی قدر ہمارا سکون بڑھ جاتا ہے، اتنی ہی انسانی دنیا کے وسیع ہوجانے سے ہماری دائمی مسرت کا جولانگاہ وسعت حاصل کرلیتا ہے —

لیکن شاعرانہ استعداد بھی ادبیات میں بہت قیمتی چیز ہے کیونکہ جس کا سہارا لے کر یہ استعداد ظاہر ہوتی ہے اُس کی بہ نسبت اس کے بے حقیقت ہونے پر بھی یہ استعداد بالکل ضائع نہیں ہوتی، یہ زبان اور ادبیات میں جمع ہوتی رہتی ہے - اس کے ذریعے سے انسان کی قوت اظہار بڑھ جاتی ہے - اس قوت کو حاصل کرنے کے لئے انسان ہمیشہ سے کوشاں رہا ہے - جس مصنفوں کی مدد سے انسان کی یہ قوت تقویت حاصل کرتی ہے انسان اُن

کی عظمت کو بنا کر اُن کے احسان سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے —

جو دلی دنیا دلی جذبات کے ساز و سامان سے پیدا ہوتی ہے اُسے باہر نمودار کرنے کا کونسا طریقہ ہے؟ اسر کو اس طرح نمودار کرنا ہو گا جس سے دلی جذبات صاف طور پر ظاہر ہو جائیں - دلی جذبات کو صاف طور پر ظاہر کرنے کے لئے بہت سے ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے —

مرد کے دفتر جانے کا لباس سیدھا سادھا ہوتا ہے - وہ جتنا کم ہو اتنا ہی کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے - صنف نازک کے لباس کی سج دھج، شرم و حیا، ناز و انداز یہ تمام چیزیں مہذب طبقوں میں مروج ہیں —

اس صنف کا کام دل کا کام ہے - اُن کو دل دینا پڑتا ہے اور دل کو اپنی طرف کھینچنا پڑتا ہے - اس لئے اُن کے بالکل سیدھے سادے اور نپے تلے ہونے سے اُن کا کام نہیں چل سکتا —

مردوں کو حتی الامکان مناسب و موزوں ہونا چاہئے لیکن عورتوں کا خوبصورت ہونا ضروری ہے - مردوں کا طرز عمل صاف اور سیدھا ہونا چاہئے لیکن صنف نازک کے طرز عمل بہت سے اشاروں اور کنایوں سے لبریز ہونا چاہئے —

ادبیات بھی دل پر اثر انداز ہونے کے لئے صنعتوں، تشبیہوں، بحروں اور اشاروں کنایوں کا سہارا لیتی ہے - فلسفہ اور سائنس کی طرح سیدھا اور صاف ہونے سے اس کا گزارا نہیں ہو سکتا —

اگر ہم کسی عجیب و غریب خوبصورت تصور کو باہر مشکل کریں تو زبان کے اندر اس کے اظہار کی ناممکنیت کی جھلک دکھائی پڑتی ہے - جس طرح صنف نازک کا حسن اور ضیا ہوتی ہے ادبیات کے اظہار کی قابلیت بھی ویسی ہی ہوتی ہے - وہ تشکیل کی حد سے باہر ہے اور تمام صنعتوں سے بالا تر ہو جاتی ہے - صنعتوں کے ذریعے سے اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا

ادبیات اس بیان سے بالا تر چیز کو احاطہ کرنے کے لئے زبان میں خصوصیت کے ساتھہ دو چیزوں کو ملایا کرتا ہے - ایک شبیہ کو اور دوسرے موسیقی کو —

زبان کے ذریعے جو چیز بیان نہیں کی جا سکتی اُسے تصویر کے ذریعے بتلانا پڑتا ہے - ادبیات میں اس طرح کی مصوری کی کوئی حد نہیں - جذبات ، تشبیہ ، مقابلہ اور صنائع بدائع کے ذریعے سے پیش نظر ہونا چاہئے ہیں - " دیکھی بارے آنکھی پانکھی دھائے " یعنی دیکھنے کے لئے آنکھہ یہ پرندہ ( آنکھہ کا پرندہ ) دوڑتا ہے - اس ایک بات میں شاعر بلرام داس نے کیا کچھہ نہیں کہہ دیا - صرف بیان کرنے میں بے چینی آنکھوں کے اضطراب کا اظہار کس طرح کیا جا سکتا ہے - نظر پرندے کی طرح اڑ کر دوڑی ہے اور پل بھر میں اس تصویر سے اس کے بیان کی بے چینی کو بڑی حد تک اطمینان ہو گیا ہے —

اس کے علاوہ بحروں میں ، لفظوں میں اور فقرہ بندی میں ادبیات کو موسیقی کا سہارا تو لینا ہی پڑتا ہے - حس چیز کو کسی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا اُسے موسیقی کے ذریعے کہنا پڑتا ہے - جو چیز معنی کی تشریح کرنے پر بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے وہی موسیقی میں آکر غیر معمولی بن جاتی ہے - یہ موسیقی ہی الفاظ میں درد پیدا کر دیتی ہے —

اس لئے مصوری اور موسیقی ہی ادبیات کے اصل اسباب ہیں - مصوری جذبات کو مشکّل کرتی ہے اور موسیقی ان میں تحریک پیدا کرتی ہے - تصویر جسم ہے اور موسیقی روح ہے —

لیکن صرف انسان کا دل ہی ادبیات میں محصور کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ انسان کی فطرت بھی ایک اس طرح کی تخلیق ہے جو بے جان مخلوق کی طرح ہمارے احساسات کے ذریعے ہمارے قابو میں نہیں آتی - وہ صرف

"کھڑے" ہوجاؤ کہنے سے کھڑی نہیں ہو جاتی، وہ انسان کے لئے بے انتہا حیرت پیدا کرنے والی چیز ہے - لیکن اُس کو (باڑے) کے جانور کی طرح باندھ کر ایک بڑے پنجرے میں بند کرکے ٹکٹکی لگا کر دیکھنے کا کوئی آسان طریقہ نہیں ہے انہیں سخت قانونوں سے بالاتر عجیب و غریب انسانی فطرت ہے - ادبیات اسی کو اندر کی دنیا سے باہر لاکر قیام کی شکل دیتا ہے - یہ بے انتہا نا قابل فہم کام ہے کیونکہ انسانی فطرت دوامی اور یکساں رہنے والی نہیں ہے - اُس کے بہت سے حصے اور طبقے ہیں - اس کے اندر باہر بے روک ٹوک آمد و رفت کرنا آسان نہیں ہے - اس کے علاوہ اس کی نمود و نمائش (لیلا) اتنی باریک اتنی نا قابل فہم اور ایسی دفعتاً ہونے والی ہوتی ہے کہ اُسے پورے طور پر ہمارے دل میں بٹھا دینا غیر معمولی قوت کا کام ہے - ویاس، والمیکی، کالیداس وغیرہ یہی کام کرتے آئے ہیں —

اگر ہمارے اس سارے مضمون متذکرہ کو مختصر طور پر کہا جائے تو یہی کہنا پڑے گا کہ ادبیات کا مضمون انسانی دل اور انسانی فطرت ہے —

لیکن انسانی فطرت کہنا بھی گویا ضرورت سے زیادہ ہے در اصل باہر کی قدرت اور انسانی فطرت انسان کے دل کے اندر ہر لمحہ جو شکل اختیار کرتے ہیں، جس نغمے کو بلند کرتے ہیں زبان میں احاطہ کی ہوئی وہی تصویر اور وہی نغمہ ادبیات ہے —

خدا کی مسرت قدرت اور انسانی فطرت میں اپنے آپ کو پیدا کر رہی ہے - انسان کا دل بھی ادبیات میں اپنے آپ کو پیدا کرنا اور نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے - اس کوشش کی کوئی حد نہیں ہے یہی ایک عجیب بات ہے - شاعر انسانی دل کی اس دوامی کوشش کا صرف ایک معمولی توسط ہے —

خدا کی مسرت کا وجود اپنے اندر سے خود بخود نکل رہا ہے - انسانی

دل کی مسرت کا وجود اسی کی صدائے بازگشت ہے - اسی دنیاوی وجود کے نغمۂ مسرت کی جھنکار ہمارے دل کی بین کے تاروں کو آئے دن مرتعش کرتی رہتی ہے - یہی جو دلی نغمہ ہے ' خدا کی قدرت کے جواب میں ہمارے اندر جو قدرت نمایاں ہوتی ہے ' اس کا ارتقا ادبیات ہے - دنیا کی سانس ہمارے دل کی بانسری میں کس راگنی کو بجا رہی ہے ادبیات اُسی کو صاف طور پر ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے - ادبیات کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہے اور نہ اُس کی ملکیت ہے جو اُسے بناتا ہے وہ تو خدائی زبان ہے - باہر کی دنیا جس طرح اپنی اچھائی برائی اپنی غیر تکمیل یافتگی کو لے کر ازل سے نمایاں ہونے کی کوشش کر رہی ہے اسی طرح یہ خدائی زبان بھی ملک ملک میں زبان زبان میں ہمارے دل کی اندرونی لہروں سے باہر آنے کے لئے لگاتار کوشش کر رہی ہے —

———— ‡*‡ ————

# آزاد بدایونی کے متعلق غلطی کی اصلاح اور بعض آن پڑھ شاعروں کے حالات

از

" قمر " بدایونی

( میں جناب قمرالحسن صاحب قمر بدایونی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے آزاد بدایونی کے حالات کے متعلق مصنف سے جو بعض غلطیاں ناواقفیت کی وجہ سے ہوگئی تھیں اُن کی اصلاح اس مضمون میں فرمادی ہے اور اسی ضمن میں بعض ان پڑھ شعرا کے دلچسپ حالات بھی درج فرما دئے ہیں جو شکر گزاری کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں - اڈیٹر )

رسالہ " اردو " مطبوعہ جولائی سنہ ۲۹ ع میں " اردو کے آن پڑھ شاعروں " کا تذکرہ شروع کیا گیا ہے - اس میں " آزاد بدایونی کے متعلق فقرات مندرج ذیل قابل تصحیح ہیں —

( ۱ ) " یہ اسی شاعر قصبۂ بدایوں میں پیدا ہوا نہایت وارستہ طبیعت و آزاد مزاج تھا "

( ۲ ) " خاندان میں لوہاری کا کام چلا آتا تھا اسے بھی یہی پیشہ تعلیم کیا گیا "

( ۳ ) " مسلم هوسٹل الہ اباد میں صحبت مشاعرہ تھی ... جناب " آسی " بھی بغرض شرکت مشاعرہ گئے تھے وھاں جناب قمر بدایونی سے ملاقات ھوئی اور آزاد کا تذکرہ چھڑا ... "

تصحیح

( ۱ ) آزاد مرحوم زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے -- لیکن اپنی غزل اپنے ھاتھہ سے لکھہ سکتے تھے -- ایک کتاب ( غالباً زھر عشق ) ان کے ھاتھہ کی لکھی ھوئی ان کے صاحبزادہ خان بہادر منشی احمد علی خاں صاحب " میکش " کے پاس موجود ھے —

( ۳۵۲ ) لوھاری سے ان سے کوئی تعلق نہیں تھا -- اس مغالطہ کی وجہ غالباً یہ ھے کہ جب مجھے آسی صاحب نے ظریف اور ھزل گو شعرا کا تذکرہ لکھنے کا ذکر کیا تھا تو میں نے کاظم لوھار کا ذکر کرتے ھوئے جو آزاد کے ھم عصر تھے ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ بدایوں پہونچکر ان کے اشعار تلاش کروں‌گا اور اسی سلسلہ میں آزاد کا یہ شعر سنایا تھا جو رسالہ اردو میں شایع ھوا ھے -- ؛ آسی ' صاحب کے حافظے نے ان دو شاعروں کے حالات کو ایک ھی ذات میں جمع کر کے محفوظ کرلیا - اور یہ ایک اتفاقی غلطی ھے مگر قابل تصحیح —

آزاد بدایونی کے صحیح حالات

" آزاد " مرحوم کا تذکرہ مختصر طور پر میں نے بہ سلسلہ مرحوم شعراء بدایوں " تجلیات سخن " کے مقدمے میں کیا ھے - ان کا نام محمد علی خاں اور ان کے والد کا نام قادر خاں تھا - بدایوں محلہ چاھمیر کے ساکن تھے ان کا مکان اور خاندان اچھی حیثیت میں اب تک موجود ھے - کلام ظریفانہ نہ تھا - اور باوجود کم علمی کے شعر خوب کہتے تھے اور اگر کوئی قدیمہ نظام کرنے میں یا جدت کی رو میں کوئی ایسا مضمون جو اپنی کسی خصوصیت سے

ظرافت کی حد کے قریب پہونچ جائے جیسا کہ میں ان کے ایک شعر میں دکھاؤں گا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کا نام ظریف شعرا کی فہرست میں لکھ لیا جاے - کیونکہ یہ جدت بعض بعض موقعوں پر اچھے اچھے شاعر کر گزرتے ھیں مثلاً مرزا داغ مرحوم کا یہ مصرعہ " ایسے کے دولگائے بھگو کر شراب میں" مرزا غالب مرحوم کا یہ شعر - " دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں - ھم ھي کربیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن " یا منیر شکوہ آبادی کے کلام میں - " ڈولی آتی ھےان کےگو نے کي پھول تکتے ھیں راہ دونے کی " یا " اب کے سگان کوئے صنم بھیڑئے ھوے-" علی ھذا سارے کبوتر آپ کے کلپوتئے ھوے " اسی جدت یا زور طبیعت کی رو کے نمونے ھیں - آزاد مرحوم کا انتقال سنہ ۱۲۷۶ ھ مطابق سنہ ۱۸۵۹ ع میں ھوا —

رسالہ اردو مذکورۂ بالا میں " آزاد " کا یہ مقطعہ درج ھے —

آزاد کی ھے خانہ بدوشی کا یہ عالم کا ندھے پہ لئے پھرتے ھیں چھپر کئی دن سے

اس کے متعلق یہ واقعہ مشہور ھے کہ جب مشاعرے میں آزاد نے مقطع کا دوسرا مصرعہ پڑھا تو قافیہ بجاے چھپر کے بستر تھا مگر یاران طریقت نے تعریف کے سلسلہ میں جب اس کو دھرایا تو بستر کی جگہ چھپر ترمیم کردیا اور یہ ترمیم اس قدر مقبول ھوئی کہ مقطعہ اسی طرح زبان زد عام ھوگیا . یہ روایت ان لوگوں کی ھے جو ان کے ھمعصر تھے اور اب تک زندہ ھیں - اس غزل کا مطلع یہ تھا —

شہرہ ترے وحشی کا ھے گھر گھر کئی دن سے کوٹھوں پہ چنے جاتے ھیں پتھر کئی دن سے

آزاد مرحوم شعر اوائل عمری ھی سے کہتے تھے چنانچہ اسی زمانے میں اپنے ایک ھم سن دوست کی تلاش اور ان کے نہ ملنے کا حال اس شعر میں نظم کیا ھے :—

مکان حشر میں کوچہ میں اور طویلے میں　　کہاں کہاں ترا وحشی تجھے پکار ایا

مکان حشر سے مولوی رسول بخش حشر بدیوانی کا مکان کوچہ سے ایک محلہ کی مشہور گلی جو اسی نام سے مشہور ہے اور طویلے سے ایک مکان جو پہلے طویلہ تھا مراد ہے - آزاد مرحوم کا کلام باوجود اچھا کلام اور کافی ذخیرہ ہونے کے تلف ہوگیا - مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ ذیل کے اشعار بھی مجھے یاد ہیں —

خلعت برہنگی کا جو بخشا بہار نے　　دست جنوں لگے میرے کپڑے اتار نے

داغ کی ایکے سپرہاتھہ میں آہی نکلا　　آپ کے باغ کا لالہ بھی سپاہی نکلا

کاظم اوھار کے اشعار با وجود تلاش کے مجھے دستیاب نہ ہوسکے - اگر اس سلسلے میں اضافہ کرنا مقصود ہو تو بدایوں کے آن پڑہ شاعروں میں ایک گھر کے تین شاعروں کا کلام اور حالات حسب ذیل ہیں :—

''غالب'' - غالب علی نام تھا - ایک کامل فن مرغباز تھے - آخر میں کباب وغیرہ بیچکر بسر اوقات کرتے تھے لیکن جوتا ٹوپی بلکہ پگڑی تک سے درست رہتے تھے - شاعری کا شوق نہیں تھا البتہ چست فقرے اور برجستہ جملے روز مرہ میں داخل تھے اور اسی رو میں اپنی ضرورت کے مطابق وقتی شعر بھی کہہ اٹھتے تھے - پڑھے لکھے نہیں تھے مگر چونکہ قاضی ٹولہ کے رہنے والے تھے جو ذی علم شرفا کا مخصوص محلہ ہے اس لئے صحت لفظی اور تہذیب و سلیقہ سے محروم نہ تھے - اور کسی قدر حرف شناس بھی تھے - ایک صاحب جن پر کبابوں کے دام آتے تھے بہ سلسلہ تلاش ملازمت جھانسی جارہے تھے - غالب علی نے ان کی روانگی کے وقت اپنے داموں کا تقاضا کیا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ انہوں نے جھانسی پہونچکر ان کے دام بھیجنے کا وعدہ کرتے ہوئے مزید احتیاط کے خیال سے یاد دہانی کے لئے

اپنا پتہ لکھہ کر غالب علی کو دیدیا - غالب علی نے اس کو غور سے دیکھا تو لفظ جھانسی پر نظر پڑی فوراً ان کا ھاتھہ پکڑ کر بولے "آپ تو جہان سے جاتے" ھیں - میں یاد دھانی کہاں کرونگا - اسی طرح ایک صاحب اُن کے مقروض تھے جب اُن سے تقاضا کیا گیا تو انھوں نے یہ وعدہ کیا کہ علےالصباح میرے مکان پر آکر اپنے پیسے لیجانا - یہ حسب وعدہ مکان پر پہونچے تو وہ نہیں ملے - دوسرے وقت پھر تقاضا کیا تو مقروض صاحب نے کہا میں صبح کی اذان سنتے ھی ٹہلنے کو نکل جاتا ھوں تم ایسے وقت آؤ کہ اذان میرے دروازے پر سنو - غالب علی دوسرے دن صبح کی اذان سے آدہ گھنٹہ قبل ان کے دروازے پر پہونچے اور اذان کہنی شروع کر دی - اور چونکہ شیعہ مذھب رکھتے تھے اس لئے شیعوں کی اذان کہی - اس محلے میں شیعوں کی ایک ھی مسجد ھے اور وہ بھی اس موقع واردات سے دور - یہہ غیر معمولی اور قبل از وقت اذان سنکر پاس پڑوس کے لوگ اپنے گھروں میں سے نکل آئے - غالب علی کو سخت سست کہا تو یہ قصہ معلوم ھوا اور ایک بزرگ نے اپنے پاس سے وہ قرضہ ادا کرتے ھوئے آیندہ کے لئے مقروض مذکور کو قرض دینے کی سختی سے ممانعت کردی - جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ھوں اسی قسم کی ضرورتوں سے کبھی کبھی غالب علی شعر بھی کہتے تھے اور غالب تخلص کرتے تھے - ۶ - ۷ برس ھوئے ھونگے کہ ان کا انتقال ھوگیا ساٹھہ اور ستر کے درمیان عمر پائی دو شعر مجھے یاد ھیں —

نقد کوئی نہ لے تو کیا کیجے آج ' غالب ' اُدھار ھی بیچو

بادل گرج رھا ھے یہ طوفان آب ھے غالب ھمارے برف کی مٹی خراب ھے

بد قسمتی یا خوش قسمتی سے ان کے دونوں لڑکے بھی شاعر ھوئے

جو بقید حیات ہیں —

غالب علی کے بڑے لڑکے جن کی عمر پچاس سے دو ایک برس زائد ہے — واحد علی نام - باپ نے برسوں مکتبوں میں پڑھوایا مگر وہ تشریح الحروف سے آگے نہ بڑھے جب سن شعور کو پہونچے تو ایک آوارہ عورت پر عاشق ہو گئے - جوش عشق میں شاعری شروع کر دی اور داغ تخلص اختیار کیا بیشتر بے تکے اشعار کہتے تھے اور عجیب عجیب طرح سے ان کا مطلب بیان کرتے تھے - مثلاً - ایک شعر تصنیف کیا - " کیا چاند میں بیٹھی ہے نرالی مگر بڑھیا - اس سبزی سائل ساقیا رخسار کو دیکھو "- لوگوں نے مطلب پوچھا تو چاند میں چرخہ کاتنے والی بڑھیا کو اپنی محبوبہ کی مادر مرحوم اور چاند کی روشنی میں سبزی کی رمق کو سبزہ رخسار سے منسوب کرکے مطالب کا طومار باندھ دیا - کسی نے پوچھا کہ آپ کی محبوبہ کو سبزۂ رخسار سے کیا علاقہ تو فرمانے لگے اس سے نہ سہی ہم سے تو علاقہ ہے وہ ہمیں ساقیا رخسار سمجھوتی ہے یہ مصرعہ ہم نے اس کی طرف سے لکھدیا - غرض اس قسم کے اشعار تو ہزاروں تھے جو نہ کسی دوسرے کو یاد رہ سکتے تھے نہ اب انھیں یاد ہیں - البتہ اسی زمانہ کی شاعری کا ایک کارنامہ قابل ذکر ہے ایک موقع پر ایک اچھے خاصے شاعر سے سازش کرکے واحد علی صاحب کا مقابلہ کرا دیا گیا اور ایک طرح تجویز کرکے فی البدیہہ شعر لکھنے کی فرمائش کی گئی - طرح کا مصرعہ یا ردیف و قافیہ یہ تھا —

" توڑ تالے سبو تڑاق پڑاق " - اس مقابلے میں اپنے حریف کے شعر لکھنے سے بلکہ شعر لکھنے کے لئے سنبھلنے سے پہلے واحد علی صاحب نے ذیل کا شعر سنا دیا —

رات غصہ میں آکے ساقی نے توڑ تالے سبو تڑاق پڑاق

غالب علی کے دوسرے لڑکے

کا نام واجد علی ہے پہلے ' ناسخ ' اس کے بعد ' راسخ ' تخلص تھا اور اب واجد ہے یہ بھی پڑھے لکھے نہیں ہیں لیکن حرف شناس ہیں کچھ الٹا سیدھا لکھ بھی لیتے ہیں اور صاف لکھا ہوا ہو تو پڑھ بھی سکتے ہیں ان کی طبیعت شاعری کے لئے زیادہ موزوں ہے - اکثر مشاعروں میں بھی شریک ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی وقت گزاری کے لئے مشاعرہ شروع ہونے سے قبل یا مشاعرہ شروع کرنے کے لئے ان کی غزلیں سننے کی نوبت آ جاتی ہے - گرمیوں میں برف خانوں میں چاء بیچکر بسر اوقات کرتے ہیں - برسات کے موسم یا خالی وقت میں ضرورتوں سے مجبور ہو کر زنانہ سواریوں کا دستی ٹھیلہ بھی چلاتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنا ٹھیلہ لے کر بریلی بھی چلے جاتے ہیں اور وہاں رہ کر بھی ٹھیلہ چلاتے ہیں - آج کل ان کا ٹھیلہ بریلی میں کرایہ پر چلتا ہے تقریباً تیس سال کی عمر ہے بریلی کالج کے ایک مشاعرے میں شریک ہو کر غزل بھی پڑھ چکے ہیں - کبھی کبھی فلاس سے بھی دل بہلا لیتے ہیں - طبیعت تیز اور ذہن رسا پایا ہے - اس لحاظ سے خلف الرشید ہیں مگر باپ کی طرح پوشش کا لحاظ دونوں میں سے ایک کو بھی نہیں ہے - ہو تا نہ ہو تو پروا نہیں - توبہ نہ ہو تو نہ ہو - ان قیدوں سے آزاد ہیں ان کے اشعار میں ان کے پیشے اور ان کے شوق کا بھی ذکر آ جاتا ہے —

کلام

ایک مشاعرے کی مختصر صحبت میں انہیں چاء کا ٹھیکہ دیدیا گیا تھا اس کا حساب ہوا تو فی البدیہہ یہ شعر پڑھا —

پیالے تیس پئیں بیس ہم کو پیسے دیں ہماری جان الٰہی بڑے عذاب میں ہے

ایک مصرعہ طرح کی شکایت میں سر مشاعرہ یہ شعر پڑھا —

دی ہے مہمل یہہ طرح سوچکے جس نے " واجد "
اس میں لکھینگے غزل بھی وہی حضرت نہ کہ میں

اپنا فصلی پیشہ تبدیل کرنے کے متعلق فرماتے ہیں —

جب تلک سردی رہی تو چاء میں ڈوبا رہا
گرمیاں آئی ہیں " واجد " برف کا سامان کر

فلاس کھیلتے وقت جب شاعری زور پکڑتی ہے تو اس قسم کے شعر بھی تصنیف کرتے اور پڑھتے رہتے ہیں —

چال اک آنے کی ہے تو کررہا ہے کیا غضب
تگیوں کا جوڑ بورا (*) پھینک ہارا جانکر
ہاتھہ دھپل (+) پر مرا اٹھوا دیا بیرحم نے
آئے گھاٹے میں ہم شیخا (‡) کا کہنا مانکر

ان کا کلام کافی تعداد میں ہے مگر سب حفظ ہے مشاعرے کی غزل کسی سے نقل کروا لیتے ہیں اور مشاعرے کے بعد کسی قدردان کو بخش دیتے ہیں - اکثر بیوقوف شعرا نے اصلاح لینے پر توجہ دلائی مگر کسی کی درخواست کو شرف قبولیت نصیب نہ ہوا - بریلی کالج کے مشاعرے کی غزل پر نمونہ کلام کا خاتمہ ہے —

غالباً سنہ ۱۹۲۸ کے مشاعرے میں یہہ غزل میری موجودگی میں پڑھی تھی جب کہ ان کا قیام بریلی ہی میں تھا —

---

(*) " بورا " - ایک شریک تفریح کا نام (+) " دھپل " فلاس کی یا اس قبیل کی ایک اصطلاح جس سے دھوکا مراد ہے (‡) شیخا - ایک ہم مشرب جلیس کا نام —

## غزل

یاد اللہ کی ہم شام و سحر رکھتے ہیں — مہر کی ہم پہ ہمیشہ وہ نظر رکھتے ہیں

ان پہ ہم اپنی محبت کا اثر رکھتے ہیں — ہم پہ وہ لطف و عنایت کی نظر رکھتے ہیں

کس قدر ہے میرے ارمان و تمنا کا ہجوم — دیکھنا ہے وہ جنازے کو کدھر رکھتے ہیں

درد اُٹھانے کے لئے ضعف بٹھانے کے لئے — تیرے بیمار کی یہہ دو ہی خبر رکھتے ہیں

چھوٹکر قید قفس سے میں اُڑوں کیسے اُڑوں — پہلے ہی سے وہ پر و بال کتر رکھتے ہیں

میرے قاسم نے عطا کی مجھے خارج قسمت — میرے مقسوم میں واجد وہ کسر رکھتے ہیں

میں نے یہہ غزل حاصل کرنے کے لئے آج بلایا تو یہہ شعر لکھا دئے اور فرمایا اس کے اور شعر ہوی ہیں جو اس وقت یاد نہیں آتے اس سلسلے میں ایک ان پڑھ شاعر کا ایک زربان کار نامہ مجھے یاد ہے اگر ان کے حالات شائع ہوئے ہوں لیکن یہہ کار نامہ شامل حالات ہونے سے رہجائے تو نا قابل تلافی فر و گزاشت ہوگی - وھوھذا —

ایک دھای کے شاھزادے جو بفضلہ بقیہ حیات ہیں مرزا چپاتی کے نام سے مشہور ہیں ( ان کا نام نامی میں بھول گیا ) مگر میں نے ان کو دیکھا ہے - پچاس ساٹھہ کے درمیان عمر ہوگی - زبان میں الکنت ہے پڑھے لکھے بالکل نہیں ہیں ( یا شاید حرف شناس ہوں ) پتنگ اور تکل بنانے میں کمال رکھتے ہیں کبوتر پالنے اور ان کا رنگ بدلنے یا اُنھیں حسب مراد رنگین بنانے میں استاد ہیں - گردش زمانہ سے یہی کمالات ان کا ذریعہ معاش ہیں - زیادہ کہنے سننے سے مقامی مشاعروں میں بھی شریک ہوجاتے ہیں - دھلی کے شاھی دربار تاج پوشی منعقدہ سنہ ۱۹۰۳ م میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی طرح یہہ تھی —

سر عدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

اس مشاعرے میں مرزا " داغ " میر مہدی " مجروح " جناب " ظہیر " و مولانا " راسخ " وغیرہ ہم اساتذہ شریک تھے اور مصرعہ طرح کی گرہ لازمی قرار دی گئی تھی چنانچہ ہر شریک مشاعرہ شاعر نے اس شرط کی پابندی کی لیکن مرزا چپاتی کی گرہ سب سے بہتر تھی اور اس کا اعترات اساتذہ نے سر مشاعرہ کیا تھا - مرزا چپاتی کا وہ شعر ملاحظہ ہو —

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لیذا شمر سے سر عدو کا ہو نہیں سکتا مرے سر کا جواب

کسی نے سچ کہا ہے —

تو دینے پہ آئے تو اے رب کریم جو چاہے جسے پھاڑ کے چھپر دیدے

ابن عبد الله بن عبد الله بن عبد الله ب

# تبصرے


| | صفحہ |
|---|---|
| **ادب** | |
| بہار گلشن کشمیر جلد اول | ۳۲۹ |
| غالب اور مومن | ۳۳۱ |
| انار کلی | ۳۳۲ |
| نغمۂ روح | ۳۳۴ |
| ہندی اردو مالا | ۳۳۵ |
| شیطان سبھا | ۳۳۵ |
| یادگار شیون | ۳۳۶ |
| میکدہ | ۳۳۶ |
| فروغ بیان | ۳۳۷ |
| پریم گیتا | ۳۳۸ |
| **تعلیم** | |
| نو پیشہ مدرس | ۳۳۸ |
| محنت | ۳۳۹ |
| **مذہب** | |
| یاد اسلام | ۳۴۱ |
| نیچریت | ۳۴۱ |
| یازدہ سورہ شریف | ۳۴۱ |
| **تاریخ** | |
| تاریخ الامت حصہ ہفتم | ۳۴۲ |
| اسلامی خلافت کا کارنامہ دوسرا حصہ، دوسری جلد مصطفائی کمال | ۳۴۲ |

| | صفحہ |
|---|---|
| حیات احمد بن حنبل | ۳۴۳ |
| اسلامی نظام تعلیم | ۳۴۳ |
| دنیا کے بسنے والے | ۳۴۴ |
| **منطق و فلسفہ** | |
| مبادی فلسفہ حصہ اول | ۳۴۵ |
| اساس منطق | ۳۴۶ |
| آزادی | ۳۴۶ |
| **متفرقات** | |
| اسلام کا احسان یورپ پر | ۳۴۷ |
| گلگشت دکن | ۳۴۸ |
| **اردو کے جدید رسالے** | |
| المائدہ | ۳۴۸ |
| طبیب | ۳۴۹ |
| ضیائے شمس | ۳۵۰ |
| ستارہ | ۳۵۰ |
| **رسالوں کے خاص نمبر** | |
| حریم | ۳۵۰ |
| ہمایوں | ۳۵۱ |
| الہام عید نمبر | ۳۵۱ |
| مشیر بافغانی | ۳۵۲ |
| میخانہ عید نمبر | ۳۵۲ |

# تبصرے

## ادب

### بہار گلشن کشمیر جلد اول

( مرتبہ و مولفۂ پنڈت بر جکشن کول صاحب بے خبر و پنڈت جگموہن ناتھہ رینہ صاحب شوق- مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد - صفحات ۷۶۰ )

---

کشمیری پنڈت اپنی حسن صورت و سیرت اور ذہانت و فطانت کی وجہ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں اور خصوصاً ہندوستان میں آکر ان کے جوہر خوب کھلے ہیں - انھوں نے ملک کی تہذیب و شایستگی اور ادب کی ترقی میں قابل تعریف کام کیا ہے - گو ان کی تعداد کم ہے - لیکن حسن قابلیت اور کمال کی وجہ سے وہ جہاں کہیں بھی ہیں صف اول میں نظر آتے ہیں —

بہار گلشن کشمیر جس کا دوسرا نام تذکرہ شعرائے کشمیری پنڈتاں ہے ان کے ادبی کمال کے ثبوت میں کافی شہادت ہے - پنڈت جگموہن ناتھہ رینہ صاحب شوق نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان شعرا کا کلام اور حالات جمع کئے ہیں- اس کا اندازہ کتاب کے پڑھنے کے بعد ہوسکتا ہے - اس میں فارسی اردو دونوں زبانوں کے شاعر ہیں اور قدیم سے لیکر زمانۂ حال تک تمام شاعر آ گئے ہیں اس ممتاز فرقے کا شاید ہی کوئی شاعر شوق صاحب کی نظر سے بچا ہوگا - شوق صاحب نے اس معاملے میں بڑی دیانت سے کام لیا ہے - بعض ایسے شاعر تھے کہ ان کا

کلام کسی بیاض وغیرہ میں ملا مگر ان کا حال دستاب نہیں ہوا تو انہوں نے اسے آئندہ تحقیق کے لئے اٹھا رکھا اور اس کتاب میں درج نہیں کیا -

قابل مولف نے جہاں تک ان کی دسترس تھی شعرا کے حالات دریافت کرنے اور کلام تلاش کرنے کی کوشش کی ہے - ترتیب حروف ابجد کے لحاظ سے رکھی ہے - اس پہلی جلد میں حرف ' ظ ' تک پہنچے ہیں - باقی دوسری جلد کے لئے ہیں -

مولف نے صرف حالات اور کلام کے جمع کرنے پر اکتفا کیا ہے - کلام کے حسن و قبح سے بحث نہیں کی اور تنقید کی الجھن میں نہیں پڑے یہ انہوں نے ناظرین کے ذوق پر چھوڑ دیا ہے -

کتاب ختم ہو جانے کے بعد جن شعرا کے مزید حالات وغیرہ دستیاب ہوے یا نئے شعرا کا پتہ لگا تو وہ بطور ضمیمہ کے اضافہ کردئے گئے ہیں - چندر بھان برہمن کے حالات اصل کتاب نیز ضمیمے میں درج ہیں - برہمن کی کئی تصانیف کا ذکر تو کیا ہے اور ایک کتاب " انشاء چہار چمنی " کا ذکر مرزا سلطان احمد صاحب کے حوالہ سے کیا ہے - یہ چہار چمنی نہیں بلکہ چہار چمن ہے - ضمیمے میں ان کے دیوان اور مثنوی کا ذکر ہے لیکن ان کے علاوہ برہمن کی ایک نہایت عمدہ انشا " منشات برہمن " کے نام سے ہے - نیز تحفہ انوارے ' کار نامہ و تحفۃالنور اور جمع الفقرا بھی اس کی تالیفات سے ہیں - " منشات برہمن " میں بادشاہ کے نام کے عرائض اور وہ خطوط جو امرا اور بزرگوں اور عزیزوں کے نام لکھے تھے درج ہیں - ان کی عبارت بہت پاکیزہ اور رنگین ہے اور جگہ جگہ غزلیں اور حکیمانہ نکات بھی درج ہیں -

کتاب ایسی نفیس صاف ستھری اور اعلیٰ درجے کی چھپی ہے کہ دیکھے سے جی خوش ہوتا ہے اور کاغذ اور جلد بھی نہایت عمدہ ہے - جن شعرا کے فوٹو مل گئے ہیں ان کی تصویریں بھی بہت خوبی سے چھاپی گئی ہیں -

غرض یہ کتاب ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے اور قابل مولف کی محنت اور ذوق لائق داد ہے -

کتاب ڈاکٹر سر سپرو کے نام معنون کی گئی جو اپنی ادیبانہ قابلیت کی وجہ سے اس کے مستحق تھے —

# غالب اور مومن

( از مولانا حکیم سید اعجاز احمد صاحب حجم ۶۴ صفحے
قیمت آٹھ آنے - دائرہ علمیہ فیض آباد )

---

یہ رسالہ " مولانا حکیم سید اعجاز احمد صاحب معجز سہوانی - منشی فاضل و مولوی فاضل پنجاب" کے زور قلم کا نتیجہ ہے - آپ کے ہم وطن' حضرت 'نکہت' ( سہوانی ) نے جن کے القاب مصنف سے بھی بڑھ چڑھ کر تحریر کئے گئے ہیں' ایک " محققانہ " تبصرہ لکھکر اس 'محققانہ " موازنے کا وزن بڑھایا ہے - اصل مقصد غالباً " مومن " خاں مرحوم کے محاسن کلام کو بیان کرنا تھا - " غالب " کی تنقید و تنقیص محض تصویر کا رنگ چمکانے کے لئے ضروری سمجھی گئی - لیکن موازنے کی غرض سے " غالب " کے جو اشعار چنے گئے ہیں ' ان میں ایسی نا انصافی یا نا واقفیت سے کام لیا ہے کہ کتاب کی وقعت نظر سے گر جاتی ہے - تبصرہ نگار صاحب تو یہاں تک جوش میں آئے کہ "غالب" کو "ذوق" و "مومن" جیسے استادوں کے مقابلے میں لانے کے قابل ہی نہیں سمجھتے بلکہ اردو شاعر تسلیم کرنے میں بھی متامل ہیں - قریب قریب وہی سب اعتراضات رسالے میں دھرائے گئے ہیں جو پچاس برس پہلے دہلی سے بازاری مرزا صاحب کے کلام پر کیا کرتے تھے - سب سے زیادہ ناراضی اس کے مُغلق و عسیرالفہم ہونے پر ظاہر کی ہے لیکن اس نکتہ چینی کے تو لائق مصنف کے ممدوح کا کلام بھی پاک و بری نہیں بلکہ بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کے معمے حل کرنے کے بعد بھی " حاصل " کی صرف حسرت باقی رہ جاتی ہے - بے شبہ ان کے چیدہ اور صاف اشعار اپنے رنگ میں لاجواب ہیں - ان کی نازک خیالی اور رنگین بیانی میں کسی سخن شناس کو کلام نہیں ہوسکتا مگر اپنی ذہانت و جدت پسندی کے با وجود " مومن " اسی رسمی تغزل کی زنجیروں میں قید ہیں ' جس نے دو صدی تک ہماری شاعری کو محض ایرانی غزل نویسوں کی نقّالی بنائے رکھا - اور حضرت " معجز " یا ان کے دوسرے ہم خیال کتنی ہی سینہ کوبی کریں ' عہد جدید کے تعلیم یافتہ

اهل ذوق ' شعر کے فن لطیف کو کبھی اس جھوٹی عاشقی اور شرمناک اسرد پرستی کے مضامین تک محدود سمجھنے پر آمادہ نہ ہونگے جو ایک مدت سے ہمارے شعرا کا سرمایۂ فخر و مباہات رہا اور اب ہماری ساری تہذیب و اخلاق کے چہرے پر سیاہ داغ نظر آتا ہے - قادرالکلام اردو شعرا میں مرزا " غالب " پہلے شخص ہیں جن کی نگاہ بارہا امارد اور شاهدان بازاری کے کوٹھوں سے ہٹ کر انسانی زندگی کے دوسرے نازک و پیچیدہ تر مسائل تک پہنچتی ہے اور وہ نہایت لطیف اور فلسفیانہ انداز میں ان پر رائے زنی کر جاتے ہیں - یہی وہ خصوصیت ہے جس کے باعث زمانۂ حاضرہ کے اهل نظر ان کے اس درجہ گرویدہ و معتقد پائے جاتے ہیں - لائق مصنف رسالہ اور ان کے دوست نکہت صاحب اس خیال کو پیش نظر رکھکر غور فرمائیں گے تو عجب نہیں کہ انہیں بھی غالب اور اپنے دوسرے ممدوحوں کے کلام میں اس فرق عظیم کا مشاهدہ ہوجائے جسے دیکھنے سے وہ اب تک معذور و محروم رہے —

لائق مصنف مرزا غالب کی زبان دانی اور دهلوی نہ ہونے پر بھی مُنہ آے ہیں اور شہادت میں " طبا طبائی " صاحب کا قول پیش کیا ہے - لیکن زبان دانی کے اگر ان پرانے اور بھولے ہوئے معیاروں سے کام لیا گیا تو ہمیں خوف ہے کہ سہوانی نقادوں کو اردو زبان کی شاعری کے متعلق کسی طرح لب کشائی کا حق نہیں باقی رہے گا - فتدبر —

( ش )

---

# انار کلی

( از سید امتیاز علی صاحب " تاج " - دارالاشاعت - لاہور )

---

اس المیہ میں شہزادہ " سلیم " اور " انار کلی " کی باهمی محبت اور اس کے تلخ انجام کو بیان کیا گیا ہے - " انار کلی " کے افسانے کی

تاریخی صداقت اب تک ثابت نہیں ہوئی لیکن روایتاً یہ قصہ اس قدر عام رہا ہے کہ اس کی تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی حقیقت ہوگی قصہ یہ ہے کہ 'اکبر' کے حرم میں نادرہ بیگم یا شرف النسا بیگم ایک کنیز تھی جسے شہنشاہ نے " انار کلی " کے خطاب سے سرفراز کیا تھا - " شہزادۂ " سلیم " کا عنفوان شباب تھا - " انار کلی " کے حسن و رعنائی نے اسے اپنی طرف مائل کیا - عشق رسمی فرق مراتب سے بے نیاز ہوتا ہے - " انار کلی " ویسے تھی تو ادنیٰ کنیز لیکن " سلیم " کی نظر میں اس کا رتبہ کچھ اور ہی ہوگیا تھا - ایک دن ہونے والی بات اکبر نے شہنشاہ محل میں ان دونوں کو اشارۂ و تبسم کرتے دیکھ لیا - دیکھنا تھا کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی - " سلیم " کے اخلاق اور 'انار کلی کی جرات سے اسے یہ توقع نہ تھی - بوکھلاہٹ کے عالم میں حکم دیا کہ 'انار کلی' کو زندہ دیوار میں چن دیا جائے —

یہاں تک تو یہ افسانہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ 'سلیم' نے 'انار کلی' کا مقبرہ اپنے زمانۂ حکومت میں بنوایا - اس کا تعویذ سنگ مرمر کی بڑی سل سے بنا ہوا ہے اور اس عہد کی سنگ تراشی کے عمدہ نمونوں میں اس کا شمار ہوتا ہے —

مصنف نے اس المیہ کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے پہلے باب میں 'سلیم' اور 'انار کلی' کی ابتدائی محبت کا حال ہے - اس باب میں چار منظر ہیں - دوسرے باب میں قلعہ 'لاہور' کی ایک بزم رقص کا ذکر ہے جس میں 'انار کلی' کے کمال کا حرم کی دوسری سب کنیزوں پر سکہ بیٹھ گیا اس باب میں بھی چار منظر ہیں —

تیسرے باب میں 'سلیم' اور 'انار کلی' کے راز محبت کے طشت از بام ہونے کا حال ہے - اس باب میں پانچ منظر ہیں —

اس ڈرامے کی زبان میں مواقع کا پورے طور پر لحاظ رکھا گیا ہے - روز مرہ کی جگہ روز مرہ اور جہاں زور بیان کی ضرورت ہے وہاں اسے برتا گیا ہے ہمارے خیال میں اس ڈرامے کو ایکٹ کرنے میں کوئی بات مانع نہیں —

لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے - عبدالرحمن صاحب چغتائی کی پانچ تصاویر بھی ہیں جو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بنائی ہیں —

(ی)

# نغمۂ روح

( از اختر انصاری صاحب دھلوی - مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس - دھلی قیمت ۱۲ آنے ) ۔

یہ مجموعہ اختر انصاری صاحب دھلوی کے قطعات ' غزلیات اور نظموں پر مشتمل ہے - موصوف کا کلام اسی رنگ میں ہے جو آج کل اقبال کے اثر سے ہماری زبان کے بیشتر نوجوان شاعروں نے اختیار کر لیا ہے - یہ واقعہ ہے کہ ہماری زبان کی تاریخ میں کسی اور شاعر نے اپنی زندگی میں اپنے رنگ اور اپنے طرز کو اتنا کامیاب نہیں دیکھا ' جتنا کہ اقبال نے - بڑے شاعر کی شخصیت زبان کو جہاں بہت سے فائدے پہنچاتی ہے وہاں نقصان بھی پہنچاتی ہے - اس کے ہم عصر اس سے ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اسی کی زبان سے - اس مجموعے میں اقبال کے رنگ کی جھلک ہر صفحہ پر نظر آتی ہے - لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اختر انصاری صاحب اپنی ذاتی اپج کو استعمال نہیں کرتے - دراصل جہاں کہیں وہ اقبالی طرز سے ہٹتے ہیں وہیں ان کے پیرایۂ بیان میں لطف آگیا ہے - بعض قطعے اس مجموعے میں خوب ہیں —

" محبت " پر ایک قطعہ ہے : محبت ہے اک خوش نما شوخ کانٹا
جو چبھتا ہے انکھوں کے پردوں میں پہلے
اتر جاتا ہے پھر وہ دل کی رگوں میں
خلش اول اور بعد میں درد بن کے

" آنسو " پر دوسرا قطعہ ہے : ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے
کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی
پھپھولے دل کے تلاب میں بن جائینگے یہ انگارے

( )

# ہندی اردو مالا

( مولفہ پنڈت ہری ہر شاستری پروفیسر انچارج ہندی سنسکرت
جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن - صفحات ۵۵ قیمت دو آنے )

---

یہ ہندی اردو کی دوسری کتاب پنڈت ہری ہر شاستری صاحب نے ان اردو داں طالب علموں کے لئے لکھی ہے جو ہندی سیکھنا چاہتے ہیں - شروع میں حروف کے باہمی جوڑ کا طریقہ بتایا ہے - اس کے بعد ہندی میں آسان سبق مختلف مضامین پر لکھے ہیں - اور اس کے مقابل صفحے پر اول مشکل الفاظ اور ان کے معنے اردو میں دیئے ہیں اور پھر تمام سبق اردو حروف میں لکھہ دیا ہے - اس طریقے سے طالب علم بہت آسانی سے بغیر اُستاد کی مدد کے ہندی پڑہ سکتا اور اس میں مہارت حاصل کر سکتا ہے - اس کے بعد چند سبق صرف ہندی میں لکھے ہیں اور شروع میں اُن کے معنے بھی ہندی ہی میں دیے ہیں آخر میں ایک سبق ہندی محاورات کا ہے جن کے مقابل میں اردو ترجمہ بھی لکھہ دیا ہے - سب سے آخر میں ہندی اعداد اور رقمیں درج ہیں اردو دانوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے —

---

# شیطان سبھا

( مصنفۂ سید آل حسن صاحب بی - اے ' ایل ایل - بی ' وکیل
مرادآباد عالم بک ایجنسی مراد آباد - صفحات ۳۸ قیمت چار آنے )

---

یہ مثنوی ملٹن کی مشہور نظم پیراڈائس لوسٹ سے اخذ کی گئی ہے اس میں صرف شیطان اور اس کے ساتھیوں کی تقریریں نظم کی گئی ہیں - ملٹن

کی نظم کی قوت اور شکوہ تو اس میں نہیں ہے تاہم اس مضمون کو سادہ طور سے نظم کر دیا ہے —

---

## یادگار شیون

( مرتبہ بیضا خان صاحب ، اوسط درجے کی تقطیع ، صفحات ۶۰ ، لکھائی چھپائی اچھی ، ٹھائی برقی پریس اسلامیہ اسکول امرت سر )

---

یہ مختصر کتاب مرزا شجاع خاں شیون مرحوم کے اُردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے ، شیون مرحوم نوجوان شاعر تھے - ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو ضرور ترقی کرتے اور مشہور شعرا کی صف میں جگہ پاتے موجودہ مجموعہ میں اکثر اشعار اچھے ہیں ان میں جدت اور مضمون آفرینی کے آثار پائے جاتے ہیں - زبان بھی صاف پاک ہے —

( چ )

---

## میکدہ

( مجموعہ کلام حضرت منیر واسطی - قیمت مجلد ۱۲ آنے ، غیر مجلد ۸ آنے - منیجر دیسی دواخانہ - چوک چونے منڈی لاہور )

---

حضرت منیر واسطی کی اُن نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں - اس میں مختلف ۲۵ نظمیں ، ۶ غزلیں اور چند متفرق اشعار ہیں - جناب منیر کے کلام میں پختگی ہے ، زبان صاف ، شستہ اور بیان رواں ہے مضامین میں تنوع ہے - کتاب اچھی چھپی ہے کاغذ بھی عمدہ ہے ، جلد خوش نما ہے — ( چ )

---

# فروغ بیان

( مصنفہ جناب شاد صابری صاحب ' سوا سو صفحے ' چھوٹی تقطیع ' قیمت ایک روپیہ ' ملنے کا پتہ :- شاد صابری اور سید ' میونسپلٹی ' کراچی )

---

یہ جناب شاد صابری کے کلام کا مجموعہ ہے - اس میں ۱۰۴ صفحوں پر غزلیں ہیں اور بقیہ ۲۰ صفحوں پر نظمیں - اس مجموعہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاد پر جدید انقلاب شاعری کا کم اثر ہوا ہے - وہ برابر پرانے طرز میں غزل گوئی کر رہے ہیں - اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں جو نام و صورت کے لحاظ سے تو جدید معلوم ہوتی ہیں لیکن مضامین کے اعتبار سے ان میں قدیم رنگ کی جھلک نمایاں ہے - غزلیں زبان و بیان کے اعتبار سے اچھی ہیں مضامین میں بھی ایک حد تک تنوع ہے شروع میں حضرت شاد نے خود اپنے حالات اس خیال سے لکھ دئے ہیں کہ آئندہ ان کے متعلق غلط فہمی نہ ہو اور آئندہ قیاس کی بناء پر لوگ ان کی تصویر کو مسخ نہ کر دیں - اس کے بعد جناب قمر بدایونی کا مقدمہ ہے - مقدمہ کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسو برس قبل کی کسی کتاب سے ترجمہ کی گئی ہے - اس میں اصناف و ارکان سخن کو ارکان دین و ایمان سے تشبیہ دی ہے مثلاً رباعی کو چار مصلوں یا رسول اکرم کے ہر چہار یاران با صفا سے ' مخمس کو پنجتن پاک یا اوقات نماز پنج گانہ سے - غرض شعر و سخن کی عظمت اس تشابہ سے ثابت کی گئی ہے —

شروع میں مصنف نے اپنی تصویر سے کتاب کو زینت دی ہے —

( چ )

---

## پریم گیتا

( مرتبہ ملک فضل حسین صاحب ' جیبی تقطیع ۳۲ صفحے
ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اسلام سکندر آباد دکن )

---

یہ ان نعتیہ نظموں کا مختصر مجموعہ ہے جو ہندو شعرا نے کہی ہیں۔ اس میں ۱۹ شاعروں کی نظمیں ہیں - شعراء تقریباً سب حال کے ہیں ' یہ اس عام اتحاد اور یگانگت کے آثار ہیں جو قدیم زمانے میں ہندو مسلمانوں میں پائے جاتے تھے اور دونوں قوموں ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر تھیں اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو شاعروں نے اولیا اور انبیا کی ثنا و صفت میں بڑے خلوص سے نظمیں لکھی ہیں اس مسموم اور مکدر فضا میں بھی ایسے پاک نفس لوگ موجود ہیں جن کے آئینہ دل پر کدورت نہیں آنے پائی اور وہ برابر پرانی روایتوں کو برقرار رکھتے چلے آرہے ہیں - ایسے ہی نیک دل ہندو شاعروں کی نعتیہ نظمیں اس مجموعے میں ہیں —

( چ )

---

# تعلیم

## نوپیشہ مدرس

( مترجمہ عبدالغفور صدیقی و عبدالشکور صاحبان ' صفحات ۸۶ '
چھوٹی تقطیع ' لکھائی چھپائی اچھی ' قیمت سوا روپیہ ملنے کا
پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن )

---

فن تعلیم پر اردو زبان میں بہت کم ذخیرہ ہے خوشی کی بات ہے کہ

اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے - نو پیشہ مدرس امریکہ کے ایک ماہر تعلیم جے ' ایس ' ڈیوس کی کتاب " دی ینگ ٹیچرس پرائمر " کا ترجمہ ہے - اس میں ان تمام ضروری چیزوں کا ذکر ہے جن سے ایک نو پیشہ مدرس کو واقف ہونا لازم ہے - اس میں حسب ذیل نو باب ہیں ' ضبط جماعت ' داب نظر ' مدرس کی آواز ' ترتیب سوال ' سر انجام جواب ' تختہ سیاہ' درس کی تیاری ' سبق کی توضیح ' متعلق اطفال - ان نو ابواب میں وہ تمام ضروری ہدایات ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو ایک نیا مدرس اپنے پیشے میں کامیاب ہو سکتا ہے - مصنف نے بار بار حکم اور نصیحت کرنے کو منع کیا ہے - بے شبہہ لایق مصنف کا یہ خیال صحیح ہے کہ کم عمروں اور نو جوانوں کے لئے نصیحت اکثر الٹا اثر رکھتی ہے ' لیکن خود فاضل مصنف نے یہ کتاب جو نوجوان مدرسوں کے لئے لکھی گئی ہے تحکمانہ لب و لہجہ اور واعظانہ انداز میں لکھی ہے تاہم اس میں نصیحت کی تلخی نہیں - امید ہے کہ یہ کتاب نوجوان تعلیم پیشہ اصحاب کے لئے مفید ثابت ہوگی - ترجمہ صاف سادہ اور عام فہم ہے - ایک آدہ باب میں فنی اصطلاحات آئی ہیں - اگر ان کی ضروری تشریح ایک مختصر ضمیمہ کی شکل میں کردی جاتی تو اچھا تھا —

( چ )

---

## مختصر

( مصنفہ عبدالغفار صاحب ' صفحات ۴۸ ' چھوٹی تقطیع لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ - قیمت ۴ آنے - ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی )

---

یہ مختصر ڈراما بچوں کے لئے لکھا گیا ہے - اس میں یہ بات ثابت کی ہے کہ محنت سے انسان زندگی میں کامیاب و بامراد ہوتا ہے ' محض روپیہ

پیسہ اور دوسرا کوئی ذریعہ انسان کو محنت کے مقابلے میں کامران نہیں کرسکتا ڈرامے کی روداد اچھی ہے - بچوں کے لئے سبق آموز ہے —

( چ )

---

## مذہب

### یاد اسلام

( مصنفہ جناب منشی شاہ محمد ممتاز علی صاحب 'آہ' امیٹھوی صفحات ۷۶ - چھوٹی تقطیع لکھائی چھپائی اچھی قیمت دس آنے - ملنے کا پتہ :- مولوی محمد ساجد - محلہ مغل پورہ فیض آباد )

---

اس مثنوی میں مصنف نے اسلام کی عظمت و شان ظاہر کی ہے ' آنحضرت صلعم کی سیرت پاک کو بیان کیا ہے - اسلام کو ایک فطری مذہب ثابت کرنے اور ان شبہات کو عقلی دلائل سے دور کرنے کی کوشش کی ہے جو جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے دل میں اسلام کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں - اس مثنوی کے بعض مضامین مولانا حالی کے انقلاب انگیز مسدس کے مضامین سے ملتے ہیں لیکن جو جوش اور فصاحت اس میں ہے اس میں مفقود ہے - تاہم یہ مثنوی اپنے موضوع ' زبان اور بیان کے لحاظ سے قابل قدر ہے —

( چ )

## نیچریت

( مترجمہ جناب عبدالمنان صاحب ' ۶۴ صفحات ' چھوٹی تقطیع ' اکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی - قیمت ۶ آنے ملنے کا پتہ :- کتب خانہ آصفیہ کشمیری بازار لاہور )

---

علامہ سید جمال الدین افغانی ( رح ) ' کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ان کا شمار ان نامور بزرگوں میں ہے جنھوں نے مسلمانوں کو ابھارنے اور ان کی قومیت کو زندہ کرنے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے ہیں - یہ مختصر رسالہ علامہ موصوف نے بزبان فارسی اس زمانے میں لکھا تھا جب کہ مادہ پرستی اور دہریت کے غلبے سے اکثر مسلمان اندیشہ مند تھے - اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو مذہب کی طرف توجہ دلائی جاے اور نیچریت کا راز فاش کیا جاے - ہمارے کان اس قسم کے الفاظ سے آشنا ہوگئے ہیں اس لئے ہمیں اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں معلوم ہوتی - تقریباً نصف صدی قبل یہ خاص مسئلہ ہو گیا تھا - اس باب میں بے شمار مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں - مترجم عبدالمنان صاحب نے صاف ترجمہ کیا ہے - شروع میں علامہ موصوف کے سوانح حیات بھی ہیں —

( چ )

---

## یازدہ سورہ شریف

یہ کتاب پیکوارٹ پریس لاہور نے بڑے اہتمام سے بہت خوش خط اور پاکیزہ کاغذ پر طبع کی ہے - چھپائی بھی اعلیٰ درجے کی ہے - ایسی نفیس طباعت دیکھنے میں نہیں آئی )

---

اس مطبع نے پارے الٓمٓ بھی عکسی رنگین چھاپا بہت صاف ستھرا اور عمدہ چھپا ہے - طرز تحریر اس قسم کا ہے کہ بچے اور کم سواد شخص بھی آسانی سے پڑھ سکتے ہیں —

---

# تاریخ

## تاریخ الامت حصہ ہفتم

( مصنفہ مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری - جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی - قیمت ایک روپیہ )

---

تاریخ الامت کے اس حصے میں سلاطین و خلفائے عثمانیہ کی سیاسی تاریخ کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے - یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اردو میں آج تک دولت عثمانیہ کی تاریخ نہیں لکھی گئی - تاریخ الامت کے اس حصہ سے یہ کمی پوری ہوجائیگی - اس کتاب کے اور دوسرے حصوں کی طرح اس حصے کی زبان بھی نہایت سادہ اور عام فہم ہے - مولانا نے یہ سلسلہ در اصل تعلیمی غرض کے لئے تصنیف کیا ہے - علمی تحقیق کی بجائے مسلسلہ تاریخی وقعات کو سلیس اور عام فہم انداز میں طلبہ کے لئے پیش کیا گیا ہے - چنانچہ طلبہ میں یہ پورا سلسلہ بہت مقبول ہوا اور ہر کالج میں اس سے استفادہ کیا جا رہا ہے —

تاریخ الامت کے ساتویں حصے میں دولت عثمانیہ کی بنیاد سے لیکر غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے برسر اقتدار ہونے تک کے سارے اہم سیاسی واقعات موجود ہیں - ہماری رائے میں اگر مولانا آئندہ ایڈیشن میں سن ہجری کے ساتھ ساتھ سن عیسوی بھی درج کردیں تو طلبہ کے لئے اس میں اور بھی زیادہ سہولت ہوگی —

( ی )

---

## اسلامی خلافت کا کارنامہ دوسرا حصہ

## دوسری جلد - مصطفای کمال

( مولفہ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس - صفحات ۳۵۱ ' قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ سے مل سکتی ہے )

---

اس کتاب کے پہلے حصے پر گزشتہ کسی پرچے میں تبصرہ ہو چکا ہے '

اس حصے میں حضرت محمد صلعم کے حالات ھجرت مکہ سے سنہ ۵ ھجری تک بیان کئے گئے ھیں - ان حالات کے ضمن میں بہت سے اخلاقی مسائل اور دوسرے ضروری امور اور معاملات پر بھی بحث کی گئی ھے - کتاب کا طرز بیان سادہ ھے اور ھر مضمون کو اس طرح بیان کیا ھے کہ اس کے متعلق کافی معلومات ھوجاتی ھے اور غیر ضروری طول سے احتراض کیا ھے - جن لوگوں کی رسائی بڑی کتابوں تک نہیں ھے اُن کے لیے یہ کتاب بہت مفید ھے - قابل مصنف کی محنت قابل شکریہ ھے —

---

## حیات احمد بن حنبل

( مولفہ مولانا ' شاہ محمد عزالدین صاحب پھلواری ' صفحات ۶۵ -
قیمت بارہ آنہ - بک ڈپو پھلواری ضلع پٹنہ )

امام احمد بن حنبل اُن برگزیدہ ھستیوں میں سے ھیں جنھوں نے علم اور اسلام کی بڑی خدمت کی ھے جن کا ایمان ایسا سچا اور مضبوط تھا کہ اس کے لیے انھوں نے ھر طرح کی ایذائیں اور عقوبتیں سہیں اور سخت سے سخت ایذا اور بڑے سے بڑے انعام کے وعدوں سے بھی اس میں ذرہ برابر لغزش نہ ھوی - اس مختصر کتاب میں ان کے حالات اور عقائد وغیرہ بیان کئے گئے ھیں —

---

## اسلامی نظام تعلیم

مترجمہ فضل کریم خاں درانی صاحب بی - اے صفحات ۵۶ - قیمت ۶ آنے
قومی کتب خانہ ریلوے روڈ - لاھور )

---

یہ رسالہ فاضل مستشرق ڈاکٹر دانیال ھانے برک کے ایک مضمون کا ترجمہ ھے - جس میں فاضل مصنف نے مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو

تحقیق و دیانت سے بیان کیا ہے - یہ بہت دلچسپ ' پر از معلومات اور عبرت خیز مضمون ہے - اسلام کے ابتدائی زمانے میں تقریباً نویں صدی تک بلکہ کچھ بعد بھی مسلمانوں میں طلب علم کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا اور یہ شوق انہیں شہر شہر ' ملک ملک اور جنگلوں اور صحراؤں میں لئے لئے پھرتا تھا - اگرچہ اس کی ابتدا مذہب سے ہوی اور سارا اہتمام اسی کی تعلیم کے لئے تھا لیکن اس کے طفیل میں دوسرے علوم مثلاً صرف و نحو رجال ' فلسفہ و منطق لغت و معانی وغیرہ بھی رواج پاگئے اور رفتہ رفتہ مذہبی دباؤ سے نکل کر خود ایک مستقل حیثیت قائم کرلی - ایک بڑی بات یہ تھی کہ تعلیم میں حکومت کا اثر بہت کم تھا مسجدیں مکتبوں اور مدرسوں کا کام دیتی تھیں اور عام شوق حوصلہ افزائی کرتا تھا - گوبعد میں امرا و وزرا اور بادشاہوں نے بھی بہت کچھ مدد دی اور اس کار خیر کے لئے اوقاف کا انتظام کردیا —

قابل مترجم نے ترجمہ بہت شستہ اور رواں کیا ہے اور علم کی خدمت کی ہے —

---

## دنیا کے بسنے والے

( مولفہ سید بشیر حسین صاحب زیدی بی - اے ( کینٹب )
بیرسٹرایٹ لا - مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی - )

---

اس رسالے میں دنیا کے مختلف حصوں کے باشندوں کے طرز ماند و بود اور ان کی مخصوص ملکی خصوصیتوں کو نہایت سادہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے - یہ رسالہ در اصل بچوں کے لئے لکھا گیا ہے اور ہمارے خیال میں وہ اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتا ہے - اس رسالے میں حسب ذیل ابواب ہیں :—

اسکیمو رتہ انڈین یا سرخ ہندی ' وسط ایشیا کے کرغی ' سوس ' بدو عرب افریقہ کے بونے ' سیوانا کے حبشی اور جاپان کے لوگ - ہر باب میں تصاویر کے ذریعہ سے باشندوں کی شکل و شباہت اور ملکی پیداوار کو پیش کیا گیا ہے - ان تصاویر کی وجہ سے کتاب کی دلچسپی میں اور اضافہ ہوگیا ہے - مولف نے اس کا خاص

طور پر اہتمام کیا ہے کہ ان کے پیرایۂ بیان سے بچوں کی دلچسپی آخر تک بدستور باقی رہے —

(ی)

---

# منطق و فلسفہ

## مبادی فلسفہ حصۂ اول

(یا فلسفہ کی پہلی کتاب، از مولانا عبدالماجد صاحب بی - اے، صفحات ۱۸۵ - معارف پریس اعظم گڈھ)

---

جیسا کہ فاضل مصنف نے دیباچے کے شروع میں بیان کیا ہے یہ "کوئی مستقل تصنیف نہیں، چند قدیم متفرق فلسفیانہ مقالات کا مجموعہ ہے" - لیکن اُن پر بڑے غور اور احتیاط سے نظر ثانی کی گئی ہے اور اس قدر قطع و برید، تبدیل و ترمیم، حذف و اضافہ کیا گیا ہے اور زبان کو شگفتہ اور رواں بنانے میں اس درجے کوشش کی گئی ہے کہ یہ ایک طرح کی جدید تصنیف ہو گئی ہے - اس میں چھ مقالے ہیں جن میں سے پانچ زمانہ ہوا بعض رسالوں میں شایع ہوئے تھے اور ایک (نفس و مفردات نفس) مصنف کی ایک غیر مطبوعہ و نا تمام تصنیف کا پہلا باب ہے —

اگرچہ تمام مضامین فلسفیانہ ہیں لیکن اس قدر صفائی، شستگی اور خوبی سے لکھے گئے ہیں کہ یہ صرف فلسفے کے طالب علم ہی کے لئے مفید نہیں بلکہ ہر پڑھا لکھا شخص جسے علم سے کچھہ ذوق ہے ان سے لطف حاصل کر سکتا ہے اور اپنی معلومات میں بہت کچھہ اضافہ کر سکتا ہے - اردو زبان میں اس قسم

کی بہت کم کتابیں ہیں - اس زمانے میں مولانا عبدالماجد صاحب نے فلسفیانہ مضامین' کی داغ بیل ڈالی اور اس شعبۂ علم پر مستقل تصانیف اُن کے قلم سے نکلیں اور اب تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے - اسی کتاب کے دیباچے میں دوسرے حصے کی بھی بشارت دی ہے اور امید ہے کہ وہ بھی جلد شایع ہو گی —

یہ کتاب علمی حیثیت بھی رکھتی ہے ادبی حیثیت بھی - اور علم و ادب دونوں کے شائق اسے شوق سے پڑھ سکتے ہیں اور ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب میں دونوں حیثیتوں سے شریک ہونے کے قابل ہے —

---

## اساس منطق

( تصانیف مولوی سید ابوسعید عبدالقدوس صاحب بہاری مدرس مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد - صفحات ۵۸' قیمت چھ آنے - سیدرکن الدین صاحب مدرسہ مصباح العلوم سے مل سکتی ہے )

—

ہمارے ہاں کی منطق کو سہل زبان میں ادا کیا ہے - ہر بیان کے ساتھ مشقی سوالات بھی ہیں - طلبہ کے لئے مفید ہے —

---

## آزادی

( ترجمہ مولوی سعید انصاری صاحب بی - اے ' مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرولباغ -دہلی )

—

جان اسٹوارٹ مل کی تصانیف لبرلی ' علم سیاست کی مشہور کتابوں میں سے ہے - اس میں ان مسائل سے بحث کی گئی ہے جو انفرادی آزادی کی بنیاد ہیں - ' مل ' انفرادیت کا کھلم کھلا حامی تھا - وہ ریاست اور جماعت اجتماعی کی

ضرورت کا منکر نہ تھا بلکہ انہیں فرد کا خادم اور اس کی نشو و نما کا الٹ کار تصور کرتا تھا - اس کتاب میں اس نے فرد کے حقوق کی حمایت کی ہے —

اس کتاب کو سعود انصاری صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے - ترجمہ سادہ اور عام فہم ہے - لیکن بعض جگہ مطالب میں پورے طور پر صفائی نہیں پیدا ہوئی - اس ترجمہ کے شروع میں پروفیسر محمد مجیب صاحب بی - اے (اکسن) کا نہایت پر مغز اور سانھہ ہی دلچسپ مقدمہ بھی ہے - اس میں 'مل' کے فلسفہ پر بحث کی گئی ہے - کتاب حسب ذیل ابواب پر منقسم ہے - باب اول دیباچۂ مصنف ؛ باب دوم آزادئی خیال ومباحثہ ؛ باب سوم انفرادیت بہبود انسانی کا ایک ذریعہ ہے ؛ باب چہارم فرد پر جماعت کے اختیارات کے حدود ؛ باب پنجم مثالیں (اس میں ان اصول و مبادیات کی عملی مثالیں پیش کی گئی ہیں جن کا تعلق نفس موضوع سے ہے) - یہ ترجمہ سلسلۂ اردو اکادیمی کا انہتر واں نمبر ہے —

(ی)

(اس کتاب کا ترجمہ مدت ہوئی راجہ نرندرو ناتھہ صاحب نے کیا تھا ' کیا اچھا ہوتا کہ مترجم صاحب اُسے دیکھہ لیتے - اگر اُس سے مقصد پورا ہو جاتا تو مناسب تغیر و تبدل کے ساتھہ راجہ صاحب سے اجازت لے کر شایع کر دیتے اور اس زحمت سے بچ جاتے —

(ایڈیٹر اردو)

---

## متفرقات

# Europe's Debt to Islam

## یعنی اسلام کا احسان یورپ پر

(مولفہ سعید ایم - ایچ زاھدی صاحب - کلکتہ - قیمت ایک روپیہ دو آنے - طلبہ سے بارہ آنے)

---

اس رسالے میں قابل مولف نے عربوں کی علمی ترقی کا خاکہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے -

اگرچہ یہ رسالہ مختصر ہے تاہم مولف نے اُن تمام علمی ترقیوں کو جو مسلمانوں نے ہر شعبے میں کی تھیں اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے کے بعد دل پر اس کا کچھہ نہ کچھہ نقش باقی رہ جاتا ہے - ملک کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر پی - سی - رے نے اس پر ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے —

---

## گلگشت دکن

( مصنفہ جناب مولوی محمد صبغت اللہ صاحب شہید انصاری
صفحات ۴۸ - چھوٹی تقطیع - مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ )

---

مصنف نے اس مختصر رسالے میں اپنے سفر دکن کے حالات لکھے ہیں - ان کا قیام دکن کے مختلف شہروں میں تین ہفتے رہا ہے اس عرصے میں انہوں نے دکن کی جن علمی، معاشی اور تمدنی ترقیوں کا مطالعہ کیا ہے ان کو سلیقے سے قلم بند کردیا ہے - جو لوگ دکن کے حالات سے بالکل ناواقف ہیں ان کے لئے یہ رسالہ مفید ہے —

( چ )

---

# اردو کے جدید رسالے

## الرائد

( ماہانہ - اڈیٹر ایم - کے - خاں صاحب - لاہور سالانہ چندہ تین روپے آٹھہ آنے )

---

یہ مہسائی مشنریوں کا ماہانہ رسالہ ہے جو اسی جنوری سے لاہور سے شایع

ہونا شروع ہوا ہے - اگرچہ عنوان پر مذہبی کے ساتھہ "معاشرتی اور سیاسی ماہوار اردو رسالہ" لکھا ہے لیکن پہلے نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادہ تر مذہبی ہے جس کا مقصد عیسائی مذہب کی خوبیاں دکھلانا ہے - پہلے سولہ صفحوں میں چند مضمون مختلف مذہبی اور غیر مذہبی مضمون ہیں باقی ایک جز پر "سلطان التفاسیر" ہے جو مسلسل اس رسالے میں شایع ہوگی - یہ قرآن شریف کی تفسیر ہے جس کے لکھنے والے پادری مولوی سلطان محمد خاں صاحب پروفیسر عربی ایف - سی کالج لاہور و آذیٹر نور افشاں ہیں معروف بہ پادری ایس - ایم پال جس کے متعلق یہ دعوی کیا گیا ہے کہ وہ بڑے تحقیق اور مدت دراز کے مطالعہ اور غور کے بعد لکھی گئی ہے - تفسیر کا منشا معلوم ہے - لیکن ہم اتنا ضرور کہتے ہیں کہ پادری صاحب ایک عالم آدمی ہیں انہوں نے اپنی اس تالیف میں ہر بحث کو بہت تہذیب اور شایستگی سے بیان کیا ہے اور ادب و احترام کو ہر موقع پر ملحوظ رکھا ہے - ان سولہ صفحوں میں صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے جو ابھی ختم نہیں ہوئی —

مارچ کے نمبر میں علاوہ تفسیر اور دوسرے مضامین کے یوسف علیہ السلام کا ڈراما اور ایک چھوٹا فسانہ بھی ہے —

رسالے کو سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے —

---

## طبیب

( ماہانہ - انجمن خدام الطب پٹنہ - مدیر محمد شریف صاحب بازید پوری - چندہ ایک روپیہ )

---

یہ رسالہ گورنمنٹ طبیہ اسکول پٹنہ کے اساتذہ کی سرپرستی میں اسی سال شایع ہوا ہے - طبی مسائل پر مضامین شایع ہوتے ہیں اور طبی کالجوں کے متعلق معلومات کا اندراج بھی ہوتا ہے عام فائدے کے مضامون بھی لکھے

جاتے ھیں - اور قدیم اور جدید طب دونوں پر بحث ھوتی ھے - مفید رسالہ ھے اور بہت سستا —

---

## ضیائے شمس

( ماھانہ - مدیر ظہیر احمد شمس صاحب سہارنپوری
سالانہ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے - سہارنپور

---

ادبی رسالہ ھے - سہارنپور سے شایع ھوتا ھے اس لئے بہت غنیمت ھے —

---

## ستارہ

( ماھانہ - اڈیٹر راجیشور ناتھ ورما - سالانہ چندہ دو روپے - لاھور )

---

ادبی رسالہ ھے - جس میں زیادہ تر نظم ' فسانے اور ڈرامے وغیرہ کی گنجائش ھے - اس کے لئے اڈیٹر صاحب نے اچھا سامان جمع کیا ھے - البتہ کوئی خاص بات نہیں ھے —

---

# رسالوں کے خاص نمبر

## حریم

یہ عورتوں کا رسالہ ھے اور لکھنؤ سے نکلتا ھے - اس کا سال نامہ بہت خوش نما

چھپا ہے اور بہت کام کے اور لطف کے مضامین جمع کئے ہیں - حفظان صحت ' تعلیم نسواں ' اصلاح رسوم ' طرح طرح کے فسانے ' نظمیں ' دستکاری کے گر اور سب سے زیادہ پر لطف بعض لذیذ کھانوں کے پکانے کی ترکیبیں ' یہ سب کچھ اس میں موجود ہے - پڑھی لکھی عورتوں اور لڑکیوں کے لئے اس رسالے میں تفریح و تعلیم کا اچھا خاصا سامان موجود ہے - قیمت اس سال نامے کی ایک روپیہ ہے حجم تخمیناً سوا دو سو صفحے ہے یہ قیمت کچھ زیادہ نہیں —

---

## ہمایوں

یہ رسالہ میاں بشیر احمد صاحب بی - اے ( آکسن ) بیرسٹرایٹ لا کی زیر ادارت ایک خاص اصول اور متانت کے ساتھ شایع ہوتا ہے - جنوری میں اس کا سالگرہ نمبر شایع ہوا جس میں تنوع مضامین کے ساتھ ہر قسم کی دلچسپی اور حسن خوبی کا خیال رکھا گیا ہے - متین تحریروں کے ساتھ تفریحی مضامین بھی ہیں - حکیمانہ نظموں کے ساتھ غزلیں بھی ہیں - چھوٹے فسانے ہیں تو ڈرامے بھی ہیں - خود فاضل اڈیٹر اور شریک اڈیٹر کی اچھی اچھی نظمیں درج ہیں - تصویروں کا معاملہ بہت بے ڈھب ہے تاہم ہمایوں کی تصویریں معقول ہیں اور مقابلتاً بہتر ہیں - اردو رسالوں کی تصویروں میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے —

---

## الہام (عید نمبر)

یہ رسالہ پندرہ روزہ ہے اور مولانا ابوالکلام ماہر دہلوی کی زیر ادارت دہلی سے شایع ہوتا ہے - اس رسالے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شروع سے آخر تک منظوم ہوتا ہے - چونکہ یہ عید نمبر ہے اس لئے عید پر متعدد نظمیں ہیں -

مدت ہوئی لکھنؤ سے ایک منظوم اخبار نکلا تھا جس میں خبریں تک نظم میں ہوتی تھیں —

---

## مشیر باغ بانی

پروفیسر جی- ایم - ملک ایم- ایس سی ( زراعت امریکہ ) کی اتھارٹی میں لاہور سے شایع ہوتا ہے - اس نے بھی اپنا سلگرہ نمبر شایع کیا ہے - اس میں کاشتکاری اور باغ بانی کے متعلق بہت سی کار آمد باتیں ملتی ہیں - جن لوگوں کو اس فن سے دلچسپی ہے وہ اس رسالے کو ضرور پڑھیں —

---

## میخانۂ (عید نمبر)

قابل اتھارٹر نے بڑی محنت سے عید پر مضامین اور نظمیں حاصل کی ہیں- شروع سے آخر تک سب مضمون عید سے متعلق ہیں - یہ کوئی آسان بات نہیں- رسالے کی حیثیت دیکھتے ہوئے یہ عید نمبر بہت غنیمت اور تعریف کے لائق ہے —

# اردو

جلد ۱۲ جولائی سنہ ۱۹۳۲ء حصہ ۳۷

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

کا

سہ ماہی رسالہ

# فہرستِ مضامین


| نمبر شمار | مضمون | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | روسی ناول پہلا دور پہلا باب | جناب مولوی محمد مجیب صاحب بی اے - آکسن | ۳۵۳ |
| ۲ | خطبات گارساں دتاسی تیرھواں خطبہ | مترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ پیرس-پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن . | ۳۸۰ |
| ۳ | پوچوئی | جناب محمد شرف عالم صاحب آرزو جلیلی ایم ایس سی ریسرچ اسکالر راوینشا کالج کٹک | ۴۱۷ |
| ۴ | اردو کے ان پڑھ شاعر | جناب مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی | ۴۲۶ |
| ۵ | ادبیات کی تعریف | از ٹیگور-مترجمہ پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا لنکار لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن | ۴۴۱ |
| ۶ | ترکی ادبیات کا احیاء ( ۲ ) | مترجمہ جناب مولوی سید وہاج الدین صاحب بی - اے ، بی - ٹی لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد | ۴۵۰ |
| ۷ | تبصرے | اڈیٹر و دیگر حضرات | ۴۸۵ |

# روسی ناول

## پہلا دور

### پہلا باب

### نکولائی وسیل یوچ گوگول

( ۱۸۰۹ - ۱۸۵۰ )

از

جناب مولوی محمد مجیب صاحب بی اے ( آکسن )

روسی انشاپردازی کی پہلی کوشیشوں کا ذکر ایک گذشتہ باب میں ہوچکا ہے - گوگول کی تصانیف میں روسی ناول اور ڈراما پہلی مرتبہ اپنی مخصوص اور دلفریب شکل میں نظر آتے ہیں - اس وقت تک روسی ادیب یورپی مذاق کی پیروی کرتے رہے تھے ' گوگول نے ہمت سے کام لے کر اپنی بات اپنے انداز سے کہی ' اور تعلیم یافتہ روسیوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا - اس کے زمانے میں رومانیت کا اثر زائل نہیں ہوا تھا ' پشکن کے قصے اور اکثر نظمیں اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں ' اس کی ایک جھلک تورگنیف کے افسانوں میں بھی ملتی ہے ' لیکن گوگول کے افسانوں میں اس کی بو بھی نہیں ' تربیت اور مذاق کے اعتبار سے وہ ٹھیٹھ دیسی آدمی تھا ' اور بعد کی زندگی بھی اس کی طبیعت کو بدل نہ سکی ' وہ صوبہ اوکرائن کے ایک گانوں میں پیدا ہوا -

اس کا باپ کوسک نسل کا ایک چھوٹا زمیندار تھا ' اور اس کا بچپن ایک ایسی فضا میں گذرا ' جس پر پرانی کوسک وضع اور فلسفۂ زندگی کا اثر اس وقت تک نمایاں تھا ' گوگول کی ذہنیت اس دیہاتی کی سی تھی جو شہری زندگی کی نفاستوں سے مرعوب نہیں ہوتا ' اسکول اور کالج میں اس کی آزاد خود مختار اور مغرور طبیعت نے اس کی تعلیم میں بہت خلل ڈالا - اکثر مضمون جو پڑھائے جاتے تھے نا پسند تھے یونانی اور روسی ادب کو وہ حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا ' اور جرمن اور فرانسیسی انشا پردازی کی بھی اس کے دل میں زیادہ عزت نہیں تھی اس لئے اس نے ان چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی - عام معیار کے لحاظ سے اس کی تعلیم خراب رہی ' لیکن اس خرابی کا نتیجہ اچھا نکلا - اس نے طالب علمی کے زمانے ہی سے ناولیں ' افسانے اور ڈرامے لکھنا شروع کر دئے ' اور یہ مشق آگے چل کر بہت کار آمد ثابت ہوئی - اٹھارہ برس کی عمر میں وہ اپنا وطن چھوڑ کر پیٹرز برگ پہنچا ' اور وہاں اُسے وزیر زراعت کے دفتر میں ملازمت مل گئی - لیکن اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ ایک طریقے پر زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا - دو سال کے اندر اس نے ملازمت ترک کر دی ' اور یورپ کا سفر کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا ' مگر آدھے راستے سے واپس آ گیا - اس کی تعلیم کی طرح اُس کے اس سفر کا نامکمل رہ جانا بھی اس کی ذہنی آزادی کی علامت تھی اور یہ اس کے حق میں بہت اچھا ہوا ' اگر وہ یورپ جاتا تو ممکن ہے اپنے خلقی ذوق اور آزادی کو وہیں چھوڑ آتا ' سفر سے واپس آنے کے بعد اس نے انشا پردازی کا شغل اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا ' اور ۱۸۳۱ میں اس کی پہلی کامیاب تصنیف شائع ہوئی ' جس کا عنوان " جکانکا کے قریب ایک باڑی میں سنی ہوئی کہانیاں " تھا - افسانوں کے اس مجموعے نے

گوگول کو مشہور کر دیا ' کیونکہ ان میں وہ تمام خوبیاں تھیں جنھوں نے گوگول کو روسی ادب میں اس کے بلند درجے پر پہنچایا ہے —

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے - ان افسانوں میں دیہاتی زندگی کے قصے سنائے گئے ہیں - یہ بجائے خود ایک جدت تھی ' مگر ان افسانوں کے اور اوصاف کے مقابلے میں یہ بہت ادنیٰ صفت معلوم ہوتی ہے - گوگول نے اُوکرائن کے مناظر قدرت کی نہایت دلکش تصویریں کھینچی ہیں ' اسے زبان پر اتنی قدرت تھی کہ اس کی باریک بین نظر اس کا نازک احساس اور اس کی ہمدردی بھری ظرافت اپنا پورا کمال دکھا سکی ' اس کے افسانوں میں مافوق الفطرت قوتوں کا اکثر ذکر آتا ہے ' ان میں بھوت پریت ' چڑیلیں اور شیطان بے تکلفی سے انسانی زندگی میں شریک ہوتے ہوئے اور مداخلت کرتے دکھائے گئے ہیں ' لیکن جن لوگوں کا رہنا سہنا اور فلسفۂ زندگی بیان کیا گیا ہے ' وہ ان سب چیزوں کو مانتے تھے اور اس عقیدے کو ان کے کردار سے بہت گہرا تعلق تھا ' اس لئے در اصل بھوت پریت کے ذکر سے افسانوں کی حقیقت نگاری پر حرف نہیں آتا ' گوگول کی طبیعت میں دیہاتی فضا اور دیہاتی لوگوں کی سرشت کے ہر رنگ اور ہر کیفیت کے سمجھنے کی وجدانی قوت تھی ' اس کی زبان کی شستگی ' شیرینی اور روانی ' پڑھنے والے کے سامنے ایسی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دیتی ہے کہ حقیقت اور افسانے کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے '

" اوکرائن کی رات دیکھئے : بیچ آسمان سے چاند زمین کو تک رہا ہے ' آسمان کا گنبد جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ' معلوم ہوتا ہے پھیل کر اور وسیع ہو گیا ہے - اور اب گرم ہے اور سانسیں بھر رہا ہے ' ساری زمین پر سنہری روشنی چھٹکی ہوئی ہے ؛ پرتا ثیر ہوا میں خنکی ہے '

وہ آدمی کو گلے مل کر بھیجتی ہے اس کی رفتار متوالی اور خوشبوؤں کے سمندر کو جنبش دیتی ہے ' جانفزا رات ' مسحور رکن رات ! جنگل ' کسی روحانی کیف میں ڈوبے ہوئے ساکت کھڑے ہیں اندھیرے میں لپٹے ہیں ' اور اپنے سائے سے دور دور تک اندھیر اپھیلا رہے ہیں ' تالاب خاموش اور ساکن ہیں ' ان کی سطح پر ایک لہر تک نہیں ' ان کے پانی کی ٹھنڈک اور تاریکی باغوں کی سیاہی مائل سبزدیواروں میں قید ہے ' اور قید ہونے سے کچھ اداس ہوگئی ہے ' جنگلی پھلوں کی گھنی جھاڑیاں جن میں کسی انسان نے آج تک قدم نہیں رکھا ہے ڈرتی ڈرتی اپنی جڑوں کو چشمے کے ٹھنڈے دھارے کی طرف پھیلاتی ہیں ' اور ان کی پتیاں چپکے سے کچھ کہتی ہیں ' ایسے لہجے میں جس سے ناراضگی اور خفگی ظاہر ہوتی ہے ' جب رات کی ہوا کا کوئی شریر جھونکا آہستہ آہستہ آتا ہے اور آنکھ بچا کر ان کا بوسہ لے لیتا ہے ' ساری زمین پر نیند طاری ہے ' مگر آسمان پر چاند اور تارے سب آنکھیں کھولے جاگ رہے ہیں ' اور اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں - انسان کی روح میں اس وقت عجیب وسعت پیدا ہوجاتی ہے ' اور اس کی تہ سے ہزارہا چاندی کی طرح چمکتے ہوے خیالی پیکر نکل کر دنیا کو آباد کر دیتے ہیں - جانفزارات ! مسحور رکن رات ! یکبارگی خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے ' اور جنگل اور تالاب اور میدان سب جاگ اٹھتے ہیں ' ہر طرف سے اُکرائنی بلبلوں کے نغموں کی بارش ہونے لگتی ہے ' اور خیال ہوتا ہے کہ چاند تک ان کے سریلے راگوں کو محویت سے سن رہا ہے ..... ٹیلے پر کانو اونگھ رہا ہے ' جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو - چاندنی میں اس کے جھونپڑے چمکتے ہیں ' اور رات کے ساتھ ان کی چمک بڑھتی جاتی ہے ..... کانو والے سب جی بھر کر گیت گا چکے ہیں ' اب ہر طرف خاموشی ہے ' بھلے آدمی سب سو گئے ہیں ' صرف کہیں کہیں تنگ کھڑکیوں میں چراغ کی روشنی نظر آتی ہے یا کسی گھرانے کے لوگ جنھیں کسی وجہ سے دیر

ہوگئی ہے دروازے کے باہر بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے ہیں ....."

یہ منظر " مئی کی رات " سے لیا گیا ہے ' جو اس مجموعے کا ایک افسانہ ہے ' اسی افسانے کے دو اشخاص سراپا ملاحظہ ہو : ایک گانو کا مکھیا ہے' دوسرا شراب ساز جو گانو میں شراب کا کارخانہ قائم کرنے کے لئے آیا ہے —

" مکھیا کے ماتھے پر ہمیشہ بل رہتے ہیں' اس کا چہرہ روکھا ہے' وہ زیادہ بک بک پسند نہیں کرتا' بہت زمانہ ہوا..... جب ملکہ کیتھرین الٰہ بخشے' دارالسلطنت سے کریمیا جارہی تھیں تو وہ ان کے ہمراہ بوتی گارڈ کے طور پر جانے کے لئے اپنے گانو والوں میں سے منتخب کیا گیا تھا' اور اسے شاہی کوچوان کی بغل میں بیٹھنے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا . اسی زمانے سے مکھیا نے عقلمندی اور اہمیت کے احساس سے سر جھکانا' اپنی لمبی اور جھکی ہوئی مونچھوں پر تاؤ دینا اور ہر چیز کو ترچھی' شکرے کی سی تیز نظر سے دیکھنا سیکھا' اسی زمانے سے مکھیا میں اس کی قابلیت پیدا ہوگئی کہ چاہے جس مسئلہ پر گفتگو ہو وہ باتوں کو ایر پھیر کر اپنی اس داستان کی طرف لے آئے کہ وہ ملکہ کی ہمراہی کے لئے کس طرح سے منتخب ہوا' اور اسے شاہی کوچوان کی بغل میں بیٹھنے کا شرف کیونکر حاصل ہوا . مکھیا کو کبھی کبھی بہرا بننے میں مزہ آتا ہے' خصوصاً جب اسے ایسی باتیں سنائی جاتی ہیں' جنھیں وہ سننا نہیں چاہتا ہے' مکھیا لباس میں کسی قسم کا بانکپن برداشت نہیں کرسکتا ..... مکھیا رنڈوا ہے' مگر اس کے گھر میں اس کی سالی رہتی ہے' جس کا کام دونوں وقت کھانا پکانا ' بنچیں دھونا ' مکان پر سفیدی کرنا' کپڑوں کے لئے سوت کاتنا' اور گھر گرستی کی

دیکھہ بھال کرتا ہے، گانو میں مشہور ہے کہ مکھیا سے اس کی کوئی عزیز داری نہیں، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ مکھیا کے بہت سے بدخواہ ہیں، جو ہر قسم کی افواہ خوشی سے پھیلانے پر تیار رہتے ہیں ..... یہ بھی ممکن ہے، لوگوں کو بات بنانے کا موقع اس وجہ سے ملا ہو کہ مکھیا کی سالی کو ہمیشہ برا لگتا ہے، اگر مکھیا کسی ایسے کھیت میں چلا جائے جہاں گانو کی عورتیں کام کرتی ہوتی ہیں، یا ایسے کوسک سے ملنے جاتا ہے، جس کے گھر میں جوان لڑکی ہوتی ہے، مکھیا کانا ہے، مگر اس کی اکیلی آنکھہ — بڑی شریر ہے، اور دور سے خوبصورت عورت کو پہچان لیتی ہے - ہاں، مگر وہ خوبصورت چہرہ کی طرف توجہ کرنے سے پہلے اچھی طرح اِدھر اُدھر دیکھہ لیتا ہے، کہ کہیں اس کی سالی کی نظر تو اس پر نہیں پڑ رہی ہے ....."

شراب ساز مکھیا کے یہاں مہمان آیا ہے . " ایک ٹھنگنا، موٹا سا آدمی جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر وقت ہنستی رہتی ہیں، غالباً وہ اس خوشی کو ظاہر کرنے کے لئے جو اُسے اپنا چھوٹا سا پائپ پینے میں ہوتی ہے . وہ ہر منٹ ٹھوکتا رہتا ہے، اور اس کے ساتھہ ہی انگلی سے پائپ میں تمباکو کی راکھہ دبا تا جاتا ہے . دھوئیں کے بادل اس کے منھہ اور اس کے پائپ سے نکل کر ہر طرف چھائے ہیں، اور خود اسے بھی سرمئی رنگ کے کہرے نے لپیٹ لیا ہے . معلوم ہوتا ہے کسی شراب کے کارخانے کا دود دان جو چھت پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہے، سیر کے شوق میں نکلا ہے اور مکھیا کے گھر میں آکر ادب سے میز کے پاس بیٹھہ گیا ہے شراب ساز کی ناک کے نیچے اس کی گھنی اور چھوٹی مونچھیں ہیں، جن کے سارے بال کھڑے ہیں، لیکن پائپ کے دھوئیں میں وہ بہت دھندلی نظر

آرہی ہیں، اور خیال ہوتا ہے وہ مونچھیں نہیں ہیں بلکہ ایک چوہا جسے شراب ساز منہ میں دبائے ہوئے ہے .....''

'' باڑی میں سنی ہوئی کہانیوں '' کے بعد ہی گوگول نے ایک مجموعہ '' میر گورو '' کے عنوان سے شائع کیا - میر گورو نام ہے پولتاوا کے پاس ایک گانو کا جس میں گوگول پیدا ہوا تھا، اس مجموعے میں گوگول کی انشا پردازی کی خوبیاں اور نکھر آئیں - اور اس میں ظرافت کے ساتھ درد ہے جو پہلے مجموعے میں نہیں پایا جاتا - ' ایک آنکھ سے ہنسنا ' ایک سے رونا ' گوگول کی انشا پردازی اور حقیقت نگاری کا خاص وصف ہے ' اور اس مجموعے میں یہ وصف اپنی پوری شان سے نظر آتا ہے - لیکن ' گوگول کی طبیعت نہ معلوم کس وجہ سے ناول نویسی سے ہٹ گئی ' اور اس نے روس کوچک * کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کرکے قدیم کتابوں اور تاریخی داستانوں کا مطالعہ شروع کیا - اس میں مورخ بننے کی صلاحیت بہت کم تھی ' اور اس کے مطالعے کا پہلا نتیجہ - '' تراس بلبا '' ایک تاریخی ناول کی صورت میں نکلا - ناول کی تاریخی بنیاد بہت کمزور ہے ' کبھی کبھی مصنف بھول جاتا ہے کہ اسے زمانہ زیر بحث کے ذہنی معیار کا لحاظ رکھنا چاہئے ' اور اس لئے بعض تقریریں جو ناول کے اشخاص کرتے ہیں مصنوعی معلوم ہوتی ہیں ' مگر رزمیہ داستان کی حیثیت سے ناول نہایت قابل قدر ہے ' اور کوسک نسل کی مردانگی ' بہادری ' جفا کشی اور سادگی کی جو تصویریں

---

* روس کا جنوب مغربی حصہ جس میں '' چھوٹے '' روسیوں کی نسل آباد ہے - '' چھوٹے '' اور '' بڑے '' روسیوں میں قد کے علاوہ سیرت اور مزاج کا بھی کچھ فرق ہے ' '' چھوٹا '' روسی فطرتاً ہنس مکھ ہوتا ہے '' بڑا '' روسی غمگین اور پاس مشرب —

کھینچی گئی ھیں بہت ھی ھمت افزا اور سبق آموز ھیں ' ایک بوڑھے باپ کا اپنے بیٹوں کی طاقت آزمائی کے لئے ان سے کشتی لڑنا ' اس کے ایک لڑکے کا شائستگی اور نفاست پسندی کی تحقیر کرنے کے لئے بہت اچھے کپڑے پہن کر زمین میں لوٹنا ' اس ماں کے دل کی کیفیت جو اپنے بچوں کی ھمت جواں مردی پر فخر کرتی ھے مگر دل سے خوف اور اندیشہ ' نہیں نکال سکتی ھے یہ سب پہلے صفحوں ھی میں بیان کیا گیا ھے ' اور سارے ناول میں یہ فضا قائم رھتی ھے ' " تراس بلبا " کی تصنیف کے بعد گوگول کا تاریخی مطالعہ کچھہ دن جاری رھا ' مگر روس کو چک کی تاریخ محض خیال ھی کی صورت میں رھی - چند مضامین کی بنا پر جو بظاھر بہت عالمانہ تھے گوگول کو تاریخ کے پروفیسر کی جگہ مل گئی ' مگر اس کے علم کا سارا سرمایہ پہلے لکچر میں ختم ھو گیا اور تقرر کے تیرہ سال بعد اسے مجبوراً استعفا دینا پڑا —

اس کے بعد پھر گوگول نے عالم فاضل سمجھے جانے کی ھوس نہیں کی اور ناول نویسی میں مشغول ھو گیا ' دو تین سال کے اندر اس نے " گل کاریوں اور کہانیوں " کے عنوان سے افسانوں کا تیسرا مجموعہ شائع کیا جس کے بہترین قصے " پرانی وضع کے زمیندار " " اوان اوان کی لڑائی " نفسکئی پروسپکت " اور " لبادہ " ھیں —

" پرانی وضع کے زمیندار " ایک بڈھے اور بڑھیا افناسی ئی اوانووچ اور پلخیریا اوانو فنا کی کہانی ھے - دونوں چین سے رھتے تھے ' ایک دوسرے سے اور ساری دنیا سے خوش تھے - لیکن اگر زندگی کے معنی حرکت اور تغیر ھیں تو وہ دونوں جوانی میں بھی " زندگی " کی نعمت سے محروم تھے - گوگول کو ان سے بہت محبت ھے - ان کے سفید بالوں سے اور ان

کے معصوم دلوں سے ' مگر ان کی تصویر کھینچنے میں اس کا اصل مقصد روسیوں کی ذہنی بے مائیگی اور ان کی زندگی کا جمود دکھانا ہے ' اور اس لحاظ سے یہ افسانہ ایک ادبی کارنامہ ہے افناسی اوانووچ دن بھر کھاتے رہتے ہیں ' ان کی بیوی پلخیریا اوانوفنا کا دن میتھے اچار اور مربے تیار کرنے میں گزرتا ہے ' گفتگو بھی کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق ہوتی ہے البتہ " کبھی کبھی آسمان صاف ' دن اجالا اور کمرے خوب گرم ہوئے تو افناسی اوانووچ کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے ' اور وہ پلخیر یا اوانوفنا کا مذاق اُڑاتے ہیں ..... "

پلخیر یا اوانوفنا ' اگر ہمارے گھر میں ایک بارگی آگ لگ گئی تو پھر ہم کہاں جائیں گے ؟ "

" یہ لو - خدا نہ کرے ! " بڑی بی کہتی ہیں اور صلیب کا نشان بناتی ہیں —

" پھر بھی ' فرض کرو کہ ہمارے گھر میں آگ لگ گئی تو ہم کہاں بھاگ کر جائیں گے ؟ "

" خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں - افناسی اوانووچ ! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے گھر میں آگ لگ جائے ؟ خدا کو یہ ہرگز منظور نہ ہوگا . "

" پھر بھی اگر سب کچھ جل گیا ؟ "

گھر سب جل جائے تو میں باورچی خانہ میں چلی جاؤں گی ' اور آپ اس کمرے میں جہاں چوکی ڈالنی رہتی ہے . "

" اگر باورچی خانے میں آگ لگ گئی اور سب جل گیا ؟ "

" لو اور سنو ! خدا ہمیں ایسی مصیبت سے بچائے کہ گھر میں آگ لگ جائے اور باورچی خانے میں بھی ' اگر ایسا ہوا تو ہم گوشام میں

جاکر رہیں گے ' جب تک دوسرا مکان نہ بن جائے ۔ ''

'' اور اگر گودام میں بھی آگ لگ گئی ؟ ''

'' خدا جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں ' بس اب میں بہت سن چکی ' ایسی باتیں کرنا گناہ ہے ' ایسی باتوں کی خدا کے یہاں سے سزا ملتی ہے ! ''

افناسی اوانووچ ' اس بات سے خوش ہوکر کہ اُنھوں نے پلخیر یا اوانوفنا کا مذاق اُڑیا ہے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مسکراتے رہتے ۔ ''

ایسی زندگی کا انجام بھی بہت مناسب ہوا : پلخیر یا اوانوفنا کی بلی کھوگئی ' کچھہ دنوں کے بعد انھیں اسی طرح کی بلی باغ میں دکھائی دی ' اور وہ اسے چمکار پکار کر گھر ساتھہ لائیں ' اور پیالہ بھر دودھ اس کے سامنے پینے کے لئے رکھدیا ' مگر جیسے ہی اُنھوں نے اس کی پیٹھہ سہلانے کے لئے ہاتھہ بڑھایا بلی زن سے کھڑکی سے کود کر نکل بھاگی ' پلخیر یا اوانوفنا کو یقین ہوگیا کہ در اصل یہ ایک بلی نہیں تھی بلکہ ان کی موت جو بلی کی شکل میں آئی تھی ' انھوں نے گھر کا سب سامان ٹھیک کیا ' افناسی ئی اوانووچ کے لئے اتنے مربے اور اچار تیار کردئے کہ وہ برسوں تک کھاتے رہیں اور یہ وصیت کی کہ ان کا کفن سلمل کا ہو ' اس لئے کہ وہ سستا ہے ' اور اسی کا سا جو دوسرا کپڑا رکھا ہے اس کی افناسئی اوانووچ کے لئے عبا تیار کرائی جائے ۔ یہ وصیت کرنے کے کچھہ دنوں بعد وہ سرگئیں ' افناسئی اوانوچ چار پانچ سال اور زندہ رہے ' اور پھر خوشی خوشی اپنی پلخیر یا اوانوفنا سے ملاقات کے لئے چل دئے —

'' اوان اوان ' کی لڑائی '' عام روسی زندگی کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالتی ہے ۔ دو اوسط درجے کے زمیندار ذرا سی بات پر ایک دوسرے

سے بگڑ جاتے ہیں - ان میں صلح ' کرانے کی بہت کوشش کی جاتی ہے ' دونو چاہتے ہیں کہ پھر آپس میں دوستی ہوجائے ' مگر عین اس وقت جب وہ بغل گیری کے لئے طیار ہوتے ہیں ' تو ذرا سی بات پر لڑائی ہو جاتی ہے ' اور مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی —

" نفسکئی پر اسپکت " میں گوگول نے روسی شہر کی ایک درد ناک داستان سنائی ہے - دو نوجوان ' ایک فوجی افسر ' اور دوسرا مصور جن کی آپس میں جان پہچان تھی ' پیتر برگ کی مشہور سڑک نفسکئی پر اسپکت پر چلے جارہے تھے ' ان کے سامنے سے دو عورتیں گذریں ' جونہایت حسین تھیں ' ان میں سے ایک کے بال سیاہ تھے ' دوسری کے سنہرے ' فوجی افسر نے سنہرے بالوں والی کا پیچھا کیا ' مصور نے سیاہ بالوں والی کا ' محض اس ارادے سے کہ اِس کے مکان کی شان و شوکت دیکھے ' کیوں کہ بظاہر وہ بہت امیر معلوم ہوتی تھی ' لیکن وہ ایک معمولی طوائف نکلی ' مصور کی بھولی معصوم طبیعت ' جس پر اس عورت کے حسن کا بہت اثر ہوا تھا ' اس صدمے کی تاب نہلاسکی ' اور چند دنوں میں وہ ایک نازک پھول کی طرح کمہلا کر مر گیا - جس عورت کے فراق میں فوجی افسر گیا تھا وہ ایک جرمن موچی کی بیوی تھی ' افسرنے بہت کوشش کی کہ اس سے آشنائی ہوجائے ' مگر کامیاب نہ ہوا ' اور آخر کار جب جرمن موچی نے اسے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھہ اکیلا دیکھا تو اپنے دوست کی مدد سے اسے اٹھاکر دروازے کے باہر پھینک دیا - فوجی افسر ایسا بے حیا تھا کہ اس بے عزتی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا - اور دوسرے دن وہ اسے بالکل بھول گیا —

" نفسکئی پراسکت " گوگول کے عام طرز سے جدا ہے ' مگر اس میں بھی اس کی باریک بینی اور ظرافت اپنا رنگ دکھاتی ہیں . صبح سے

شام تک جو مختلف قسم کے لوگ نفسکائی پراسپکت پر سے گذرتے ہیں ان کے اوصاف نہایت مفصل اور دلچسپ طریقے پر دکھائے گئے ہیں۔ جرمن موچی، جو اپنی ناک کتوا ڈالنا چاہتا ہے، کیونکہ ناک کی وجہ سے اس کی ناس لینے کی عادت پڑ گئی ہے اور ناس خریدنے میں اس کا بہت روپیہ صرف ہوتا ہے، گوگول کے بہترین مضحک کیرکٹروں میں سے ہے۔

اس وقت تک گوگول کے تصور نے جو خیالی پیکر بنائے تھے، وہ روسیوں کے سچے نمونے تھے، لیکن وہ کیرکٹر جس کے ہم شکل روسی ناولوں میں ہزاروں کی تعداد میں نظر آتے ہیں اور جسے عام رائے نے روسی تمدن کی مخصوص پیداوار قرار دیا ہے، پہلی بار گوگول کے افسانے "لبادے" میں اپنی صورت دکھاتا ہے، "لبادے" کا ہیرو اکاکئی اکاکئی وچ ایک مضحک مگر سیدھا سادا اور مسکین آدمی ہے، جسے دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ کہہ اٹھتے ہیں: "دیکھو بچارے فریب کو"۔ اکاکئی اکاکئی وچ ایک دفتر میں نوکر ہے، جہاں اسے زیادہ تر کاغذات اور خطوط نقل کرنے کے لئے دیے جاتے ہیں۔ اس کام سے اس کا جی نہیں گھبراتا، بلکہ اسے اس میں خاص لطف آتا ہے، کیونکہ اسے خوش نویسی کا شوق ہے، اور اس کام میں اسے خوش نویسی کا بہت موقع ملتا ہے۔ خطوط اور کاغذات نقل کرنے کا کام اس کے لئے پر لطف اور رنگا رنگ احساسات کا ایک عالم تھا ایک خاص قسم کے خط اسے بہت ہی پسند تھے۔ اگر انہیں دوبارہ لکھنا ہوتا تو اسے دلی مسرت ہوتی۔" لیکن "شوق" اور "لطف" کے الفاظ اکاکئی اکاکئی وچ کے صحیح جذبات ادا نہیں کرسکتے، اسے اپنے کام سے حقیقی عشق ہے، اس کی ساری امیدیں، ارمان اور تمنائیں اسی سے وابستہ ہیں، زندگی کا کوئی مزہ نہیں جو اسے اس کام میں حاصل نہ

ہوتا ہو. لیکن اکاکئی اکاکئے وچ کا جسم ذرا کمزور ہے' جاڑوں میں اسے سردی بہت لگتی ہے' اس لئے اس کا بہت جی چاہتا ہے کہ ایک لبادہ خریدے' اور رفتہ رفتہ خطاط ہونے کے علاوہ ایک نئے لبادے کا مالک بننا بھی اس کی دلی آرزؤں میں شامل ہوجاتا ہے' کئی سال تک تھوڑا تھوڑا روپیہ اکھٹا کرکے وہ آخر کار ایک نیا لبادہ خریدتا ہے' مگر آسمان کا ظلم دیکھئے' اکاکئی اکاکئے وچ کا لبادہ پہلے ہی دن چوری جاتا ہے ۔ اس کا دل ایسا سخت صدمہ برداشت نہیں کرسکتا' وہ بے چارہ مرجاتا ہے' اور بھوت بن کر شہر میں مارا مارا پھرنے لگتا ہے —

عموماً دنیا اکاکئے وچ جیسے بچارے غریبوں پر ہنستی ہے' اور اس کی ہنسی حقارت بھری ہوتی ہے' روسی حقیقت نگار اپنی قوم کے نمونوں کی صورت اور سیرت کے تمام پہلو کمال وضاحت اور باریک بینی سے دکھاتے ہیں' مگر اپنے تعصبات اور رجحانات کو اس طرح سے معطل کردیتے ہیں کہ ان کی صورت گری میں حقیقت کا منظر دکھانے کے سوا اور کوئی خواہش یا ارادہ ظاہر نہیں ہوتا' ہم ان کے کیرکٹروں کو ان کی نظر سے نہیں ' اپنی نظروں سے دیکھتے ہیں ' اور ہمارے دلوں پر وہ اثر نہیں ہوتا جو حقیقت نگار پیدا کرنا چاہتے ہیں ' بلکہ وہ جو خود بخود پیدا ہوتا ' اگر ہم ایسی ہستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے . اکاکئے وچ جیسے لوگوں سے ہمیں پہلے الجھن ہوتی ہے' پھر ان پر غصہ آتا ہے' اور آخر کار اگر ہم کو انسانی ہمدردی چھو بھی گئی ہے ' تو ہم کو ان پر ترس آتا ہے ' اور دل محبت کے درد سے بھر آتا ہے گو گول کی بحیثیت انسان کے یہی کیفیت تھی ' لیکن بحیثیت آرٹسٹ اور مصور کے اس نے بچارے اکاکئے وچ پر رحم

کہا کر یا اس سے خفا ہو کر کسی قسم کا مبالغہ یا غلط بیانی جائز نہیں رکھی - وہ ایک آنکھہ سے اکاکیے وچ پر ہنستا ہے ' اس لئے کہ اکاکیے کے مضحک ہونے میں کوئی شک نہیں ' اور ایک آنکھہ سے روتا ہے ' اس لئے کہ اکاکیے وچ بھی انسان ہے اور ہمدردی کا مستحق ' جذبات کے گھوڑے کو ایڑ لگا کر پھر اس طرح روکنا خواہ کتنا مشکل اور تکلیف دہ ہو ' حقیقت نگاری کا تقاضا تھا اکاکیئے وچ جیسے لوگ ہر گز نظر انداز نہ کئے جائیں - روس میں اکاکیے وچ جیسے ' بچاروں ' کے وجود کا سب نے گوگول کا افسانہ پڑھتے ہی اعتراف کیا ' بلکہ یہ بھی تسلیم کر لیا کہ روس کے اکثر باشندوں میں اکاکیے وچ کی کوئی نہ کوئی صفت موجود ہے - چنانچہ افسانہ پڑہ کر گوگول کے معاصرین میں سے کسی نے لکھا : ' " ہم سب گوگول کے ' لبادے ' سے نکلے ہیں " جس کے معنی یہ تھے کہ ہر روشن خیال روسی ' بچارے ' اکاکیے وچ سے مشابہت محسوس کرتا تھا ' بے کسی نے اسے بھی اکاکیے وچ کی طرح مضحک اور مسکین اور قابل رحم بنا دیا تھا ' اور تقدیر اس کے اور اس کی تمناؤں کے ساتھہ بھی ویسا ہی سلوک کرتی تھی ' جیسا اس نے اکاکیے وچ کے ساتھہ کیا —

' گل کاریوں اور کہانیوں ' کے بعد گوگول نے دو ڈرامے لکھے ' ' انسپکٹر جنرل ' اور ' شادی ' - ان میں مضحک کیرکٹروں کی کوئی انتہا نہیں ' لیکن ان میں بھی وہی لا شخصی انداز نمایاں ہے جو گوگول نے اکاکیئے وچ کی صورت گری میں اختیار کیا تھا ' اور ان موقعوں پر بھی جب گوگول ہمیں ہنسی سے بیچین کر دیتا ہے ' انسانی ہمدردی آنسوؤں یا آہوں کی شکل میں اپنا خراج وصول کر لیتی ہے - ' انسپکٹر جنرل ' کے کیرکٹر مضحک ہونے کے علاوہ مفسد اور بد دیانت بھی ہیں ' اور گوگول نے ڈراما محض

ان کا مذاق اُڑانے کے لئے نہیں بلکہ اس غرض سے بھی لکھا تھا کہ قوم سرکاری ملازموں کی رشوت خوری اور بے ایمانیوں سے آگاہ ہو، مگر مصور کے کمال نے مصلح کے خیالات پر بالکل پردہ ڈال دیا اور ریاست کی بد نظمی پر خفا ہونے کے بجائے ہم کو ان لوگوں کی بے چارگی اور بے کسی پر ترس آتا ہے جو فطرتاً ایک خاص طرح کا چال چلن اختیار کرنے پر مجبور ہیں، اور اپنی صفائی کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اس طرح کہ بالکل مسخر معلوم ہونے لگتے ہیں۔

انسپکٹر جنرل کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک شہر کے سرکاری عہدہ داروں کو پتہ لگتا ہے کہ دارالسلطنت سے ایک خاص افسر ان کا کام جانچنے کے لئے بھیجا جا رہا ہے، کیونکہ ان لوگوں کی مرکزی حکومت تک بہت سی شکائتیں پہنچی ہیں۔ شہر کے تمام عہدہ دار یہ خبر سن کر گھبرا جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا ہے، سب بڑے رشوت خور ہیں، اور تمام شہر والے ان کی حرکتوں سے بہت نالاں ہیں، اس لئے سب کو یقین ہے، کہ اگر واقعی انسپکٹر جنرل بھیجا گیا تو ان کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ انسپکٹر جنرل بھیس بدل کر آئے گا، اور بد حواسی میں وہ ایک آوارہ نوجوان کو جو اتفاق سے شہر کے ایک ادنیٰ ہوٹل میں آکر ٹھیر گیا ہے، انسپکٹر جنرل سمجھ لیتے ہیں۔ یہ نوجوان جسے روپے کی سخت ضرورت تھی، تقدیر کے اس کھیل سے فائدہ اُٹھاتا ہے، اور خوب دعوتیں کھا کر اور روپیہ وصول کرکے اپنا رستہ لیتا ہے، آخر میں ان سب کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوجوان انسپکٹر جنرل نہیں تھا، کوئی معمولی لفنگا تھا، اور اسی وقت کوئی سپاہی آکر اطلاع دیتا ہے کہ انسپکٹر جنرل آیا ہے اور اس نے سب کو طلب کیا ہے۔ —

جملی انسپکٹر جنرل کے آنے کا منظر نہایت دلچسپ ہے صدر کو جیسے

ھی خبر ھوتی ھے کہ دارالسلطنت سے ایک بڑا افسر آنے والا ھے ' وہ تمام بڑے عہدہ داروں کو بلا بھیجتا ھے ' اور انھیں یہ خبر سنا دیتا ھے . سب کے سب بہت پریشان ھوتے ھیں ' مگر چونکہ سب پر یکساں گرفت ھوسکتی ھے ' اس لئے ایک دوسرے کو تنبیہ کرتے ھوئے بھی ڈرتے ھیں صدر میونسپلٹی ھچکچا کر منصف سے کہتا ھے :—

" آپ کی کچہری کے برآمدے میں' جہاں لوگ عموماً عرضیاں لےکر آتے ھیں ' اردلیوں نے بطخوں کے بچے پال رکھے ھیں ' جو اِدھر اُدھر بھاگے پھرتے ھوں ' اور پیروں تلے آ جاتے ھیں - گھر گرستی کرنا ھر شخص کے لئے قابل تعریف بات ھے تو اردلیوں کے لئے کیوں نہ ھو ' مگر بھئی ایسی جگہ پر تو زیادہ مناسب معلوم نہیں ھوتا ... ... ... "

منصف فوراً جواب دیتا ھے :—

" میں ان سب کو آج ھی باورچی خانے پکڑ بھجواتا ھوں ' آپ کا جی چاھے تو آج میرے یہاں کھانا کھائیے "

صدر میونسپلٹی چند اور بے قاعدگیوں کی طرف توجہ دلا کر کہتا ھے : —

" ... ... ... اسی طرح آپ کا اسپیسر ... ... یوں تو وہ آدمی خاصا ھوشیار ھے ' مگر اس کے منہ سے ایسی بو آتی ھے ' معلوم ھوتا ھے ' سیدھا کسی شراب کے کارخانے سے آ رھا ھے - یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ..... اگر یہ بدبو واقعی کوئی پیدائشی مرض ھے ' جیسا کہ وہ خود کہتا ھے ' تو اسے سمجھائیے ' پیاز یا لہسن یا کوئی اور دوا کھائیے ..... "

لیکن اس معاملے میں منصف کا بس نہیں چل سکتا : —

" نہیں ' اب یہ بدبو نہیں مٹ سکتی . وہ کہتا ھے بچپن میں اس

کی داڑھی کے چوٹ لگ گئی تھی، اور تب سے اس کے منہ سے کچھہ ووڈکا کی بو آنے لگی ہے۔"

اس ناکامی سے صدر میونسپلٹی کی اصلاحی کوششوں کا خاتمہ نہیں ہوجاتا۔ وہ تمام افسروں کو فلسفیانہ طرز پر ان کی خاص کم زوری سے آگاہ کرتا ہے:—

"..... عجیب بات ہے، ایسا کوئی آدمی ہی نہیں، جس کے سر کوئی گناہ نہ ہو، خدا ہی نے دنیا کو ایسا بنایا ہے ... ..."

منصف سمجھتا ہے کہ اس کی رشوت خوری کی طرف اشارہ ہے اور بگڑ کر کہتا ہے کہ گناہ گناہ میں فرق ہے، "میں سب سے کھلم کھلا کہتا ہوں، میں رشوت لیتا ہوں، مگر کیسی رشوت؟ شکاری کتے کے بچے۔ یہ کچھہ اور ہی چیز ہے۔"

پھر صدر میونسپلٹی ان حضرات کی طرف متوجہ ہوتا ہے، جن کے ماتحت اسکول اور اوقاف اور خیرات خانے ہیں۔

"... ... آپ کو استادوں کی طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہئے، وہ بڑے لائق لوگ ہیں اور مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کرچکے ہیں، مگر عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، جو ممکن ہے علم و فضل کے لازمی جزو ہوں مثلاً استادوں میں سے ایک جس کا چہرہ کچھہ پھولا سا ہے ... کبھی اپنی کرسی پر بیٹھہ ہی نہیں سکتا، بغیر اس طرح (منہ بنا کر) منہ بنائے ہوئے اور پھر حلق کے پاس ہاتھہ لے جاکر اپنی داڑھی کو انگلیوں سے باہر کی طرف پھینکتا ہے، اگر وہ صرف طالب علموں کا اس طرح منہ چڑھائے تو کوئی بات نہیں ... ... لیکن آپ خود غور کیجئے، اگر وہ کسی شخص کا جو اسکول کا معائنہ کرنے آیا ہو، اس طرح منہ چڑھائے۔ تو

اس کا نتیجہ بہت برا ہوسکتا ہے : ممکن ہے انسپکٹر جنرل یا کوئی اور اس بات کو اپنی رپورٹ میں درج کردے ۔ خدا جانے پھر اس کا کیا انجام ہو ... ... مجھے آپ کو استاد تاریخ کی طرف بھی توجہ دلانا ہے ... ... میں نے ایک مرتبہ ان کا لکچر سنا تھا ... ... جب انھوں نے اسکندر اعظم کا ذکر شروع کیا تو خدا جانے انہیں کیا ہو گیا ۔ انھوں نے اپنی جگہ سے جھپٹ کر ایک کرسی اُٹھائی اور پوری طاقت سے اسے زمین پر دے مارا ۔ میں نے مانا اسکندر اعظم بڑا بہادر تھا ، مگر آخر کرسیاں کیوں توڑی جائیں ؟ اس سے تو خزانے کا نقصان ہوتا ہے ... ... "

اس مجمع میں پوسٹ ماسٹر بھی شریک ہوجاتا ہے ، صدر میونسپلٹی الگ لے جاکر اس سے کہتا ہے کہ فی الحال تمام خط کھول کر دیکھ لیا کرے تاکہ ان لوگوں کے خلاف کوئی شکایت ناک کے ذریعہ سے دارالسلطنت نہ بھیجی جا سکے ۔ پوسٹ ماسٹر جواب دیتا ہے کہ اسے یہ باتیں سکھانے کی ضرورت نہیں ، اسے خود خط پڑھنے کا بہت شوق ہے ، اور اگر کوئی خط اسے خاص طور سے پسند آتا ہے تو وہ اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور بار بار پڑھا کرتا ہے ... ... یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ دو حضرات جن کا کام شہر بھر میں خبریں سننا اور سنانا ہے دوڑے ہوئے آتے ہیں ، اور خبر دیتے ہیں کہ انہیں فلاں ہوٹل میں ایک آدمی نظر آیا ہے ، جو دارالسلطنت سے آیا ہے ، اور انسپکٹر جنرل کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا ۔

صدر میونسپلٹی فوراً ہوٹل پہنچتا ہے ۔ نوجوان لفنگے کی پہلے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاملہ کیا ہے ۔ لیکن جب اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سارے بزرگ کس غلط فہمی میں ہیں تو انہیں اچھی طرح سے

لوٹتا ہے - آخر کار پوسٹ ماسٹر اس کا ایک خط کھول لیتا ہے' جو اس نے اپنے کسی دوست کو لکھا ہے اور جس میں شہر کے تمام مشاہیر کو خوب گالیاں دی ہیں اور پھبتیاں کسی ہیں - خط سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ان سب نے دھوکا کھایا ہے' مگر اس وقت تک چڑیا اُڑ جاتی ہے —

گوگول کا دوسرا ڈراما "شادی" بھی اسی طرح مضحک سیرتوں کا عجائب خانہ ہے - اس کا ہیرو پوڈکولیسن' ایک کھاتا پیتا آدمی ہے' جو شادی کرنا چاہتا ہے' مگر ایسا جھیپو ہے کہ خود کسی لڑکی سے دوستی کرکے اس سے شادی کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا' ایک مشاطہ اس کا ایک لڑکی سے نکاح کرانے کا وعدہ کرتی ہے' اور پوڈکولیسن کپڑے وغیرہ تیار کرانے لگتا ہے - اس کی کیفیت پہلے منظر میں ظاہر ہوجاتی ہے' جب وہ اپنے نوکر کو بار بار بلاکر اس سے جرح کرتا ہے :—

"درزی کے یہاں گیا تھا ؟"

"گیا تھا -"

"تو کیا ہوا. وہ فراک کوٹ سی رہا ہے ؟"

"سی رہا ہے ."

"بہت سا سی چکا ہے ؟"

"ہاں کافی سی لیا ہے' کاج بنانے شروع کردئے ہیں ."

"کیا ؟"

میں نے کہا: اس نے کاج بنانے شروع کردئے ہیں ."

"اور اس نے کہیں یہ تو نہیں پوچھا کہ صاحب کو بھلا فراک کس لئے چاہئے ؟"

"نہیں' نہیں پوچھا ."

"ممکن ہے اس نے کہا ہو: صاحب شادی تو نہیں کرنا چاہتے ؟"

" نہیں کچھہ نہیں کہا - " .....

" ... ہاں ' مگر کیا اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ صاحب اتنی باریک باتوں کا کوٹ کیوں سلوا رہے ہیں ؟ "

" نہیں . "

" اس کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا کہ شاید صاحب شادی کرنا چاہتے ہوں ؟ "

" نہیں ' اس کے متعلق کچھہ باتیں نہیں ہوئیں " .....

پود کولیسن کو اس کا خوف ہے کہ ایسا نہ ہو اس کی شادی کی خبر تمام شہر میں مشہور ہو جائے اور لوگ اسے چھیڑیں اور اس کا مذاق اُڑانے لگیں - نوکر ایک بار چلا جاتا ہے تو کچھہ سوچنے کے بعد وہ پھر اس کو آواز دیتا ہے .

" پولش خرید لایا ؟ "

" خرید لایا " .....

تجھے پالش دیتے وقت دکان والے نے یہ تو نہیں پوچھا تھا کہ بھلا صاحب کو اس پالش کی کیوں ضرورت پڑی ؟ "

" نہیں "

" ممکن ہے اس نے کہا ہو : کہیں صاحب شادی کرنے کی فکر میں تو نہیں ہیں ؟ "

" نہیں ' اس نے کچھہ نہیں کہا تھا . "

یہ گھبراہٹ ' خوف اور اندیشوں کا یہ عالم دیکھتے ہوئے بھلا کب ممکن تھا کہ پود کولیسن دولھا بننے کی ہمت کرسکتا ' اتفاق سے اس کے ایک دوست کوچ گرٹ نے اس کی شادی کرادینے کا بیڑا اٹھا لیا ' پودکولیسن کے علاوہ اور امید واروں کو جنھیں مشاطہ نے پھانسا تھا کوچ گرٹ نے بھگاکر

اور ترا کر بھگا دیا اور پود کولیسن کے لئے میدان صاف کردیا' لیکن عین اس وقت جب دلہن گرجا میں جانے کے لئے تیار ہوئی' پود کولیسن ہمت ہار گیا' اور چونکہ گوچ گرت نے اس خیال سے کہ کہیں وہ فرار نہ ہوجائے دروازے پر پہرہ کھڑا کردیا تھا' پود کولیسن کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔

" انسپکٹر جنرل " کا اصلاحی مقصد نہیں پورا ہوا۔ زار نکولائی نے خود اسے پڑھا بہت پسند کیا' اسے اسٹیج پر دکھلانے کا حکم دیا' اور پہلے تماشے میں جا کر ہنسنے اور داد دینے میں پیش قدمی کی۔ لیکن سرکاری عہدہ داروں نے اس کی مخالفت میں ایک طوفان برپا کردیا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اسٹیج پر دکھانے کی قطعی ممانعت ہو گئی۔ مگر گوگول کی طبیعت میں اس ڈراما لکھنے کے ساتھہ قومی اصلاح کا ولولہ اٹھا اور اس کا نقطۂ نظر بھی کسی قدر بدل گیا۔ اس کی باریک بینی ویسی ہی رہی' ظرافت اتنی ہی' مگر واقعات کو وہ مصلح کی نگاہوں سے دیکھنے لگا' اور جو درد روسی زندگی کا نظارہ اس کے دل میں پیدا کرتا تھا وہ اس امنگ میں منتقل ہو گیا کہ روسیوں کو حقیقت حال سے آگاہ کیا جائے' اور روسی زندگی کی عبرت انگیز تصویریں دکھا کر لوگوں کے دل بہتر زندگی کی آرزوؤں سے معمور کردئے جائیں۔ " انسپکٹر جنرل " کی تصنیف کے بہت جلد بعد اس نے ایک ناول لکھنا شروع کردیا جس کا عنوان " مردہ روحیں " تھا۔

" مردہ روحوں " میں مصوری بہت بڑے پیمانے پر کی گئی ہے' گوگول کا ارادہ تھا کہ روسی زندگی کی ایک جامع تصویر کھینچے' اور اسی غرض سے اس نے ایک ایسا لوچدار پلاٹ منتخب کیا جو اس پر قصے کے تسلسل کی کوئی ذمہ داری یا پابندی نہیں ڈالتا۔ ناول کا ہیرو چچکوف' ایک نہایت درجہ چالاک' خود غرض اور عیار آدمی ہے جو دربار سرکاری

ملازمت سے غبن اور رشوت خوری کی بنا پر نکالا جا چکا ہے ۰ و ۲ روپیہ کمانے کی ایک اور تدبیر سوچ کر مرد ۲ روحیں خریدنے نکلتا ہے - اس زمانے میں تمام روسی کاشتکار زمینداروں کی ملکیت تھے اور دوسری چیزوں کی طرح بیچ اور خریدے جاسکتے تھے - زمینداروں پر لگان ان نفوس "روحوں" کے حساب سے لگایا جاتا تھا جو اس کی ملکیت میں تھیں ' لیکن چونکہ مردم شماری ہر دسویں سال ہوا کرتی تھی ' اس لئے زمینداروں کو ان کاشتکاروں کا لگان بھی دینا ہوتا تھا جو درمیان میں مرجاتے تھے ' چچکوف کی تدبیر یہ تھی کہ ایسی مردہ "روحیں" زمینداروں سے سستے داموں خریدے فرضی قیمتیں لگا کر ان کا ایک باقاعدہ بیع نامہ لکھوائے - جیسا کہ زندہ روحوں کی خرید فروخت کے وقت لکھوایا جاتا تھا ' اور تب انہیں کسی بڑے بنک میں جاکر ایک معقول رقم کے عوض رہن رکھا جاوے ' روحیں خریدنے کے لئے وہ ایک گاڑی پر بیٹھ کر سفر کو نکلتا ہے ' اور گوگول بھی ہمیں اس کے ساتھ ساتھ سیر کراتا ہے ' اور ان زمینداروں میں جن کے پاس چچکوف بیوپار کرنے جاتا ہے ' ہمیں روسی سیرت مختلف شکلوں میں دکھلائی جاتی ہے - منی لوت ایک جوان زمیندار ہے ' جس میں کوئی خصوصیت نہیں ' کسی قسم کا شوق نہیں ' جو کبھی سوچتا ہے کہ اپنے گھر سے تالاب تک ایک زمین دوز راستہ بنائے ' کبھی اسے تالاب پر ایک ایسا پل بنانے کی سوجھتی ہے جس کے دونوں طرف مٹھائی کی دوکانیں ہوں ' مگر وہ کرتا کراتا کچھ نہیں اس کے گول کمرے میں کئی کوچ ہیں جن پر کپڑا چڑھانا باقی رہ گیا ہے ' وہ اپنے تمام مہمانوں سے کہتا ہے کہ ابھی پر نہ بیٹھیں ' وہ ابھی تیار نہیں ہیں ' لیکن کئی سال گذر گئے اور وہ کوچ اسی حالت میں پڑے ہیں - اس کی جائداد کا انتظام بہت خراب ہے ' اسے

کھانا تک ٹھیک طرح سے نہیں ملتا مگر وہ خوش ہے اور کسی چیز کی فکر نہیں کرتا - اس کے برعکس سویا کئے وچ ایک نہایت کنجوس ' اکھڑ آدمی ہے ' جو اپنی جائداد کا انتظام بہت اچھا کرتا ہے اور روپیے کے لالچ میں ہر طرح کی بے ایمانی کرنے پر خوشی سے راضی ہوجاتا ہے ' اگر اسے یہ یقین ہوجائے کہ اس میں فائدہ ہوگا - کھانے میں اور دوسروں کو گالیاں دینے میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا - نور فرلویف اسی قسم کا مگر کسی قدر مختلف آدمی ہے ' بے ایمان ' جھوٹا ' فسادی ' آوارہ ' جو ملنے جلنے میں بڑا بے تکلف ہے - مگر جیسا کہ چچکوف کو ذاتی تجربہ سے معلوم ہوجاتا ہے اپنی جان پہچان کے لوگوں کو پٹوانے اور ذلیل کرنے پر بھی بہت جلد آمادہ ہوجاتا ہے - جب شہرن میں چچکوف اپنا کام ختم کرچکتا ہے ' بیع نامے لکھ کر کچہری میں داخل کردئے جاتے ہیں ' اور رخصت ہونے سے پہلے وہ دوستوں کے یہاں دعوتیں کھانے میں مصروف ہوتا ہے تو یہی نوزدریوف سب سے کہہ دیتا ہے کہ چچکوف نے مردہ روحیں خریدی ہیں ' اور ناول کے ہیرو کا سارا کام بگڑ جاتا ہے ' وہ اس ناکامیابی سے مایوس نہیں ہوجاتا بلکہ ملک کے دوسرے حصے میں جاکر اسی طرح مردہ روحوں کا بیوپار شروع کردیتا ہے ' اسی سلسلے میں وہ جعلی وصیت نامہ بناکر ایک رئیس عورت کی جائداد کا بڑا حصہ ورثے میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ' مگر اس کا جعل پکڑا جاتا ہے ' اور وہ بمشکل قید خانے سے اپنی جان بچاتا ہے —

جو ہنسنا چاہے اسے "مردہ روحوں" میں اس کے بہت سے موقع ملیں گے ' گو گول کی نظر انسانی زندگی کا پہلو دیکھنے میں کبھی نہیں چوکتی - شہرن کے سرکاری وکیل کی بائیں آنکھ اس طرح جھپکتی تھی گویا وہ کہنا چاہتا ہے "بیٹا ذرا دوسرے کمرے میں جو چلو تو تم کو بتائے

کی بات سناؤں'' لیکن وہ نہایت سنجیدہ اور خاموش پسند آدمی تھا' چیکوف سے اس کی خاصی دوستی ہوگئی' اور جب اس نے آخر میں افواہ سنی کہ چیکوف کوئی سزا یافتہ مجرم ہے' اور جعلی نوٹ بناتا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا - اتفاق سے اسی زمانے میں فالج گرنے سے یا قلب کی حرکت بند ہونے سے وہ اچانک مرگیا - 'لوگوں نے ڈاکٹر کو فصد کھولنے کے لئے بلوایا' لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ سرکاری وکیل کے جسم سے روح نکل چکی ہے تب انہیں ..... احساس ہوا وہ واقعی روح رکھتا تھا' اگرچہ اس کی انکسار نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا'' ..... ایک زمیندار سے جو لمبان چوڑان میں یکساں ہے اور کھاتے کھاتے پھول گیا ہے' ایک ہمسایہ شکایت کرتا ہے کہ اسے زندگی میں کوئی لطف نہیں آتا ہے' اور اس کا جی گھبرایا کرتا ہے - ''تمہارا جی کیوں گھبراتا ہے'' ؟ وہ بزرگ حیرت سے پوچھتے ہیں۔'' تم کھاتے کافی نہیں ہو' اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں - لیکن ایسے '' چٹکلے '' مردہ روحوں '' کی مایوس کن اور ہمت شکن فضا پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے ' گو گول ہنستا اور ہنسا تا ہے ' مگر یہ بھی ایک مجبوری سی ہے ' '' مردہ روحوں '' میں ایک جنرل ہیں جنہیں چیکوف کا ایک لطیفہ بہت پسند آتا ہے اور جب ان کی لڑکی اعتراض کرتی ہے کہ انہیں ہنسنے کے بجائے افسوس کرنا چاہئے تو وہ کہتے ہیں :- بیٹی میں کروں گیا ..... یہ بات ہی کچھ ایسی مضحک ہے : '' گو گول کا بھی یہی انداز ہے ' لیکن ظرافت سے وہ کبھی اپنے یا اپنے پڑھنے والوں کے دل پر غم کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا - '' مردہ روحوں '' میں ایک بزرگ فرماتے ہیں : '' مجھے اکثر خیال ہوتا ہے کہ روسی کو بالکل گیا گذرا سمجھنا چاہئے ' اس کے ارادے میں قوت نہیں' اس میں اتنی ہمت نہیں کہ استقلال سے کام کرے - وہ کچھ کرنا چاہتا ہے '

مگر کچھہ کر نہیں پاتا - وہ ہر دن سوچتا ہے کہ کل سے ایک نئی زندگی شروع کروں گا ' جس قدر محنت کرنی چاہئے وہ کرونگا ' کھانے میں پرہیز کروں گا ' مگر ہوتا ہواتا کچھہ نہیں - اسی رات کو وہ ضرورت سے زیادہ کھاجاتا ہے بے وقوفوں کی طرح آنکھیں مچمچاتا ہے اور منہ سے ایک حرف بھی نہیں نکال سکتا - ہاں ' واقعی : ہمیشہ یوں ہی ہوا کرتا ہے ' گوگول نے جب " مردہ روحوں " کے پہلے دو چار باب لکھے تو شاعر پشکن زندہ تھا ' اور گوگول نے اسے یہ پڑہ کر سنائے - پشکن گھبرا کر چلا اٹھا ' یا خدا ہمارا روس بھی کیا عجیب ویرانہ ہے " ۱۸۴۲ ع میں " مردہ روحوں " کی پہلی جلد شائع ہوئی اور اس کے پڑھنے سے اور سب پر بھی ایسا ہی اثر ہوا - لیکن گوگول کی حقیقت بھنی تسلیم کرتے ہوئے نقادوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ جس معاشرے میں صرف ایسے ہی لوگ ہوں جیسے گوگول نے اپنی ناول میں دکھائے ہیں اس کا صفحہ ہستی پر قائم رہنا ناممکن ہے - گوگول نے بھی یہ محسوس کیا ' اور اپنے نقادوں کو یقین دلایا کہ ناول ابھی ختم نہیں ہوا ہے ' اس کا پہلا حصہ روسی زندگی کا صرف ایک رخ دکھاتا ہے اور آگے چل کر وہ ناول کے پھیلاؤ میں نجات کی بھی کوئی صورت دکھائے گا ' لیکن نجات کی اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی - " مردہ روحوں " کا دوسرا حصہ تین بار لکھہ کر جلادیا ' اور جس شکل میں اس کی آخر کار چھپنے کی نوبت آئی وہ نہایت نامکمل تھا ' اور اس میں نجات کا راستہ سمجھانے کا وعدہ بھی ذرا بے تکے طریقے سے پورا کیا گیا تھا - مگر " مردہ روحوں " کے دوسرے حصے کو دیکھہ کر گوگول پر حرف گیری کرنا انصاف کے خلاف ہے . یہ حصہ گوگول کے مرنے کے بعد شائع ہوا ' اور مرنے سے کئی سال قبل ۱۸۴۷ ع میں گوگول نے " احباب کے نام خطوط " کے عنوان سے

ایک کتاب لکھی تھی ' جس میں اس نے اعلان کیا تھا کہ اس نے ناول نویسی ترک کردی ہے .

قومی نجات کا مسئلہ ہر اصل نہایت اہم تھا ' اور اگر گوگول نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے طے کرنا ناول نویس کے امکان سے باہر ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی . " احباب کے نام خطوط " ایک قسم کے مذہبی وعظوں کا مجموعہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوگول نے اپنی عاجزی اور بے کسی محسوس کرکے مذہب کے آغوش میں پناہ لی تھی . اس کے معاصرین کو اس تصنیف سے کسی قسم کا اطمینان نہیں ہوا ' کیونکہ وہ مذہبی جذبے اور مذہب کی پیروی میں فرق کرتے تھے . گوگول کے وعظوں سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ زار اور روسی کلیسا کے سامنے سر تسلیم خم کرانے کی تعلیم دینا چاہتا ہے ' اور یہ بھول گئے کہ وہ کیسے زار اور کیسے کلیسا کے خواب دیکھ رہا تھا ' جہاں تک روسی فطرت کی تعبیر کا تعلق ہے ' گوگول کے وعظ بھی اسی قدر پر حقیقت تھے ' جتنے اس کے ناول اور دستئفکی اور ٹالسٹائی کی تصانیف نے اسے ایک حد تک ثابت بھی کردیا . بہر حال یہ صحیح ہو یا نہ ہو کہ روسی فطرت کو صرف مذہبیت کا جذبہ نجات دلا سکتا ہے ' گوگول کا انجام صاف طور سے ظاہر کردیتا ہے کہ روسی ناول نویسوں کے لئے ناول محض قصے کہانی نہیں تھے - ان کی نظروں میں ناول وہی حیثیت رکھتا تھا جو قدیم یونانی معیار کے مطابق فلسفے کی تھی ' اس کا مقصد صرف جی بہلانا یا عبرت دلانا نہیں تھا - اس کا موضوع انسانی زندگی کی ہر شکل اور کیفیت تھی ' وہ ایک آئینہ تھا جس میں صرف موجودہ حالات کا عکس

نہیں تھا ' بلکہ اس زندگی کا ایک دھندلا سا پرتو جسے انسان اپنے تمام قویٰ کی نشو و نما کے بعد اپنی جولانگاہ بنا سکتا ہے - گوگول پہلا ناول نویس تھا جس نے ناول کے کل امکانات سمجھے اور ناول نویسی کے پورے فرائض محسوس کئے ' اور باوجود اپنے فلسفیانہ مقاصد کی ناکامی کے وہ دنیا کے ناول نویسوں میں بہت بڑا درجہ رکھتا ہے .

# خطبات گارساں دتاسی

## تیرھواں خطبہ

۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ ع

از

( ترجمہ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی - لٹ

( پیرس ) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن )

حضرات !

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس سال کے خطبے میں بھی میں آپ کے روبرو یہ اعلان بلا تکلف کر سکتا ہوں کہ ہندوستانی ادب دن بدن ترقی پر ہے - میں اپنے اس دعوے کی تائید میں اس سرکاری رپورٹ کو پیش کرتا ہوں جو اس سال ماہ مئی میں شائع ہوئی ہے - اس رپورٹ میں ان زبانوں کے متعلق معلومات ملتی ہیں جن کا سیکھنا سول سروس کے نوجوان ملازموں کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے - خاص کرکے ان کے واسطے جو صوبۂ شمال مغربی ' اودھ یا پنجاب میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں - سول سروس کے امتحان کی ایک کونسل ہے - اس کونسل کے صدر وزیر مالیات سر چارلس ٹریولین ہیں - اور دوسرے ارکان میں آر - ایم بلر جی اور مولوی عبداللطیف کے نام قابل ذکر ہیں - اس کونسل نے وزیر ہند سرچارلس وڈ

کے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ سول سروس کے امید واروں کا ہندوستان کی صرف دو زبانوں یعنی اردو اور ہندی میں امتحان لینا چاہئیے۔ ان دو زبانوں کے جاننے سے سول سروس کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ اب تک یہ قاعدہ تھا کہ صوبہ شمال مغربی، اودہ اور پنجاب میں جانے والے امید واروں کی ہندی اور فارسی میں جانچ ہوتی تھی اور بنگال جانے والے امید واروں کا اردو اور بنگالی میں امتحان لیا جاتا تھا —

سر چارلس ٹریولین نے انڈیا آفس میں سرکاری ملازموں کے متعلق جو یہ تجویز کی ہے اس سے علوم مشرقیہ کو بہت نفع پہنچے گا۔ موصوف ان سب لوگوں میں ہر دلعزیز ہیں جو ہندوستان سے محبت رکھتے ہیں۔ موصوف کی تجویز کے موافق سول سروس کے ابتدائی امتحان میں ۱۸ سے لے کر ۲۱ سال کی عمر والے شریک ہو سکتے ہیں۔ کامیابی کے بعد انھیں آکسفورڈ یا کیمبرج بھیجا جاتا ہے تا کہ وہ دو سال اس علاقے کی زبان کی تحصیل کریں جہاں ان کا تقرر کیا جائیگا۔ اس علاقے کی زبان کے ساتھ جہاں ان کا تقرر ہو گا ہندوستانی لازمی طور پر سب کو سیکھنی ہوتی ہے۔ چنانچہ آکسفورڈ اور کیمبرج دونوں یونیورسٹیوں میں ہندوستانی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ آکسفورڈ میں کیپٹن جے چیمبرس اور کیمبرج میں میجر جے۔ جی سٹیفن ہندوستانی پڑھاتے ہیں —

فوجی خدمت کرنے والوں کے لئے ایشیائی زبانوں کے سیکھنے کے متعلق قواعد زیادہ سخت نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فوجی خدمت سے کوئی اپنے تئیں سول میں یا سیاسیات میں منتقل کرالے۔ لیکن صیغۂ سیاسیات کی خدمت اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ ہندوستانی کے سخت امتحان میں کامیابی نہ حاصل کر لی جائے۔ باوجود اس کے کہ فوج میں

بھرتی ہونے سے قبل ہندوستانی زبان کا امتحان ہر امید وار کو دینا ہوتا ہے لیکن اگر وہ فوج سے سیاسیات میں منتقل ہو تو اس وقت پھر اس کا امتحان ہوتا ہے - زبان کے علاوہ امید وار سے ہندوستان کے قوانین ' تاریخ اور با لخصوص ان عہد ناموں کے متعلق سوالات پوچھے جاتے ہیں جو دیسی رئیسوں کے ساتھہ برطانیہ نے کئے ہیں - وہ افسر جو اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں - انھیں سرکاری طور پر ایک سو اسی روپے دئے جاتے ہیں تا کہ وہ کسی سنشی سے خاص طور پر بعد میں سبق لے سکیں * —

سر چارلس ٹریولین نے ہندوستانی زبان کے لئے انعام مقرر کیا ہے - اس سے بھی ہندوستانی کی اہمیت میں اضافہ ہو گا - یہ انعام پانچ سو روپے کا ہے - یہ انعام اس امید وار کو ملے گا جو اردو زبان میں حسب ذیل موضوع پر بہترین مضمون لکھے —

" یونانی علوم کا بغداد کے عباسی اور قرطبہ کے اموی خلفاء کے زمانہ میں اثر - اس کے ساتھہ وہ اثر بھی بتلایا جائے جو عربوں نے قرون مظلمہ کے بعد یورپ کے نشاۃ ثانیہ پر ڈالا ہے - ان باہمی اثرات سے بطور نتیجہ یہ ثابت کیا جائے کہ اب اس وقت پختہ کار اہل یورپ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے میل جول سے کیا حالات مترتب ہوں گے —

مضمون یکم اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ ع کمیشن کے پتہ پر کلکتہ بھیج دینا چاہئے جو خاص طور پر اس مضمون کی جانچ کے لئے نامزد کیا گیا ہے - اس کمیشن میں " ایڈورڈ بی کارل " کے علاوہ دو ہندو عالم بھی شامل ہیں -

اس ضمن میں میں " سر چارلس وڈ " کے قول کا نقل کرنا مناسب خیال

---

* Allen's Indian Mail, Nov. 1863

کرتا ہوں - سرچارلس ٹریولین بھی ان کے ہم خیال ہیں اور میں بھی متعدد مرتبہ انھیں خیالات کا خود اعادہ کر چکا ہوں - لیکن 'سرچارلس وڈ' نے انھیں خیالات کو نہایت خوبی اور واقفکاری کے ساتھہ پیش کیا ہے - وہ کہتے ہیں —

پٹنہ سے لے کر پیشاور تک سارے شمالی ہند کی زبان ہندوستانی ہے - شہروں میں، قصبات میں، گاؤں میں، سول اور فوجی مرکزوں میں، درباروں میں اور سرکاری دفتروں میں ہر کہیں یہ سمجھی جاتی ہے - ہر تعلیم یافتہ شخص اور ادنی سے لے کر اعلی تک سب ہی اسے استعمال کرتے ہیں - جس طرح اطالوی زبان کی اہمیت 'اٹلی' میں ہے یا انگریزی کی انگلستان میں ہے بس وہی حیثیت ہندوستانی کی شمالی ہند کے وسیع علاقوں میں ہے" —

پھر وہ کہتے ہیں —

"ہندی سے در اصل مراد وہ دہقانی بولیاں ہیں جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہیں - سول سروس کے نوجوانوں کو جو ہندی سکھائی جاتی ہے وہ برج کی بھاشا ہے - یہ وہ بولی ہے جو 'متھرا' اور 'برندابن' کے آس پاس بولی جاتی ہے - ہندی کا پنجابی سے بس اسی قسم کا تعلق ہے جو Somersetshire کی بولی Northumberland کی بولی سے ہے - ان ہندی بولیوں کا اردو (ہندوستانی) سے وہی تعلق ہے جو اصلی انگریزی زبان کا مذکورہ صدر بولیوں سے ہے - ہر کہیں آپ دیکھیں گے کہ گاؤں والے بلا تکلف ہندوستانی میں بات چیت کرتے ہیں - اگر کسی کو ہندوستانی زبان پر پوری قدرت حاصل ہو تو وہ بہت جلد آسانی کے ساتھہ

ہندوستان کی ہر مقامی بولی کو سیکھہ سکتا ہے * —

مسٹر " منٹگمری مارٹن " نے اپنی کتاب " مشرقی ہند " میں اور بھی واضح طور پر یہ بات ثابت کی ہے کہ صوبہ شمال مغربی کی زبان سوائے ہندوستانی کے اور کوئی نہیں ہوسکتی دہلی ' آگرہ ' الہ آباد ' لاہور اور اودہ کے ملحقہ علاقوں میں یہی زبان استعمال کی جاتی ہے - ہندی بہار اور صوبہ متوسط کی زبان ہے ' لیکن ہندوستانی اردو یا دکھنی ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں سمجھی جاتی ہے —

اس سے آپ حضرات پر یہ روشن ہوگیا ہوگا ' جس کی نسبت میں بار بار آپ کی توجہ مبذول کرا چکا ہوں ' کہ ہندوستانی زبان ہندوستان میں عام طور پر مروج ہے - گزشتہ سال آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں " کلکتہ " کے اس جلسہ کی مثال پیش کی تھی جس میں " سر جان پی گرانٹ " کو الوداع کہتے وقت اظہار خلوص و ہمدردی کے لئے متعدد ہندو مقررین نے ہندوستانی زبان میں تقریریں کیں نہ کہ بنگالی میں جو صوبہ بنگال کی زبان ہے - اسی طرح کلکتہ کے ایک اور جلسہ میں جو اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں سے اظہار ہمدردی کی جائے - مختلف

---

* سر چارلس فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی نہ تو دفتری زبان ہی باقی رہی اور نہ لوگ اس میں گفتگو کرتے ہیں اور اب دن بدن اس زبان کے تحصیل کرنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے - موصوف نے یہ بات اس واسطے بیان کی ہے تا کہ وہ اپنے ان ساتھیوں کو قائل کریں جو فارسی زبان کو صوبہ شمالی مغربی کے مدارس میں لازمی قرار دینے کے حق میں ہیں —

مقررین نے ہندوستانی میں تقریریں کیں - فرینڈ آف انڈیا ( Friend of India ) میں اس کا ذکر ہے کہ راجہ نراین سنگھہ نے اس جلسہ میں تجاویز کی تائید اردو زبان میں کی - موصوف نے اپنی تقریر میں انگلستان کی اس فیاضی کا ذکر کیا جو ہندوستان میں قحط کے موقعہ پر ظاہر ہوچکی ہے - موصوف نے فرمایا کہ اب ہماری باری ہے کہ ہم اپنے محسنوں کی اعانت کے لئے اٹھیں جنھوں نے اپنی فیاضی سے مصائب و خطرات سے نجات دلائی - اگر اس وقت ہم کچھہ کریں تو یہ کوئی بڑا احسان نہ ہوگا بلکہ ہمارا ایسا کرنا اس قرض کی ادائی ہوگی جو ہم پر واجب ہے - ہمارے اور انگلستان کے تعلق میں اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جو ہم پر اس قوم نے کیا ہے - اس کے علاوہ یہ ایک مسلم بات ہے کہ ضرورت مدد کی ضرورت رفع کرنا اور اس کی اعانت کرنا ہر صاحب مقدور کا فرض ہے —

اس جلسہ میں ہندو ' مسلمان ' عیسائی سب نے شرکت کی اور ہر شخص جذبۂ خدمت سے متاثر تھا - بقول شاعر پوپ —

" مذہب و نجات کے معاملے میں ہر کوئی اختلاف رکھتا ہے لیکن صورت ہمدردی ہی ایسی چیز ہے جو ساری دنیا کو متحد کر دیتی ہے "—

شہزادہ " ویلز " کی شادی کے موقعہ پر ہندوستان میں ہر جگہ جلسے منعقد ہوئے اور ان میں ہندوستانی زبان میں تقریریں کی گئیں - ۱۸ مئی کو کلکتہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں منشی " امیر علی " نے اردو میں نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی - مقامی اخباروں میں اس تقریر کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے - اس جلسہ میں شہزادہ اور ان کی بیوی کے لئے ایک تحفہ پیش کرنے کی تجویز منظور ہوئی —

اس بات کا ایک مزید ثبوت کہ ہندوستانی ہندوستان کی مروجہ زبان ہے - ہمیں اس سے ملتا ہے کہ گورنمنٹ انگریزی نے ہندوستان میں یہ قاعدہ بنا دیا ہے کہ اگر کسی رجمنٹ میں ترجمان ( Interpret ) کی ضرورت ہو تو اس افسر کو یہ خدمت دی جاسکتی جس نے صرف ہندوستانی زبان میں امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے - لیکن یہ ایسی صورت میں ہوگا جب کہ اور کوئی بہتر شخص نہ ملے جو ہندوستان کی سب زبانیں جانتا ہو - تا ہم اس سے آپ کو ہندوستانی زبان کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے —

ہندوستان کے سکوں پر ان کی قیمت لکھنے کا جب مسئلہ در پیش تھا تو یہ فیصلہ ہوا کہ ہندی اور اردو حروف میں اسے لکھنا چاہئے - یہ سکے ہندوستان کے سب صوبوں میں استعمال کئے جاتے ہیں —

ہندوستانی صرف ہندوستان ہی میں نہیں بولی جاتی ہے - مشرق قریب کے بندرگاہوں اور افریقہ کے ساحل پر لوگ اس زبان کو استعمال کرتے ہیں - مسٹر شیفر نے ' جو شاہ المانیہ کے خاص انٹرپرٹ ( ترجمان ) ( Interpret ) تھے اس زبان کو عدن میں سنا اور مسٹر ژول اپیر نے جو ہمارے انسٹیٹیوٹ کے معزز رکن ہیں اس زبان کو " بصرہ " میں بولتے سنا - میں نے ابھی حال میں تجارتی سامان کی رسید دیکھی جو بندرگاہ " لامو " پر زنجبار کے قریب جہاز پر لادا گیا تھا اور " عدن " بھیجا گیا - یہ رسید ناگری رسم خط میں تھی جو عام طور پر بنئے لوگ اپنی خط و کتابت میں استعمال کرتے ہیں - میں نے حال ہی میں " رنگون ٹائمز " میں ایک انگریزی مشن کا ذکر پڑھا جو " آوا " " کرنیل فیر " کے زیر سر کردگی گیا تھا - یہ مشن تجارتی معاہدے کی غرض سے بھیجا گیا تھا - چنانچہ راجہ کے لڑکے نے

اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار ہندوستانی زبان میں کیا اس واسطے کہ اسے انگریزی نہیں آتی تھی * —

سول سروس کے امتحان کے لئے حسب ذیل ہندوستانی کی کتابیں نصاب میں رکھی گئی ہیں : انتخابات باغ و بہار ؛ اخوان الصفا ؛ سیرالمتاخرین آخرالذکر کتاب میں عہد مغل کے زوال اور انگریزی حکومت کی ابتدا کا حال ہے ۔ اس کتاب کا مصنف ایک مشہور مسلمان ہے جو ذاتی طور پر کلایو ، وارن ہیسٹنگز اور دوسرے انگریزی اعیان حکومت سے واقف تھا ۔ اس کتاب کی زبان نہایت سلیس ہے —

ہندی کے نصاب میں حسب ذیل کتابیں رکھی گئی ہیں : انتخاب پریم ساگر ، سنگھاسن بتیسی ، اور شاید راجنتی اور کالی داس کی رامائن رکھی گئی ہے ۔ میں نے یہ معلومات مولوی عبداللطیف سے حاصل کی ہیں ۔

ان کتابوں کے علاوہ خطوط ، سرکاری دستاویزیں ، عرضداشتیں ، احکام اور تعزیرات ہند کے اقتباسات بھی سول سروس کے امید واروں کو پڑھنے ہوتے ہیں ۔

سنہ ۱۸۶۲ ع میں ہندوستان میں دیسی مطابع نے مختلف قسم کی چھ سو کتابیں طبع کیں اور بارہ نئے رسائل و اخبارات جاری ہوئے † ہندوستانی مطابع کی اہمیت دن بدن بڑھتی جارہی ہے ۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حکومت بنگال نے کلکتہ میں ایک سرکاری رپورٹ کنندہ مقرر کیا ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت کو عوام الناس کے خیالات سے ہفتہ وار اطلاع دے تاکہ حکام کو اپنی رعایا کی خواہشات اور ان کی

---

* انڈین میل جون سنہ ۱۸۶۳ ع

† سرکاری رپورٹ کے مطابق سنہ ۱۸۵۸ ع میں صرف صوبۂ شمال مغربی میں اردو ہندی کے ملاکر ۲۲ اخبارات تھے ۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو ہفتہ وار شائع ہوتے تھے ۔

ضروروتوں کا علم ہوتا رہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ رپورٹ کنندہ کی حیثیت 'سنسر' کی ہے۔ اس کے ساتھ ایک پنڈت اور ایک مولوی کام کرتا ہے —

کلکتہ سے لے کر پیشاور تک آپ شمالی ہند کے کسی بڑے شہر میں جائیے ہر جگہ لیتھو گرافی پریس دکھائی دیں گے۔ مجھے اس کی اطلاع ملی ہے کہ سنہ ۱۸۵۹ م میں صرف شہر کلکتہ میں بیس مطبع تھے * —

گذشتہ سال میں نے پنجاب کے دو اخبارات کا ذکر کیا تھا۔ اس وقت میرے پاس ان کے نمونے پہنچ گئے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا یہ دو اخبار "سرکاری اخبار" اور "محب رعایا" ہیں۔ اول الذکر کا جس جگہ نام لکھا جاتا ہے اس کے اوپر برطانیہ عظمیٰ کے آلات حرب کا طغرہ بطور سپاہ موجود ہے۔ یہ اخبار لاہور میں سرکاری لیتھو پریس میں چھپتا ہے۔ یہ رسالے کے طور پر چھوٹی تقطیع میں طبع ہوتا ہے۔ ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں۔ پنڈت اودھیا پرشاد اس کے اڈیٹر ہیں جو متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ یہ مہینہ کی پہلی کو نکلتا ہے۔ اس بات کو بھی خاص طور پر لکھا جاتا ہے کہ اس رسالے کے کاتب کا نام محمد علی خطاط ہے۔ پہلی اکتوبر کے نمبر میں اور دوسری چیزوں کے علاوہ 'راولپنڈی' کے نارمل اسکول کے نتائج امتحان سہ ماہی ۱۸۶۲ ع درج ہیں۔ پہلی نومبر کی اشاعت میں ملتان کے اسکول کے افتتاح کا حال لکھا ہے۔ یہ رسم ۲۴ اکتوبر کو منائی گئی تھی۔ اس کے تتمے کے طور پر ایک اور اخبار شائع ہوتا ہے جس کا نام ہے "تتمہ سرکاری اخبار" ہے۔ اس صوبہ

---

* اس کی فہرست "Selections from the Records of Bengal Govt." میں ملے گی۔ نمبر ۲۳ —

پنجاب کا پولیس گزٹ سمجھنا چاہئے —

' محب رعایا ' مہینے میں دوبار نکلتا ہے - مجھے اس اخبار کا ایک نمبر ملا ہے جو ۲۸ فروری سنہ حال کا ہے - یہ بھی چھوٹی تقطیع میں دو کالم پر چھپتا ہے - یہ لیتھو میں نہیں نکلتا بلکہ ٹائپ میں - جہاں تک کہ اخبارات کا تعلق ہے ایسی مثال ہندوستان میں اور نہیں ملے گی - ٹائپ میں نسخ رسم خط استعمال ہوتا ہے - ہندوستان میں نسخ کا مطلق رواج نہیں نستعلیق عام طور پر مروج ہے - اس اخبار کے سر ورق پر ایک شعر ہوتا ہے * اس اخبار کے مدیر کا نام جواہر لال ہے - انکا نام شاید آپ پہلے بھی سن چکے ہیں - یہ اخبار مطبع صدرالعلم میں بمقام اٹاوہ طبع ہوتا ہے —

ہندوستانی کے جو جدید اخبار نکلنا شروع ہوئے ہیں ان میں سے میں آپ کی توجہ " خیر خواہ خلق " کی جانب مبذول کراتا ہوں - یہ اس اخبار سے علحدہ ہے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں یعنی " خیر خواہ خلائق " اور جو اجمیر سے نکلتا ہے - " خیر خواہ خلق " مہینہ میں دو مرتبہ آگرہ میں سکندرہ کے چھاپے خانہ سے شائع ہوتا ہے یہ چھوٹی تقطیع میں صرف ایک ورق پر دو کالم میں چھپتا ہے - یہ در اصل بلکل مذہبی قسم کا اخبار ہے - اس کا مقصد دین مسیح کی نشر و اشاعت ہے - اس کے سر ورق پر یہ الفاظ لکھے رہتے ہیں —

" خدا کا خوف دانائی کی ابتدا ہے اور مذہبی آدمی کے نزدیک علم اور احتیاط ہم معنی ہیں - " سیاسی خبروں کے علاوہ اس میں مذہبی ' تاریخی ' علمی اور ادبی مضامین ہوتے ہیں اور کبھی کبھی لیتھو میں

---

* یہاں فرانسیسی میں شعر کا مطلب دیا ہے کہ محنت سے آدمی ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ سکتا ہے —

تصاویر بھی ہوتی ہیں - ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۲ ع کے نتیجے میں بڑے دن کے درخت کی ایک تصویر دی ہے اور اس کا مطلب سمجھایا ہے —

ایک اخبار لوک متر ہے - یہ ہندی کا رسالہ ہے اور دیوناگری رسم خط میں شائع ہوتا ہے - اور آگرہ میں سکندرہ کے مطبع میں چھپتا ہے جہاں " خیرخواہ خلق " چھپتا ہے - یہ پہلی جنوری سنہ ۱۸۶۳ ع سے نکلنا شروع ہوا ہے - چھوٹی تقطیع میں دو کالم پر چھپتا ہے - یہ رسالہ ماہانہ ہے - اس رسالہ کا مقصد وہی ہے جو " خیر خواہ خلق " کا - ایک ہندوں میں اور دوسرا مسلمانوں میں مسیحیت کی اشاعت و تبلیغ کی غرض سے شائع کیا گیا ہے - اس کے مدیر کا نام پردۂ خفا میں ہے - لیکن اس کے مضامین کے معیار اور سنسکرت دوہوں اور ہندی چوپائیوں کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً وہ کوئی ہندو عالم ہوں گے جنہوں نے مسیحی دین قبول کرلیا ہے —

مجھے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں پہنچی کہ آیا اس سال کلکتہ سے کوئی نیا اخبار یا رسالہ شائع ہوا یا نہیں ؟ - گزشتہ سال تو چار اردو کے اخبار وہاں سے نکلتے تھے —

اب ہم اخبار و رسائل کے علاوہ اور دوسرے ادبی مشاغل کی نسبت کچھ کہنا چاہتے ہیں - ایک مشہور کتاب جو حال میں شائع ہوئی ہے انجیل مقدس کی شرح ہے * - یہ " سید احمد " صدرامین غازی پور کی تصنیف ہے - موصوف اس وقت اردو زبان کے اعلیٰ ترین انشاپردازوں میں ہیں اور میں نے انھیں کی کتاب " آثارالصنادید " کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے - موصوف آج کل مذہبی مباحث میں مصروف ہیں - غالباً چند

* Mohomedan Commentary of the holy Bible غازی پور سنہ ۱۸۶۴ ع —

سال قبل وہ ایسا نہ کرسکتے اس واسطے کہ بادشاہ دہلی نے اپنی رعایا کو ممانعت کردی تھی کہ وہ عیسائی مشنری لوگوں سے کسی قسم کا بحث مباحثہ نہ کریں † - گزشتہ سال میں نے تذکرۃً کہا تھا کہ عنقریب یہ کتاب نکلنے والی ہے - اس کا پہلا حصہ شائع ہوچکا ہے - مصنف نے ازراہ عنایت یہ حصہ مجھے ارسال فرمایا ہے - میں ان کا ممنون ہوں - اس کتاب کا اصلی نام تبیئین الکلام فی تفسیرالتوریت والانجیل علی ملۃ الاسلام " ہے —

میں سمجھتا ہوں آپ کے لئے اس کتاب کے سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ میں اس کے چند اقتباسات اس وقت آپ صحباوں کے سامنے پیش کروں ‡ —

اس کتاب کا یہ پہلا حصہ شہر غازی پور میں مصنف کے خاص ذاتی مطبع میں چھپا ہے - اور موصوف نے خود اس کے سارے اخراجات برداشت کئے ہیں - یہ کتاب بڑی تقطیع پر ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے - اردو کے ساتھہ ساتھہ انگریزی ترجمہ بھی ہے - یہ حصہ در اصل تمہید کے طور پر ہے - اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس پوری کتاب کی وسعت کیا ہوگی - سید احمد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی معلومات گہری ہیں اور انہیں صرف قران اور توریت و انجیل ہی پر کافی عبور نہیں ہے بلکہ دوسری مشرقی تصانیف سے بھی وہ پورے طور پر واقف معلوم ہوتے ہیں - اس سے بھی بڑہ کر تعجب اس امر پر ہے کہ موصوف نے یورو پین تصانیف سے بھی استفادہ کیا ہے - چنانچہ وہ ان کے جگہ جگہ پر حوالے دیتے ہیں - یہ کتاب وسیع مطالعہ اور

† Friend of India

‡ اس جگہ اقتباسات کا فرانسیسی ترجمہ ہے —

تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے - مجھے زیادہ تر خوشی اس بات پر ہے کہ یہ کتاب اس زبان میں ہے جس کی تعلیم یہاں میرے ذمہ ہے - میرا تو خیال یہ ہے کہ اس قسم کے مطالب شاید پہلی مرتبہ کسی مسلمان نے اردو میں فکر و تحقیق کے ساتھہ پیش کئے ہیں - غالباً یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ شاید ہی مشرق کی کسی زبان میں اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے اس نوعیت کے مطالب کو ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہو —

اس پہلی جلد میں دس ابواب ہیں - پہلے باب میں انبیاء کے مشن اور انسانیت کے لئے ان کی ضرورت کو ثابت کیا ہے - دوسرے باب میں وحی اور کلام الہی کی اصلیت بتائی ہے سید احمد اپنی بحث میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انجیل مقدس میں تعلیم وحی حضرت مسیح کی زبان سے ادا کی گئی ہے —

تیسرے باب میں توریت، صحف الانبیاء، زبور اور انجیل کے متعلق اظہار خیال ہے - چوتھے باب میں ان آسمانی کتابوں کی نسبت جو مسلمانوں کے عقاید ہیں انہیں بیان کیا ہے - پانچویں باب میں ان آسمانی کتابوں سے بحث کی ہے جو بائیبل میں شامل ہیں - اس باب میں ان سب مقدس کتابوں کی صحیح فہرست درج ہے جن میں سے بعض کو مسیحی کلیسیاء تسلیم کرتا ہے اور بعض کو ماننے سے انکار کرتا ہے - اس فہرست میں بعض کتابیں ایسی ہیں جنہیں مسیحی کلیسیاء "گم شدہ" یا جعلی بتاتا ہے - مصنف نے ان کتابوں میں سے ہر ایک کی نسبت جو رائے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان مسائل پر کافی غور و فکر کیا ہے —

چھٹے باب میں سید احمد نے مسلمانوں کے اس طریقۂ تحقیق کا ذکر کیا ہے جو وہ آسمانی کتابوں کی صداقت پرکھنے کے لئے استعمال کرتے

ہیں - وہ طریقہ یہ ہے کہ ہمیں با وثوق لوگوں کے ایک سلسلہ کا علم ہونا چاہئے جن کا تعلق صاحب کتاب کی ذات تک پہنچا ہو - چنانچہ سید احمد نے خود اپنی مثال اس موقع پر دی ہے - وہ کہتے ہیں کہ ۲۸ مشہور اور با وثوق اشخاص کے سلسلے کے توسط سے اُن تک قرآن کریم رسول اللہ سے پہنچا ہے —

ساتویں باب میں ان تصرفات کا ذکر ہے جو انجیل و توریت میں ہوئے ہیں - یہ خیال عام طور پر مسلمانوں میں رائج چلا آتا ہے - در اصل مصنف نے نہایت صفائی اور ہوشیاری سے اس نازک مسئلے پر بحث کی ہے - اس باب کو پڑھنے سے ان کے علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے - مصنف نے آٹھ قسم کے تصرفات کا ذکر کیا ہے اور ان سبھوں کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کیا ہے - پھر اس کے بعد انجیل مقدس کی مختلف کتابوں کے قدیم قلمی نسخوں پر مورخانہ تبصرہ کیا ہے اور بر محل تفصیل سے اپنے مطالب کی تشریح کی ہے —

آٹھویں باب میں سید احمد نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ آیا انجیل مقدس کی مختلف کتابیں اصلی وحی کی تعلیم کے مطابق ہیں یا یہ کہ ان میں بعد میں تصرفات ہوئے ہیں - چنانچہ مصنف نے اس مسئلے کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ وہی ہے جو عام طور پر مسلمانوں میں رائج ہے -

نویں باب میں یہ بتایا ہے کہ مسلمان لوگ انجیل مقدس کے ترجموں کو کس حد تک صحیح سمجھ سکتے ہیں اور ان پر اعتماد کرسکتے ہیں - میرے خیال میں یہ باب اس کتاب میں سب سے زیادہ دلچسپ ہے - شروع میں مصنف نے کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی دشواریوں پر عام افکار پیش کئے ہیں اور پھر اس کے بعد انجیل مقدس کے ان ترجموں پر پوری

غیر جانبداری کے ساتھہ تبصرہ کیا ہے جو مشرق اور مغرب میں اب تک کئے گئے ہیں ۔ اسی ضمن میں ان ترجموں کا بھی ذکر آگیا ہے جو مختلف انجمن ہائے اشاعت انجیل کی جانب سے شائع ہو چکے ہیں ۔ مثلاً ان ان عبرانی اور عرب ترجموں کا بھی ذکر ہے جو میرے استاد سلوستردے ساسی ( Silvestre De Sacy ) نے اور میں نے اصلی قدیم نسخوں سے مقابلے کے بعد شائع کرائے ہیں ۔ اس کے علاوہ مصنف نے ان سب ہندوستانی ' فارسی ' عربی اور انگریزی ترجموں کا ذکر کیا ہے جو ان تک پہنچ سکے ۔ اس باب کو لکھتے وقت مصنف کے پاس ۱۸ زبانوں کے ترجمے اور دو قلمی نسخے موجود تھے ۔ ان قلمی نسخوں میں ایک عبرانی زبور کا تھا جس کا mazni نے عربی ترجمہ بھی کیا ہے ۔ غالباً یہ نسخہ سولھویں یا سترھویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے ۔ اس میں اور عام ' زبور ' میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں ۔ دوسرا قلمی نسخہ چاروں Evangiles کا عربی زبان میں ہے ۔ یہ روم کے سنہ ۱۶۷۱ ع والے ایڈیشن سے ملتا جلتا ہے اور میرے خیال میں غالباً اس کی نقل ہے ۔ اس باب کے آخر میں لسانی خاندان کے اعتبار سے ان زبانوں کا نقشہ دیا ہے جن جن میں انجیل مقدس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے یا عنقریب ہونے والا ہے ۔ یہ نقشہ " Bible of every land " سے نقل کیا ہے ۔ السنہ کی جو تقسیم اس موقع پر دی ہے وہ بجائے خود علمی دلچسپی سے خالی نہیں —

دسویں باب میں ' جو اس کتاب کا آخری باب ہے ' مصنف نے اُن اسلامی احکام کا ذکر کیا ہے جن سے قدیم آسمانی کتب کے بعض حصے منسوخ ہو گئے ہیں ۔ آخر میں دو ضمیمے ہیں پہلے ضمیمہ میں ان مشہور واقعات کی تاریخیں درج ہیں جن کا انجیل مقدس میں ذکر آیا ہے ۔ یہ تاریخیں

نامور انگریز عالم دینیات یوشر ( Usher ) کے حوالے سے لی گئی ہیں دوسرے ضمیمے میں تیرہ سو ہجری تک ( ۱۸۸۲ مطابق سن عیسوی ) سن ہجری اور سن عیسوی کی مطابقت قایم کی ہے - ۱۳۰۰ ہجری تک اس واسطے کہ عام طور پر مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس سال کے بعد جو عہد آئیگا وہ دنیا کا آخری عہد ہو گا —

غرض کہ مصنف نے اپنی کتاب کی اس تمہید میں ذاتی اپج اور اجتہاد سے کام لیا ہے - نہ صرف مسلمانوں بلکہ خود عیسائیوں کے لئے اس میں بعض باتیں نئی اور سبق آموز ہیں - یہ کتاب یقیناً انجیل کی ایک نہایت مکمل شرح ہو گی - تمہید کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو ہماری مقدس کتب پر پورا عبور حاصل ہے اور ان کی نظر سب ضروری معلومات پر پوری طرح حاوی ہے - اس کتاب میں وہ معلومات جو ہمیں مختلف جگہ جستہ جستہ ملتی ہیں ' ایک جگہ اکھٹا مل جائینگی - ہاں ' ساتھہ ہی ہمیں یہ امر فراموش نہ کرنا چاہئے کہ مصنف ایک مسلمان ہے - اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسیحی اور اسلامی تعلیم میں میل پیدا کرے - لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ غالباً اس کے ہم مذہب لوگ اس کی روا داری کی باتوں کو بری نظر سے دیکھیں گے - دوسری جانب عیسائی لوگ غالباً کبھی اس بات کی صداقت کو تسلیم نہیں کریں گے کہ قرآن بھی ایک آسمانی کتاب ہے - ہو گا یہ کہ مسلمان کفر کے فتوے دیں گے اور عیسائی مصنف ان کے علمی اور صلح پسندانہ خیالات کے ساتھہ اتفاق کرنے سے انکار کریں گے - خیر ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ دوسرے لوگ اس کتاب کو کس نظر سے دیکھیں گے - ہماری اپنی رائے یہ ہے کہ مصنف نے یہ کتاب لکھہ کر ایک بڑی علمی خدمت کی ہے - اس کتاب

کے پڑھنے سے مصنف کی رواداراند ذھنیت کا صاف طور پر اظہار ھوتا ھے - موصوف اپنے مذھب اسلام پر قایم رھنے کے ساتھہ ساتھہ اسلامی عقاید کی جس قدر بھی مسیحی تاویل ممکن ھے کرنے پر آمادہ ھیں - جہاں کہیں وہ حضرت مسیح کا ذکر کرتے ھیں تو بالکل اسی طرح کرتے ھیں جیسے کوئی عیسائی کریگا - اس کتاب میں جگہ جگہ آپکو " حضرت عیسیٰ " " سید نا عیسیٰ " کے الفاظ ملیں گے - خود قران میں بھی حضرت مسیح کے لئے " روح اللہ " کا لفظ استعمال ھوا ھے - اس کتاب کے دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ھے کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ موجود ھے جو انجیل مقدس کو پڑھتا ھے اور اس کی تعلیمات کو قدر منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ھے - انجیل کی متعدد کتابوں کے اردو میں ترجمے موجود ھیں - آج کل " ڈاکٹر ماتھر " " مرزا پور " میں ایک مکمل ایڈیشن فارسی رسم خط میں تیار کر رھے ھیں - موصوف نے لاطینی حروف میں سنہ ۱۸۶۰ ع میں اس ترجمے کو شائع کیا ھے - لیکن اب مزید اصلاحات کے بعد وہ یہ دوسرا ایڈیشن تیار کر رھے ھیں جو لندن والے ایڈیشن کی طرح " انجمن اشاعت انجیل برطانیہ و ممالک غیر " کی طرف سے شائع ھوگا - حال میں صوبۂ شمال مغربی کے مشنریوں نے یہ تجویز منظور کی ھے کہ اردو زبان میں انجیل کا ایک ایسا ترجمہ تیار کرنا چاھئے جو تمام ھندوستان میں بے چوں و چرا تسلیم کیا جائے - مجھے اس میں ذرا شبہ ھے کہ آیا یہ تجویز عنقریب عملی جامہ پہن سکے گی —

حال میں جن مصنفین کی نئی مطبوعات شائع ھوئی ھیں ان میں مولوی کریم الدین کا نام سب سے پہلے قابل ذکر ھے - میں سمجھتا ھوں آپ سب ان کے نام سے واقف ھوں گے - موصوف نے اس سال چھہ تصانیف

شائع کی ہیں - لاہور کے " مسٹر رابرٹ کسٹ " کی عنایت کی بدولت یہ سب میرے پاس بھیجی گئی ہیں —

پہلی کتاب " تسہیل القواعد " اردو زبان کی ہے یہ صرف و نحو کی کتاب نئے طریقہ پر لکھی گئی ہے اور پنجاب کے مدارس میں رائج ہے - یہ کتاب اسی نوعیت کی ہے جیسے میری کتاب " ہندوستانی زبان کے مبادیات " ہے - آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے حال ہی میں اس کا ایک نیا ایڈیشن نکالا ہے —

دوسری کتاب " کریم اللغات " ہے - اس میں عربی اور فارسی الفاظ کے اردو میں معنی دئے ہیں - یہ کتاب پنڈت اجودھیا پرشاد کے زیر اہتمام طبع ہوئی ہے —

تیسری کتاب " انشائے اردو " ہے - اس کے چار حصے ہیں - پہلے حصے میں خط نویسی کے نمونے دئے ہیں جو بزرگ اور خرد ' خرد اور بزرگ اور ہم عمر اور ہم مرتبہ لوگوں کے درمیان ہونی چاہئے - دوسرے حصے میں عرائض نویسی کے نمونے ہیں - تیسرے حصے میں دفاتر اور عدالتوں کے خطوط کے نمونے ہیں - چوتھے حصے میں کاروباری خطوط کے نمونے ہیں --

اس کتاب میں سب ضروری معلومات خط و کتابت کے متعلق موجود ہیں - عمر ' رشتے ' اور رتبے کے لحاظ سے جو القاب و آداب ہندوستانی میں استعمال ہوتے ہیں وہ سب اس کتاب میں مصنف نے جمع کردئے ہیں * دوستوں کو لکھنے کے جو آداب ہیں وہ بھی سب بیان کئے ہیں

---

* یہاں القاب و آداب کے فرانسیسی ترجمے دئے ہیں —

اس کے علاوہ شیخ ' سید ' خان ' مغل ' منشی ' پنڈت اور سرکاری ملازموں کے القاب و آداب ہیں —

اسی قسم کی ایک کتاب ہندی میں بھی لاہور سے شائع ہوئی ہے - اس کا نام پتر ملک ہے —

ایک اور کتاب " پنہ سود سنہ " لاہور سے منشی محمد عظیم کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے اس میں قدیم اور جدید مصنفوں کے ڈیڑھ سو مقولے نقل کئے گئے ہیں - اس ڈیڑھ سو میں سو وہ نصائح ہیں جو لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھیں - ہندوستانی میں جو مقولے مروج ہیں وہ عام طور پر کہاوتیں ہیں * —

" لاہور " سے ایک اور کتاب نکلی ہے جس کا نام " خط تقدیر " ہے - یہ کتاب اخلاق پر ہے اگرچہ نثر میں ہے لیکن جا بجا اشعار ہیں - اس کتاب کے سرورق پر ایک شعر بطور طغریٰ لکھا ہوا ہے † —

مولوی کریم الدین نے فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دیوان حافظ کا ایک انتخاب شائع کیا ہے - اس کے علاوہ موصوف نے " سعدی " کا دیوان مع اس کی سوانح کے طبع کرایا ہے - یہ واضح رہے کہ دیوان " سعدی " کے کلکتہ والے ایڈیشن کے نسخے اب کم یاب ہوگئے ہیں اور اس کے اصل قلمی نسخے تو بالکل ہی نایاب ہیں —

---

* یہاں گارساں دتاسی نے چند مقولوں اور کہاوتوں کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا ہے —

† یہاں اس شعر کا فرانسیسی میں مطلب سمجھایا ہے کہ " تقدیر کی مثال سوئے پریشان کی سی ہے جسے کنگھی سلجھاتی ہے " مطلب خبط سا ہے —

ہندوستانی کی اور کتابیں جو مجھے ہندوستان سے بھیجی گئی ہیں ان میں سنہ ۱۸۶۳ ع کی ایک جنتری ہے - پنڈت سورج بھان نے اس کو لاہور سے شائع کیا ہے - پنڈت جی ہندوستانی کے مشہور انشا پردازوں میں ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اس جنتری میں بہت مفید معلومات درج ہیں شروع میں اکیس کالموں میں ہندوستان کے مروج عہدوں کے مطابق ہر ماہ کے دنوں کا حساب ہے - پھر چاند کے دن کا حساب دنوں کا مختلف موسموں میں طول' سورج اور چاند کے مختلف مہینوں میں طلوع ہونے کے اوقات وغیرہ درج ہیں ہر مہینے کو دو صفحوں پر ختم کیا ہے - پہلے صفحے پر مذکورہ تفصیلات ملتی ہیں اور دوسرے پر خاص خاص دنوں کا حال ہے - پھر مسیحی' اسلامی' فصلی' یزد جردی سنین اور نو روز' سمت وغیرہ کے متعلق معلومات جمع کی ہیں - پھر چاند کی گردش' منحوس ایام' مدارات کی تقسیم' اوقات کا تعین' ہوا کے رخوں کی پہچان' اندھیری کے پندرہ دنوں ( بدی ) اور چاندنی کے پندرہ دنوں (سدی) کے متعلق تفصیل ہے - منطقتہ البروج کی علامات اور ان کے سب " نام " فارسی اور دیو ناگری رسم الخط میں ہیں - ہاتھ دیکھ کر آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے کے طریقے' وبا' اندھے پن اور زہریلے جانوروں کے کاٹنے کے علاج بھی بتائے ہیں —

میں تعزیرات کے ہندوستانی ترجمہ کی نسبت ذکر کرچکا ہوں - یہ کام مولوی عبد اللطیف خاں نے انجام دیا جن کا میں ابھی ذکر کرچکا ہوں - موصوف نے آر - کسٹ کی ایک کتاب " کنج سوالات قانون فوجداری " کے نام سے ترجمہ کیا ہے - یہ کتاب نہایت مفید ہے - اس کے علاوہ " پنجاب کا قانون دیوانی " " رہنمائے مجسٹریٹ " بھی قابل ذکر ہیں - آخر الذکر " اسکپ وک " ( Skip wick ) کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے - اس

قسم کی اور بھی چند کتابیں شائع ہوئی ہیں سنہ ۶۲-۱۸۶۱ ع کی پنجاب کے نظم و نسق کی رپورٹ ہے - پنڈت اجودھیا پرشاد نے اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے - یہ رپورٹ ان لوگوں کے لئے اہمیت رکھتی ہے جو اس صوبے کے حالات سے ٹھیک ٹھیک واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں - 'کپتن فلر' نے اس صوبے کی تعلیمی رپورٹ انگریزی میں پیش کی تھی - اس کا بھی اردو ترجمہ لالہ رام جس نے کیا ہے - اور دوسرے بعض رسالے قابل ذکر ہیں جیسے " دستور العمل مدارس تعلیم المعلمین " " رسالۂ نظام شمسی " وغیرہ - ہندی میں " حقایق الموجودات " (جسے چھوٹی سی دائرۃ المعارف سمجھنا چاہئے) اور " جامع الغنائس " کا اردو سے ترجمہ ہو گیا ہے —

نئی کتابوں میں عبدالواسع ہانسوی اور دیوی پرشاد کی فارسی کی صرف و نحو قابل ذکر ہے - آخرالذکر ایک مشہور ہندو عالم ہیں - بریلی کالج کے قدیم طالب علم ہیں - آج کل ضلع فرخ آباد میں انسپکٹر مدارس ہیں - موصوف نے ضلع فرخ آباد کی اردو میں تاریخ لکھی ہے اور ایک کتاب 'مظہر قدرت" لکھی ہے جس میں مذہبی مسائل سے بحث کی ہے - موصوف نے حال ہی میں صرف و نحو کے علاوہ ایک لغت بھی لکھی ہے جس میں مختلف السنہ مثلاً 'اردو' 'ہندی' 'فارسی' 'عربی' 'بنگالی اور انگریزی کے الفاظ کے معنی ہیں اور ساتھ ہی ان الفاظ کی مشق کے لئے مثالیں بھی دی ہیں —

مجھے حال میں دو ہندی کتابوں کا حال معلوم ہوا ہے جن کے متعلق ذکر کرنا شاید آپ صاحبوں کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - ایک " بھگتی بودک " ہے اور دوسری " سہسرا رتری سنکشیپ " ہے - اول الذکر میں سو مذہبی قصے ہیں - انہیں "جے پارسنز" نے ایک جگہ جمع کیا ہے - دوسری کتاب بنگالی کا ترجمہ ہے - یہ ترجمہ پنڈت بدری لال نے کیا ہے - موصوف ہندی کی

متعدد کتابوں کے مصنف ہیں —

اس سال پہلی جنوری کو گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے نئی مطبوعات کی جو فہرست شائع ہوئی ہے اس میں بعض کتابیں قابل ذکر ہیں - اس ضمن میں میں آپ صاحبوں کو یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگرچہ صوبۂ پنجاب میں پنجابی بولی جاتی ہے لیکن سرکاری دفتروں اور مدارس میں ہندوستانی ( اردو اور ہندی ) استعمال ہوتی ہے —

اس فہرست کی بعض کتابیں یہ ہیں" جغرافیہ جہاں " " جام جہاں نما " " تاریخ عالم " " تاریخ اودھ " " تاریخ گوشۂ پنجاب "

میں نے جن کتابوں کے ابھی نام لئے ہیں ان میں تقریباً سب انگریزی زبان سے ترجمہ کی گئی ہیں - در اصل یورپین لوگوں کے لئے یہ بات باعث فخر ہونی چاہئے کہ ان کی کتابیں ہندوستان میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور ان کے ترجمے کئے جاتے ہیں - چنانچہ ' ولسن ' نے ' رگ وید ' پر جو تمہید لکھی تھی اس کا شیوپرشاد نے ہندی میں ترجمہ کردیا ہے - موصوف اس زمانہ کے مشہور انشاپردازوں میں ہیں اور تیس کتابوں کے مصنف ہیں - وہ ہندی اور اردو دونو میں لکھتے ہیں - انھوں نے سکھوں کے عروج و زوال کی تاریخ اور منو کے قوانین پر قلم فرسائی کی ہے - اس کے علاوہ سنسکرت اور انگریزی زبان سے متعدد ترجمے کئے ہیں - اس سال اور جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی فہرست یہ ہے - " کورس اردو " " پندنامۂ عیار داران " " مفتاح القواعد " " کلید گنج مال " " زبدۃ الحساب " اور ' ہدایت نامۂ جاگیرداران " —

میں نے آپ صاحبوں کے سامنے جن مطبوعات کا ذکر کیا ہے اس سے آپ پر یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ ان کی بدولت اہل ہند میں تعلیم کا چرچا بڑھتا جا رہا ہے اور دن بدن

مغربی علوم میں اهل هند ترقی کر رهے هیں - یه بات قابل افسوس هے که اب تک بهت کم هندوستانی اپني تعلیمی تکمیل کی غرض سے یورپ آئے هیں - اس میں مسلمانوں کے لئے تو کوئی دشواری نهیں هے لیکن هندوؤں کے لئے ولایت آنا بے دین هونے کے مرادف سمجها جاتا هے - باوجود اس کے بعض هندو همت کرکے سمندر پار آئے هیں - مثلاً مهی پترم روپ رام * هیں جنهوں نے ذات باهر هونے کے خطرے کی مطلق پروا نهیں کی اسی طرح کلکته کے پریسیڈنسی کالج کے ایک طالبعلم بابو ستندرا ناتهه ٹگور بهی انگلستان تعلیم کی غرض سے آئے اور سول سروس امتحان میں کامیاب هوکر واپس گئے - موصوف آج کل " بمبئی میں ایک اعلی سرکاری عهده پر مامور هیں —

هندوستان بهر میں آج کل تین یونیورسٹیاں هیں - ایک کلکته میں دوسری بمبئي میں، اور تیسری مدراس میں - ان یونیورسٹیوں کے انتظامات نهایت عمده هیں اور ان میں طلبه کی ایک بڑی تعداد تعلیم پا رهی هے - کلکته یونیورسٹی کو قائم هوئے اب چهه سال هوئے هیں - اس دوران میں ۲۲۵ طلبه کا یونیورسٹی ڈگری کے لئے داخله هوا هے - گزشته دو سال میں تقریباً دوسو طالبعلم شعبهٔ فنون میں کامیاب هوئے - ان میں ۸۹ انٹرینس کے امتحان میں کامیاب هوئے - مخصوص شعبوں میں ۲۰ سول میں اور ۲۱ طبابت میں اور ۲۷ وکالت میں کامیاب رهے یه بات قابل توجه هے که ان امتحانات میں مسلمان هندوؤں سے بهت پیچهے نظر آتے هیں اور عیسائی بهی پیچهے هیں —

گزشته سرکاری امتحانات میں ۱۳۳۴ امیدواروں نے شرکت کی - ان

---

* خطبه ۲ دسمبر سنه ۱۸۶۱ ع —

میں سولہ سے لے کر بیس سال کی عمر کے امیدواروں میں ۷۱ عیسائی اور ۴۶ مسلمانوں نے شرکت کی ان امتحانات میں صوبہ سرحد لاہور اور کولمبو تک کے طلبۂ شرکت کرتے ہیں - ان امتحانوں میں انگریزی کے علاوہ ایک اور زبان لازمی ہوتی ہے - امیدوار کو اختیار ہے کہ وہ جونسی زبان چاہے منتخب کرے - چنانچہ ۱۰۲ طالبعلموں نے ہندوستانی کو منتخب کیا ' ۳۰ نے سنسکرت کو اور ۶ نے فارسی کو —

ابتدائی تعلیم بھی دن بدن ترقی کررہی ہے - صرف صوبہ بنگال میں ۸۱۶ ابتدائی مدارس موجود ہیں - ان مدارس میں تقریباً ۵۰ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں - صوبۂ بمبئی میں ۶۸۰ ابتدائی مدارس ہیں اور ان میں ۳۶ ہزار سات سو پچاس طلبہ تعلیم پارہے ہیں صوبہ مدراس میں ۵۷۹ مدارس ہیں جن میں ۲۳ ہزار نوسو پینسٹھ طلبہ ہیں - صوبہ جات شمال مغربی میں ' جہاں صرف ہندوستانی بولی جاتی ہے - تعلیم کی ترقی ہورہی ہے - ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۰ ہزار اسی ہے جن میں طلبہ کی تعداد ایک لاکھ ۷۴ ہزار چھہ سو اُناسی ہے * —

آگرہ میں سنہ ۱۸۵۰ ع میں ایک کالج قائم ہوا ہے جسے سینٹ جان کالج کہتے ہیں - اس کالج میں نوجوان ہندوؤں کو مغربی ادب اور علوم کی تعلیم دی جاتی ہے - مسیحی رواداری کے اصول کے مطابق ہر ذات کے ہندو کا اس کالج میں داخلہ ہوسکتا ہے - اب تک کوئی خاص دشواری اس طرز عمل کی وجہ سے نہیں پیش آئی تھی لیکن ابھی حال میں ایک شودر ذات کے لڑکے کو کالج میں داخل کرنے سے دقت پیش آرہی ہے - یہ لڑکا مہتر کا ہے جس نے مسیحی مذہب قبول کر لیا ہے - چنانچہ بطور احتجاج

* Indian Mail ستمبر سنہ ۱۸۶۳ ع

کالج کے ۲۰۰ ہندو طالب علموں نے علحدگی اختیار کرلی ہے - اس قسم کا کوئی واقعہ آگرہ کے دوسرے کالج میں جس کا نام وکٹوریہ کالج ہے، اب تک نہیں پیش آیا - اس کالج میں گذشتہ ستمبر میں ۳۵۱ طالب علم تھے - ان میں ۳۱۴ ہندو، ۲۵ مسلمان اور صرف ۱۲ عیسائی تھے - اس کالج میں مختلف درسوں کی تعداد ۳۵ ہے - ۱۸ کا تعلق شعبۂ انگریزی سے ہے اور ۱۷ کا شعبۂ مشرقی سے موخرالذکر میں ۱۱ ہندوستانی (اردو اور ہندی)، ۴ فارسی، ایک عربی اور ایک سنسکرت کا درس ہوتا ہے* —

میری معلومات اودھ کی قدیم مملکت کے متعلق بہت محدود ہیں - اس کے بر خلاف پنجاب کے حالات دریافت کرنے کے لئے میرے پاس کافی مسالا موجود ہے - یہ پانچ دریاؤں کا وسیع علاقہ جو پندرہ سال قبل ایک زبردست آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا آج سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ ہے اور تعلیمی لحاظ سے خوب ترقی کر رہا ہے - کیپٹن "فلر" نے حال ہی میں جو تعلیمی رپورٹ پیش کی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۶۲ اور سنہ ۱۸۶۳ ع میں باوجود مالی حالت کی خرابی کے ۵۴ مدرسے اور نئے قایم ہوئے ہیں اور طلبہ کی تعداد میں ۷ ہزار پانچ سو دس کا اور اضافہ ہوا ہے - چنانچہ گزشتہ سال کے پہلی جنوری کے اعداد و شمار کے مطابق اس صوبہ میں ابتدائی مدارس کی تعداد دو ہزار چھتیس تک پہنچ چکی ہے اور طلبہ کی کل تعداد ۶۰ ہزار ہے - ان میں سے ۵ ہزار آٹھ سو چونتیس ہندوستانی کے ذریعہ سے انگریزی زبان سیکھ رہے ہیں - لڑکیوں کے مدارس کی تعداد ۱۰۳ ہے - ان میں

---

* Indian Mail — نومبر سنہ ۱۸۶۳ ع

متعدد کتابوں کے مصنف ہیں —

اس سال پہلی جنوری کو گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے نئی مطبوعات کی جو فہرست شائع ہوئی ہے اس میں بعض کتابیں قابل ذکر ہیں - اس ضمن میں میں آپ صاحبوں کو یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر چہ صوبۂ پنجاب میں پنجابی بولی جاتی ہے لیکن سرکاری دفتروں اور مدارس میں ہندوستانی ( اردو اور ہندی ) استعمال ہوتی ہے —

اس فہرست کی بعض کتابیں یہ ہیں" جغرافیہ جہاں " " جام جہاں نما " " تاریخ عالم " " تاریخ اودھ " " تاریخ گوشۂ پنجاب "

میں نے جن کتابوں کے ابھی نام لئے ہیں ان میں تقریباً سب انگریزی زبان سے ترجمہ کی گئی ہیں - در اصل یورپین لوگوں کے لئے یہ بات باعث فخر ہونی چاہئے کہ ان کی کتابیں ہندوستان میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور ان کے ترجمے کئے جاتے ہیں - چنانچہ ' ولسن ' نے ' رگ وید ' پر جو تمہید لکھی تھی اس کا شیوپرشاد نے ہندی میں ترجمہ کردیا ہے - موصوف اس زمانہ کے مشہور انشاپردازوں میں ہیں اور تیس کتابوں کے مصنف ہیں - وہ ہندی اور اردو دونو میں لکھتے ہیں - انھوں نے سکھوں کے عروج و زوال کی تاریخ اور منو کے قوانین پر قلم فرسائی کی ہے - اس کے علاوہ سنسکرت اور انگریزی زبان سے متعدد ترجمے کئے ہیں - اس سال اور جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی فہرست یہ ہے - " کورس اردو " " پندنامۂ عیال داران " " مفتاح القواعد " " کلید گنج مال " " زبدۃ الحساب " اور ' ہدایت نامۂ جاگیرداران " —

میں نے آپ صاحبوں کے سامنے جن مطبوعات کا ذکر کیا ہے اس سے آپ پر یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ ان کی بدولت اہل ہند میں تعلیم کا چرچا بڑھتا جا رہا ہے اور دن بدن

مغربی علوم میں اهل هند ترقی کر رهے هیں - یه بات قابل افسوس هے که اب تک بهت کم هندوستانی اپني تعلیمی تکمیل کی غرض سے یورپ آئے هیں - اس میں مسلمانوں کے لئے تو کوئی دشواری نهیں هے لیکن هندوؤں کے لئے ولایت آنا بے دین هونے کے مرادف سمجها جاتا هے - باوجود اس کے بعض هندو همت کرکے سمندر پار آئے هیں - مثلاً سهی پترم روپ رام * هیں جنهوں نے ذات باهر هونے کے خطرے کی مطلق پروا نهیں کی اسی طرح کلکته کے پریسیڈنسی کالج کے ایک طالبعلم بابو ستندرا ناتهه ٹگور بهی انگلستان تعلیم کی غرض سے آئے اور سول سروس امتحان میں کامیاب هوکر واپس گئے - موصوف آج کل " بمبئی میں ایک اعلی سرکاری عهده پر مامور هیں —

هندوستان بهر میں آج کل تین یونیورسٹیاں هیں - ایک کلکته میں دوسری بمبئي میں اور تیسری مدراس میں - ان یونیورسٹیوں کے انتظامات نهایت عمده هیں اور ان میں طلبه کی ایک بڑی تعداد تعلیم پا رهی هے - کلکته یونیورسٹی کو قائم هوئے اب چهه سال هوئے هیں - اس دوران میں ۲۲۵ طلبه کا یونیورسٹی ڈگری کے لئے داخله هوا هے - گزشته دو سال میں تقریباً دوسو طالبعلم شعبهٔ فنون میں کامیاب هوئے - ان میں ۸۹ انٹرینس کے امتحان میں کامیاب هوئے - مخصوص شعبوں میں ۲۰ سول میں اور ۲۱ طبابت میں اور ۲۷ وکالت میں کامیاب رهے یه بات قابل توجه هے که ان امتحانات میں مسلمان هندوؤں سے بهت پیچهے نظر آتے هیں اور عیسائي بهی پیچهے هیں —

گزشته سرکاری امتحانات میں ۱۳۳۴ امیدواروں نے شرکت کی - ان

---

* خطبه ۲ دسمبر سنه ۱۸۶۱ ع —

میں سولہ سے لے کر بیس سال کی عمر کے امیدواروں میں ۷۱ عیسائی اور ۴۶ مسلمانوں نے شرکت کی ان امتحانات میں صوبہ سرحد لاہور اور کولمبو تک کے طلبۂ شرکت کرتے ہیں - ان امتحانوں میں انگریزی کے علاوہ ایک اور زبان لازمی ہوتی ہے - امیدوار کو اختیار ہے کہ وہ جونسی زبان چاہے منتخب کرے - چنانچہ ۱۰۲ طالبعلموں نے ہندوستانی کو منتخب کیا ' ۳۰ نے سنسکرت کو اور ۶ نے فارسی کو —

ابتدائی تعلیم بھی دن بدن ترقی کررہی ہے - صرف صوبہ بنگال میں ۸۱۶ ابتدائی مدارس موجود ہیں - ان مدارس میں تقریباً ۵۰ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں - صوبۂ بمبئی میں ۶۸۰ ابتدائی مدارس ہیں اور ان میں ۳۶ ہزار سات سو پچاس طلبہ تعلیم پارہے ہیں صوبہ مدراس میں ۵۷۹ مدارس ہیں جن میں ۲۳ ہزار نوسو پینسٹھ طلبہ ہیں - صوبہ جات شمال مغربی میں ' جہاں صرف ہندوستانی بولی جاتی ہے - تعلیم کی ترقی ہورہی ہے - ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۰ ہزار اسی ہے جن میں طلبہ کی تعداد ایک لاکھ ۷۴ ہزار چھہ سو اُناسی ہے * —

آگرہ میں سنہ ۱۸۵۰ ع میں ایک کالج قائم ہوا ہے جسے سینٹ جان کالج کہتے ہیں - اس کالج میں نوجوان ہندوؤں کو مغربی ادب اور علوم کی تعلیم دی جاتی ہے - مسیحی رواداری کے اصول کے مطابق ہر ذات کے ہندو کا اس کالج میں داخلہ ہوسکتا ہے - اب تک کوئی خاص دشواری اس طرز عمل کی وجہ سے نہیں پیش آئی تھی لیکن ابھی حال میں ایک شودر ذات کے لڑکے کو کالج میں داخل کرنے سے دقت پیش آرہی ہے - یہ لڑکا مہتر کا ہے جس نے مسیحی مذہب قبول کر لیا ہے - چنانچہ بطور احتجاج

* Indian Mail ستمبر سنہ ۱۸۶۳ ع

کالج کے ۲۰۰ ہندو طالب علموں نے علحدگی اختیار کرلی ہے - اس قسم کا کوئی واقعہ آگرہ کے دوسرے کالج میں جس کا نام وکٹوریہ کالج ہے، اب تک نہیں پیش آیا - اس کالج میں گذشتہ ستمبر میں ۳۵۱ طالب علم تھے - ان میں ۳۱۴ ہندو، ۲۵ مسلمان اور صرف ۱۲ عیسائی تھے - اس کالج میں مختلف درسوں کی تعداد ۳۵ ہے - ۱۸ کا تعلق شعبۂ انگریزی سے ہے اور ۱۷ کا شعبۂ مشرقی سے موخرالذکر میں ۱۱ ہندوستانی (اردو اور ہندی)، ۴ فارسی، ایک عربی اور ایک سنسکرت کا درس ہوتا ہے* —

میری معلومات اودھ کی قدیم مملکت کے متعلق بہت محدود ہیں - اس کے بر خلاف پنجاب کے حالات دریافت کرنے کے لئے میرے پاس کافی مسالا موجود ہے - یہ پانچ دریاؤں کا وسیع علاقہ جو پندرہ سال قبل ایک زبردست آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا آج سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ ہے اور تعلیمی لحاظ سے خوب ترقی کر رہا ہے - کیپٹن "فلر" نے حال ہی میں جو تعلیمی رپورٹ پیش کی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۶۲ اور سنہ ۱۸۶۳ ع میں باوجود مالی حالت کی خرابی کے ۵۴ مدرسے اور نئے قایم ہوئے ہیں اور طلبہ کی تعداد میں ۷ ہزار پانچ سو دس کا اور اضافہ ہوا ہے - چنانچہ گزشتہ سال کے پہلی جنوری کے اعداد و شمار کے مطابق اس صوبہ میں ابتدائی مدارس کی تعداد دو ہزار چھتیس تک پہنچ چکی ہے اور طلبہ کی کل تعداد ۶۰ ہزار ہے - ان میں سے ۵ ہزار آٹھ سو چونتیس ہندوستانی کے ذریعہ سے انگریزی زبان سیکھ رہے ہیں - لڑکیوں کے مدارس کی تعداد ۱۰۳ ہے - ان میں

---

* Indian Mail — نومبر سنہ ۱۸۶۳ ع

تعلیم پانے والیوں کی تعداد ۲ ہزار دو سو چوبیس ہے گزشتہ سال کے مقابلے میں یہ تعداد دگنی ہے - ان مدارس کے علاوہ معلموں کی تعلیم کے مدارس ہیں - " لاہور " میں معلموں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج قایم ہوا ہے جس میں تعلیم پانے والوں کی تعداد دو سو ہے —

" لاہور " کا میڈیکل کالج بہت اچھی حالت میں ہے - گزشتہ سال اس میں ۵۰ طالب علم تھے جن میں سے ۳۰ نے جولائی میں اپنی تعلیم کی تکمیل کرلی ہوگی —

" بمبئی " کا صوبہ تعلیمی ترقی میں کسی طرح دوسرے صوبوں سے پیچھے نہیں ہے - " بمبئی " یونیورسٹی کے پاس اس وقت ( Haileybury ) کالج کا پورا کتب خانہ آگیا ہے - اس کتب خانے سے مشرقی علوم کی تحقیق میں بہت مدد ملے گی - " کاوس جی جہانگیر " نے، جو " بمبئی " کے ایک متمول پارسی ہیں اور جنھیں انگریز لوگ ان کی دولت کے باعث " نقدہ " ( Ready Money ) کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس یونیورسٹی کی عمارتوں کے لئے ایک لاکھہ روپیہ کی رقم بطور عطیہ دی ہے - موصوف نے مبلغ ۵ ہزار روپے کا انعام اس پارسی بوائے سکالر کے لئے مقرر کیا ہے جو بمبئی ہائی کورٹ میں امتیاز حاصل کرے گا —

" بمبئی " میں ہندوستانی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسہ قایم ہوا ہے اس کا نام "Alexandra Native Girls' English Institution" ہے - اس کا افتتاح گزشتہ سال پہلی ستمبر کو ہوا - یہ مدرسہ "مانک جی کرست جی " کے مکان میں واقع ہے - ہمیں توقع ہے کہ چار ہزار روپے کے علاوہ جو اس سخیر اور فیاض شخص نے دئے ہیں اس کے اور دوسرے

احباب بھی مالی امداد کریں گے تا کہ اس مدرسے کی اپنی عمارت علحدہ بن جائے —

ایک اور پارسی ہیں جنھوں نے لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کے لئے چار ہزار روپے کی رقم عطا کی ہے اور ایک دوسرے شخص نے چار ہزار کی رقم سنسکرت مدرسہ کے لئے دی ہے - دو پارسیوں نے مل کر ' بمبئی ' یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ۵ ہزار روپے دئے ہیں اس رقم سے سالانہ ایک سونے کا تمغہ اس طالبعلم کو دیا جائیگا جو بہترین مضمون " ہندوستان میں مغربی علوم " پر لکھے گا - " جمشید جی جی بھائی " نے ' پونا ' میں ایک کالج قایم کرنے کے لئے ایک لاکھ کا عطیہ دیا ہے - دو اور پارسی ہیں جنھوں نے مل کر ایک لاکھ کا وعدہ کیا ہے - ایک اور پارسی ہیں جنھوں نے گجرات میں تعلیمی ترقی کے لئے ۵۰ ہزار کی رقم کا عطیہ دیا ہے —

آج کل ہندوستان میں فوٹو گرافی کا ہر جگہ رواج ہو رہا ہے - ہندوستانی لوگ اس کے اصول اور طریقے بڑے شوق سے سیکھ رہے ہیں - ' الہ آباد ' گزٹ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ' رڑکی ' کے تھومسن کالج میں ایک ماہر فوٹو گرافی بھی رکھا جائیگا تا کہ وہ دیسی طلبہ کو اس کے اصول و مبادیات سکھائے - غرض کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں فوٹو گرافی کا چرچا ہے - ' ٹراونکور ' میں ' ڈبلوٹیلر ' کی کتاب ' قدیم ہند کی عمارتیں ' سنگتراشی اور مصوری ' کو باتصویر شائع کیا گیا ہے - ' ڈبلوٹیلر ' کو اس کتاب پر راجہ ' ٹراونکور ' کی طرف سے انعام بھی مل چکا ہے —

ہندوستانیوں میں یوروپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اُسی قدر وہ ہمارے تہذیب و تمدن اور ہمارے اصول مذہبی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں - ہندوستان میں تبلیغ مسیحیت کو جو کامیابی حاصل ہو رہی

ہے اس سے ہر عیسائی کو خوشی ہونی چاہئے * 'جامی' نے اپنی 'یوسف زلیخا' میں ایک جگہ کہا ہے کہ 'سچائی کو دن دونی ترقی اور فروغ ہوتا ہے'۔ کیتھولک مجبوراً اپنی عبادت ہندوستانی گرجوں میں بھی لاطینی زبان میں کرتے ہیں لیکن 'پروٹسٹنٹ' اور 'انگلی کن' ہندوستانی اور دوسری مقامی زبانوں میں اپنی عبادت کی دعائیں پڑھتے ہیں۔ انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہندوستانی زبان میں انگریزی دعاؤں کی لے کو منتقل کرلیں لیکن یہ انگریزی لے ہندوستانی لوگوں کو ذرا نہیں بھاتی۔ بعض مشنری یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستانی راگوں کے مطابق اپنی دعاؤں کو ادا کریں اور ایک حد تک انھیں اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی راگوں کو جو قدیم زمانے سے ہندوستان میں چلے آ رہے ہیں، یوروپین علامات میں لکھ لیا گیا ہے۔ ان راگوں کے متعلق دیسی ماہرین موسیقی سے پوری معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے گیتوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ † ہندوستانی موسیقی میں تحریری علامات نہیں استعمال ہوتیں۔ ان راگوں کو یورپین علامات کے ذریعہ تحریر کیا گیا ہے ان میں سے بعض راگ تو خاص طور پر اسی کے لئے موزوں کئے گئے ہیں لیکن بیشتر ان میں وہ ہیں جو ہندوؤں میں قدیم زمانہ سے چلے آتے ہیں۔ یہ دن، سال اور موسموں کے لحاظ سے ہوتے ہیں اور

---

* دیکھو ۶ جون سنہ ۱۸۶۳ ع کے Indian Mail میں "Statisticallables of Indian Missions" از ڈاکٹر "سلنز"

† بنارس - سنہ ۱۸۶۱ ع - "The Hindustani Choral Book" جے پارسن جے کرسچین اور "ایچ کلنس" نے اس کتاب کو تیار کیا ہے۔ ہندوستانی میں "سور سنگرا" قابل ذکر ہے۔ مجھے یہ کتابیں 'نائٹ' کے موسیولیون بھورو نے بھیجی ہیں۔

ان کے نام الگ الگ ہیں - مسلمانی گیت ہندو گیتوں سے مختلف ہوتے ہیں - ان میں سے بعض شجاعت علی خاں کے توسط سے حاصل ہوئے ہیں - موصوف پہلے مسلمان تھے اور اب مسیحی دین قبول کر لیا ہے - آج کل وہ کلکتہ کے دیسی گرجے میں پادری کی حیثیت سے کام کرتے ہیں - ہندو اور مسلمانوں کے گیتوں میں نہ صرف راگ اور سر کا فرق ہوتا ہے بلکہ ان کا اتار چڑھاؤ بالکل مختلف ہوتا ہے - ہندوؤں کے گیتوں میں اشعار کو اجزائے لفظی کی مقدار سے موزوں کرتے ہیں جیسے یونانی یا لاطینی میں اور مسلمانی گیتوں میں اجزائے لفظی کی تعداد کا لحاظ کیا جاتا ہے - یہ دوسرا طریقہ زیادہ سادہ ہے *

انگریزی مشن جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں انھیں خوب کامیابی ہو رہی ہے اور ہر روز ہندوستان میں مسیحی دین کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے - ۱۸۶۲ ع میں بنگال ' صوبہ شمالی مغربی ' صوبہ بمبئی اور صوبہ مدراس میں عیسائیوں کی کل تعداد ایک لاکھ اٹھارہ ہزار آٹھ سو نوے تھی - مشنریوں کی تعداد جو تبلیغی کام کر رہے تھے ۴۱۸ تھی اور کل ہندوستان میں ۸۹۰ کلیسا تھے - گزشتہ سال جولائی کے مہینے میں ایک یورپین سیاح "دہلی" کے دیسی کلیسا میں اتفاق سے پہنچ گیا تھا - اس نے بیان کیا ہے کہ اس نے وہاں عبادت میں شرکت کی - عبادت کی دعائیں اردو میں تھیں - اس کا بیان ہے کہ اس کلیسا کے ذریعہ سے انجیل مقدس کی نشرو اشاعت کا جو کام ہوتا ہے اس میں دیسی لوگ ' مرد ' عورتیں اور بچے شرکت کرتے ہیں اور دعاؤں کو گا گا کر پڑھتے ہیں - چھوٹا ناگپور میں " رانچی " کے کلیسا کے متعلق

* دیکھو میری کتاب " Rhetorique et prosodie de langues de l'orient Musulman "

بھی ایک دوسرے سیاح نے یہی بیان کیا ہے - فرق اتنا ہے کہ " رانچی " میں دعائیں ہندی میں پڑھی جاتی ہیں - * " امرتسر " میں کلیساء کی دیواروں پر حضرت مسیح کے " دس احکام " اور انجیل مقدس کے بعض دوسرے حصے ہندوستانی میں لکھے ہوئے گئے ہیں - صوبہ شمال مغربی کے دوسرے شہروں کا بھی بعینہ یہی حال ہے - ہر کہیں ہندوستانی زبان میں کلیسا کی دعائیں پڑھی جاتی ہیں —

گزشتہ سال ۳ مئی کو لندن میں " انجمن برائے اشاعت علم مسیحی " کی طرف سے جو جلسہ ہوا تھا اس میں ہندوستان کے ان مسیحی مدارس کے متعلق بہت دلچسپ تفصیلات بیان کی گئی ہیں جن میں ہندو اور مسلمانوں کے بچے بلا تکلف تعلیم حاصل کرتے ہیں - " شملہ " اور " جبل پور " میں حال ہی میں اس قسم کے مسیحی مدارس کھولے گئے ہیں - کلکتہ کے اسقف اور صوبجات متوسط کے ناظم تعلیمات نے " جبل پور " کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان دونوں کا خیال ہے کہ ان کے جوابات قابل اطمینان تھے - اس طرح " ناگپور " کا مدرسہ بھی خوب ترقی پر ہے - " لندن " کے اس جلسہ میں کلکتہ کے اسقف کا ایک خط پڑھا گیا جس میں مذکور تھا کہ میں نے آگرہ ' الہ آباد ' " بھاگل پور " " کانپور " اور " بنارس " کے کلیساؤں میں ہندوستانی زبان میں بپتسما کی رسم ادا کی - پھر بنارس کے ایک دیسی مسیحی مبلغ کا ذکر کیا ہے جو چار سال سے کلیسا کے ایک ادنی عہدہ پر کام کر رہا ہے اور چونکہ اس کا کام قابل ستایش رہا ہے اس واسطے اس کو " واعظ " کے عہدہ پر ممتاز کر دیا گیا —

ہندوستان میں ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے مسیحی

---

* دیکھو " Colonial church chronicle " ماہ اگست اور دسمبر سنہ ۱۸۶۳ ع —

دین قبول کیا - بقول مور ( Moore ) :

جب کسی کٹر آدمی کا اعتقاد باطل عقیدہ پر جم جائے اور وہ اسے محبوب رکھنے لگے تو آخر تک وہ اس پر قائم رہتا ہے " —

بدقسمتی سے خود عیسائیوں میں جو باہم اختلافات ہیں ان کا ایشیائی لوگوں کی ذہنیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے - اگر یہ اختلافات ہندوستان میں رونما نہ ہوئے ہوتے تو آج مسیحی حلقہ زیادہ وسیع نظر آتا - ڈاکٹر " کولنسو " نے حال میں انجیل کی تعلیم پر جو افسوس ناک حملہ کیا ہے اس کا بھی بہت برا اثر پڑا - ڈاکٹر " کولنسو " کلیسا سے باغی ہوگئے ہیں - بدقسمتی سے وہ ہندوستان میں بہت شہرت رکھتے ہیں - انھوں نے علم الحساب کی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو بہت مقبول ہوئی ہیں - چنانچہ اس ضمن میں " کلکتہ " کا اخبار " بنگالی " کہتا ہے کہ جب کہ مسیحی تعلیم کے متعلق خود مشہور اہل یورپ کو شبہ ہے تو اس صورت میں ہندوؤں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے دین کو ترک کر کے عیسائی مذہب قبول کرلیں گے نہایت مہمل بات ہے - لیکن اس اخبار کے لکھنے والے کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ ڈاکٹر " کولنسو " ممکن ہے ماہر علم حساب کی حیثیت سے لائق فائق ہوں لیکن علم دینیات میں وہ ماہر نہیں ہوسکتے - انھوں نے انجیل کی تعلیم پر جو اعتراضات کئے ہیں ان میں انھوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی - سیکڑوں مرتبہ ان اعتراضات کے جوابات دئے جاچکے ہیں - یہ نہایت تعجب انگیز امر ہے کہ ڈاکٹر " کولنسو " کے اعتراضات کا جواب ہمیں سید احمد کی شرح میں ملتا ہے جس کی نسبت میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی ذکر کرچکا ہوں - سید احمد نے بنی اسرائیل کی آبادی بڑھنے اور " مصر " میں juda اور حضرت یوسف

کے زمانہ کے متعلق جو نکات پیدا کئے ہیں ان میں ڈاکٹر " کولنسو " کے اعتراضات کا شافی جواب پایا جاتا ہے —

ہندو اگر چہ اپنے مذہب کے معاملے میں نہایت قدامت پرست واقع ہوئے ہیں لیکن یورپین اور مسیحی تہذیب کا ان پر بہت اثر پڑرہا ہے - اب آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ ان رسوم کو ترک کرتے جارہے ہیں جو مسیحی معیار سے معیوب ہیں - چنانچہ بنگال کے بعض معزز ہندوؤں نے گورنر جنرل اور مجلس وضع قوانین کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی ہے جس میں یہ استدعا کی ہے کہ تعداد ازدواج کو اسی طرح ہندوؤں میں قانوناً ممنوع قرار دیا جائے جس طرح ستی کی رسم ممنوع کردی گئی ہے - مجلس وضع قوانین کے آئندہ جلسے میں راجہ دیونرائن سنگھہ ایک قرار داد پیش کرنے والے ہیں جس کی رو سے اس مشرقی رسم قبیحہ کا کلی انسداد متصور ہے - یقیناً یہ بہت اچھا ہو اگر اس قسم کا قانون منظور ہوجائے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ کہیں اس قانون سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے - اس قسم کا قانون ایک عام مروجہ رسم کے بالکل خلاف ہوگا - جن مشنریوں کو ہندوؤں کو بپتسما دینا ہوتا ہے انھیں اس میں بڑی سہولت ہو جائیگی - اس لئے کہ مشنری ایسے لوگوں کو بپتسما کردینے میں تامل کرتے ہیں جن کی متعدد بیویاں ہوتی ہیں —

ہندوستان میں جن لوگوں کو بنی نوع انسان کے ساتھہ ہمدردی ہے وہ جس طرح بیواؤں کے جلانے اور تعداد ازدواج کی مخالفت کر رہے ہیں اسی طرح اور بہت ساری رسوم قبیحہ ہیں جنھیں وہ حقوق نسوان کے لئے نقصان رساں سمجھتے ہیں - مثال کے طور پر ایک رسم کو لیجئے جو دراصل ہندوؤں کی رسم ہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی وہ

عام طور پر رائج ہوگئی ہے - ہماری مراد ہے عقد بیوگان کی ممانعت سے - چنانچہ شاہجہانپور میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کے ارکان میں ہندو اور مسلمان دونو شامل ہیں - اس انجمن کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں جو بری رسمیں پائی جاتی ہیں ان کی اصلاح کی جائے - اس انجمن کے گزشتہ اجلاس میں جو قرار داد منظور ہوئی ہے اس میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے کہ ارکان انجمن اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنائیں اور 'قاضی سر فراز علی' کو اس کے لئے خاص طور پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ ایک دستور العمل لکھیں جس میں پردہ نشین خواتین کو بتلایا جائے کہ کون کون سی نقصان رساں رسموں کی پابندی کے لئے وہ مجبور کی جاتی ہیں —

آپ حضرات مجھے معاف کریں کہ میں نے بعض مسائل کو بہت طول دے دیا - اب میں اپنے خطبے کو ختم کرنے سے پیشتر ان اصحاب کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اس سال راہی ملک عدم ہو گئے ہیں —

سب سے پہلے بادشاہ دہلی بہادر شاہ کا نام آتا ہے - مرحوم نے ۷ نومبر سنہ ۱۸۶۲ ع بمقام 'رنگون' تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا - آپ سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے بعد سے برابر اپنی باوفا بیوی زینت محل کے ساتھ 'رنگون' میں زندگی بسر کر رہے تھے - آپ کے ساتھ آپ کے صاحبزادے جواں بخت بھی تھے - * محمد بہادر شاہ ثانی غازی سنہ ۱۸۳۷ ع میں سراج الدین کے لقب سے اپنے والد ماجد اکبر شاہ ثانی کے انتقال پر تخت دہلی پر جلوہ افروز ہوئے - بادشاہ ہونے سے قبل آپ مرزا محمد علی ظفر کے نام سے مشہور تھے - 'ظفر کی یاد بہت سے دلوں

---

* میں نے اپنے ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ ع کے خطبے میں بادشاہ دہلی کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں —

کو عزیز ہے - وہ تیموری خاندان کے آخری چراغ تھے - قسمت نے ان کے ساتھہ یاوری نہ کی - ادب کے شائقین کو ان کے ساتھہ اور بھی لگاؤ ہونا چاہئے اس واسطے کہ وہ نہایت اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے * -

پچھلے اگست کی پہلی کو لندن میں مہارانی " چند کنور " کا انتقال ہوگیا - وہ پنجاب کے مہاراجہ دلیپ سنگھہ کی والدہ تھیں - باوجود اس کے کہ ان کے صاحبزادے دلیپ سنگھہ نے مسیحی دین قبول کرلیا لیکن مہارانی آخری دم تک اپنے آبا و اجداد کے مذہب پر قائم رہیں - ان کے انتقال پر دو سکھہ افسروں نے احتجاج کی کہ ان کی نعش کو جلایا جائے اور راکھہ کو ہندوستان بھیجا جائے تاکہ سکھہ دھرم کے مطابق وہ گنگا میں ڈالی جائے - لیکن یہ نہیں ہوا ان کے بیٹے " مہاراجہ دلیپ " نے اس کا اہتمام کیا کہ اس موقع پر کوئی رسم نہ برتی جائے نہ مسیحی اور نہ ہندو -

پچھلے اگست کی ۲۱ تاریخ کو نواب سورت میر جعفر علی خاں بھی ملک عدم کو سدھار گئے - ان کا انتقال " سورت محل " ( Surat palace ) میں ہوا - ان کے ساتھہ ان کے دیرینہ رفیق مرزا لطف اللہ رہا کرتے تھے - موصوف اپنی " خود نوشت " کے باعث یورپ میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں - نواب مرحوم انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے - وہ ایک نہایت ہی متین اور فیاض شخص تھے - آپ پہلی مرتبہ سنہ ۱۸۴۴ ع میں انگلستان تشریف لائے تھے - پھر دوبارہ سنہ ۱۸۵۳ ع میں آئے تھے - اس مرتبہ پیرس بھی آئے تھے - پیرس میں بعض لوگوں نے انھیں دیکھہ کر کہا تھا کہ وہ ٹیپو سلطان سے بہت مشابہ ہیں - مرحوم سے میری متعدد بار ملاقاتیں رہیں آپ نے

---

* یہاں ظفر کے بعض اشعار کا فرانسیسی ترجمہ ہے -

مجھہ سے یہ بھی کہا تھا کہ سورت واپس ہونے پر اپنا سفر نامۂ یورپ شائع کریں گے - میں سمجھتا ہوں غالباً وہ اپنے اس ارادہ کو پورا نہ کر سکے* -

آخر میں میں " جان ویٹلی " کے انتقال پر ملال کا ذکر کرتا ہوں - آپ " مالی معاملات " کے مصنف تھے - اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہوچکا ہے اور میں گزشتہ سال اس کا ذکر کرچکا ہوں - آپ " ڈبلن " کے مہا پادری ( Archeveque ) تھے آپ کا انتقال پچھلے اکتوبر میں ۸ تاریخ کو ہوا - ان کی ایک مشہور کتاب ( Lessons on christian evidences ) ہے - اس کتاب میں فلسفہ اور دینیات دونوں کے مسائل سے بحث کی ہے - یہ کتاب لارڈ " سمر " کی ( Evidencey of christianity ) سے بہت کچھہ ملتی جلتی ہے جو خود ایک زمانے میں " ڈبلن "کے مہا پادری رہ چکے تھے - اس آخر الذکر کتاب کا موسیو " مارسلین فرسن " ممبرکونسل نے نہایت شگفتہ فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے † —

ہم لوگوں کو جنھیں ہندوستانی علوم سے دلچسپی ہے خود بخود ہندوستانیوں کے ساتھہ بھی ایک طرح کا لگاؤ پیدا ہو گیا ہے - اس بات میں ہم سب سر چارلس وڈ کے نمونے پر عمل کر رہے ہیں - موصوف

---

*ملاحظہ ہو نواب صاحب مرحوم کا خط جو جنوری سنہ ۱۸۵۵ع کے (Revuede l' Orient) میں شائع ہوا ہے —

† یہ خطبہ چھپنے کے لئے دیا جا چکا تھا جب کہ مجھے اطلاع ملی کہ لارڈ ایلجن کا بمقام دھرم سالہ ۲۰ نومبر انتقال ہوگیا اور ان کی جگہہ سرجان لارنس کام کر رہے ہیں —

وزیر ہند ہیں اور ہندستانیوں کے بھی خواہ ہیں - آپ نے اعلان کیا ہے کہ انگریزی حکومت کے پیش نظر ہندوستان میں ہمیشہ یہ اصول رہے گا کہ ۱۸ کرور مخلوق کے نفع کا خیال رکھا جائے تاکہ تاج برطانیہ کے سایۂ عاطفت میں جو لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں انھیں خوش حالی نصیب ہو - شاہی اعلان بھی اس اصول پر مبنی تھا - انگریزی عملداری میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب کے لئے یکساں قوانین ہوں گے اور کسی قسم کے امتیازات کا لحاظ نہیں کیا جائیگا - ہندوستان میں ایک انجمن قایم ہوئی ہے جس کا نام "برطانوی ہندی انجمن" (British Indian Association) ہے - اس انجمن نے ہندوستانی میں اور دوسری مقامی زبانوں میں اس خیال کی نشر واشاعت کو اپنا مقصد ٹھہرایا ہے کہ انگریزی عملداری کے فوائد و برکات سے ہندوستانیوں کو آگاہ کرے - ابھی حال ہی میں کلکتہ میں اس انجمن کا ایک اجلاس ہوا تھا جس میں "راجہ رادھا کنت دیو" بہادر نے صدارت فرمائی تھی - اس جلسہ میں "سر چارلس وڈ" کی رعایا نوازی پر تشکر کا اظہار کیا گیا - راجہ صاحب ایک نہایت فاضل شخص ہیں - اس موقع پر "راجہ کالی کرشن" نے حسب معمول اردو میں تقریر کی اور "سر چارلس" کی تعریف کی کہ انھوں نے ہندوستانیوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ مجسٹریت کے عہدہ پر پہنچیں اور ملکی نظم و نسق کے اعلیٰ مراتب حاصل کریں - اور دوسرے متعدد لوگوں نے راجہ صاحب کے خیالات کی تائید میں تقریریں کیں اور صاحب وزیر ہند کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کئے جانے کی قرارداد منظور ہوئی —

میں نے آپ صاحبوں کے سامنے ابھی جو واقعات پیش کئے ان سے یقیناً یہ امید بندھتی ہے کہ ہندوستان جو دنیا کے بہترین ملکوں میں سے ہے

، سیحی تہذیب کی بدولت خواب غفلت سے بیدار ہوگا - دن بدن اس کے ادب کو فروغ ہو گا - در اصل ادب کا نشو و نما شروع ہو گیا ہے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ جس طرح آج سارا یورپ اس کے قدیم ادبی شہکاروں کی تعریف میں رطب اللسان ہے اسی طرح وہ دن بھی عنقریب آنے والا ہے جب کہ اس کا موجودہ ادب بھی دنیا سے خراج تحسین حاصل کرے گا —

# پو چوئی

ا ز

( جناب محمد شرف عالم صاحب آرزو جلیلی -
ایم - ایس سی ریسرچ اسکالر راو یلھا کالج ' کٹک )

' پو چوئي ' ملک چین کا جلیل القدر شاعر شہر ' تائی ' ' پوان ' صوبہ " شانسی " میں پیدا ھوا - ایام طفولیت میں اُس کا قیام زیادہ تر شہر " جنگ یانگ " صوبہ " ھوفان " میں رھا - اُس کا باپ درجۂ دوم کا مجسٹریٹ تھا - اُس کا خاندان بہت غریب ' تھا اور تکلیف و مصیبت سے دست و گریباں رھتا تھا —

" پو " نے سنہ ۸۰۱ ع میں " چانگ آن " میں مستقل بوہ و باش اختیار کر لی - یہ شہر شمالی مغربی محاذ پر تھا اور ملک کا سیاسی دارالسلطنت تھا - شہر " لویانگ " جو مشرق میں تھا اور جس کی آب و ھوا معتدل تھی - چین کا معاشرتی دارالسلطنت تھا —

سنہ ۸۰۴ ع میں ' پو ' کے باپ کا انتقال ھو گیا اور سنہ ۸۱۱ ع میں اُس کی ماں بھی اس دارفانی سے کوچ کر گئی - سنہ ۸۱۴ ع میں ' پو ' حکام کے غیض و غضب کا شکار ھو گیا - اُس نے دو میمو ریل لکھے تھے جس میں حکومت کی بعض جارحانہ کارروایوں کو جو تاتاریوں کے چھوٹے سے

گروہ کو زیر کرنے کے لئے کی گئی تھیں - نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا - اُس نے چند نظمیں بھی لکھیں جس میں حکام کے مظالم اور عوام‌الناس کی مصیبتوں کا نقشہ کھینچا تھا - اتفاق سے عین اسی زمانہ میں وزیراعظم " ژوپو اُن ہینگ " کو انقلاب پسند جماعت کے لیڈر " وو لوان چی " نے دن دھاڑے قتل کردیا - " پو " نے بادشاہ کے نام عرضی لکھی اور ملک کی بے چینی کو دفع کرنے کی درخواست کی - اس وقت " پو " شاہزادوں کے استاد کا نائب ناظم تھا - اُس کو اس قسم کی عرضی دینے کا حق نہیں حاصل تھا - دشمنوں کو اُس کے خلاف یہ موقعہ غنیمت مل گیا - انھوں نے ایک اور جرم " پو " پر عاید کیا - " پو " کی ماں کنویں میں گر کر مری تھی - کسی کنویں کے کنارے وہ پھولوں کو دیکھ کر محظوظ ہورہی تھی کہ عالم معویت میں اُس کے پاؤں پھسل گئے تھے - " پو " نے اس کی وفات کے بعد دو نظمیں لکھیں - " پھولوں کی تعریف " میں اور "نیا کنواں "- پو کے دشمنوں نے اُس پر یہ جرم عاید کیا کہ ایسی نظمیں لکھ کر " پو " نے اپنی مُردہ ماں کے ساتھ گستاخی کی - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ " پو " کو جلا وطن کر کے " لیو کیانگ " میں کسی معمولی عہدہ پر سرفراز کیا گیا - تین سال کے بعد اُس کو " چُو نگ چُو " کی گورنری ملی جو اس کے وطن سے بہت دور تھا - " چُونگ چُو " دلفریب باغوں اور خوش نما پھولوں کے لئے مشہور تھا - " پو " کو اِس شہر کے دلکش قدرتی مناظر بھا گئے - سنہ ۸۱۹ ع میں وہ دارلسلطنت کو واپس بلالیا گیا اور دوسرے درجہ کا نائب ناظم بحال ہوا - سنہ ۸۲۱ م میں شہنشاہ " مو سنگ " تخت نشیں ہوا - اُس کی مطلق العنانی نے مُلک کے شمالی مغربی گوشہ میں بغاوت پھیلا دی - " چوئی " نے بادشاہ سے اپنا طرز عمل بدلنے کی استدعا کی - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر

دارالسلطنت سے ہٹا دیا گیا اور اس دفعہ " ہینگ چو " کا گورنر مقرر ہوا - سنہ ۸۲۴ ع میں اُس کی گورنری کا زمانہ ختم ہوگیا اور شہر " لویانگ " کے قریب ایک دیہات " بی تاؤلی " میں اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا - موسیقی اور رقص سے وہ اپنا دل بہلایا کرتا تھا —

سنہ ۸۲۵ ع میں وہ " سو چو " کا گورنر ہوگیا - اس وقت اس کا سن ترپن سال کا تھا - مگر یہاں اُس کا شباب از سرنو بیدار ہوگیا تھا - وہ ہمیشہ دعوتوں اور مجلسوں میں مشغول رہتا - دو سال کے بعد صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے اُس کو یہ جگہ چھوڑ دینی پڑی - اس کے بعد وہ دارالسلطنت میں متفرق عہدوں پر معمور رہا - سنہ ۸۲۹ ع میں وہ " ہونان " کا گورنر ہوگیا —

اس کے بعد تیرہ سال تک وہ معمولی عہدوں پر جابجا معمور رہا - لیکن اب وہ دنیا کے ہنگاموں سے علیحدہ رہنے کی کوشش کررہا تھا - سنہ ۸۳۲ ع میں اُس نے خانقاہ " سیانگ شان " کو مرمت کرایا اور وہیں رہنے لگا - یہ خانقاہ ' مینگ مین " میں تھی جو " لویانگ " سے تھوڑے فاصلہ پر جنوب کی جانب تھا - یہاں دلچسپی کے لئے وہ اپنا روز نامچہ لکھنے لگا - سنہ ۸۳۹ ع کے موسم سرما میں اُس کا بایاں پاؤں فالج کا شکار ہوگیا - چند مہینوں کے بعد وہ اس قابل ہوا کہ لوگوں کے سہارے سے باغ وغیرہ کی سیر کر سکے —

" پو " کی زندگی کا باقی حصہ اپنی مکمل تصانیف کو ترتیب دینے میں صرف ہوا - سنہ ۸۴۶ ع میں اُس نے انتقال کیا اور یہ وصیت کی کہ اُس کا جنازہ شان و شوکت سے نہ نکالا جائے اور اُس کی لاش " سیانگ شان " کی خانقاہ میں دفن کی جائے —

## پوچوئی کے دوست

چینی شاعری کا دار و مدار " دوستی " پر ہے - ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہوتا ہے جس کا تذکرہ وہ اپنی نظموں میں کیا کرتا ہے - " پو " کے دوستوں میں سب سے ممتاز " یوان چین " تھا - ان دونوں میں غالباً سنہ ۸۰۲ ع سے دوستی شروع ہوئی - " پو " کا بیان ہے کہ دوستوں کی تلاش میں اُسے بہت دقت ہوتی تھی - کیونکہ وہ شطرنج یا چوسر وغیرہ سے نہیں واقف تھا جن کے ذریعہ لوگوں سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ملتا - زمانۂ دراز کے بعد اُس نے تین اور دوست حاصل کئے جن سے زندگی بھر ربط قائم رہا - ان میں سے ایک " لیویو سوی " عرف " مینگ تی " شاعر تھا - باقی دو حکام تھے - " لی چین " اور " سوئی سوان لیانگ " —

سنہ ۸۰۵ ع میں " یوان چین " کسی درباری افسر سے اظہار خود داری کرنے پر ' جلا وطن کر دیا گیا - " پو " نے اُس کی جدائی سے متاثر ہوکر حسب ذیل نظم لکھی :—

" میں شہر کی سڑکوں پر نظر دوڑاتا ہوں
سرخ سڑکیں اور اُن کے کنارے سبز اشجار -
مجھے صرف گاڑیاں گھوڑے ' اور سوار نظر آتے ہیں -
میں اُنھیں نہیں پاتا جن کے لئے میرا دل بیقرار ہے -
' کنگ تان ' شہر ' لویانگ ' میں انتقال کر گیا -
اور ' یوان چن ' جلا وطن کرکے ' چنگ من ' بھیجدیا گیا -
ان سبھوں میں جو شمالی جنوبی سڑکوں پر چلتے ہیں -
ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کی قدر میں دوسروں سے زیادہ کرتا -"

سنہ ۸۲۱ ع میں ' یوان چن ' ' چنگ سن ' سے واپس اگیا اور پھر ' پو ' کی زندگی خوشگوار ہو گئی - ' یوان چن ' سنہ ۸۳۱ ع میں انتقال کر گیا —

## پو کی شاعری

' پو ' کا کلام عام فہم اور سلیس ہے - الفاظ اور محاورں کی سلاست اور شستگی کے لئے وہ مشہور ہے - کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی نظمیں کسی بوڑھی کسان پیشہ عورت کو سنایا کرتا تھا ' اور جو الفاظ اُس عورت کی سمجھ میں نہیں آتے انھیں بدل دیتا تھا - اس کے ہمعصروں کی نظموں میں مرصع الفاظ کا استعمال زیادہ ہے —

' کانفیو کیس ' کی طرح ' پو ' کا خیال تھا کہ کسی فن کا حقیقی مقصد صرف تعلیم دینا ہے - اس لئے وہ خود اپنی ہجویہ نظموں کو زیادہ پسند کرتا تھا - پھر بھی اس کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو محض کسی عارضی تاثر کے ماتحت کہی گئی ہوں - اپنی ہجویہ نظموں کے بارے میں " پو " کہتا ہے کہ جب ظالم حکام اور اُن کے مصاحب ان نظموں کو سنتے تھے تو اُن کے چہرے کا رنگ فق ہوجاتا تھا - " پو " کی ہجو گوئی میں مزاح کم اور سنجیدگی زیادہ ہے - اُس کی کسی ہجو میں شاعری کا پلہ نیچا نہیں ہے - اُس کی ہجویہ نظموں کو ہم " منظوم اخلاقی افسانے " کہہ سکتے ہیں —

" پو " نے دوسرے شاعروں کے کلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ' ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف " حسن بیان " کو نہیں پسند کرتا تھا - بلکہ اس کا خیال تھا کہ ہر نظم میں کوئی کار آمد اور مفید " اخلاقی تلقین " ہونی چاہئے —

" پو " کو اپنی زندگی میں جتنی شہرت نصیب ہوئی، شاید ہی دنیا کے کسی اور شاعر کو نصیب ہوئی ہو - اس کی نظمیں زبان زد خاص و عام تھیں - تعلیمی درسگاہوں، عبادت گاہوں اور جہازوں پر اس کی نظمیں کندہ تھیں - جس کسی کو " پو " کی کوئی نظم بھی یاد ہوتی وہ اس کا فخریہ اعلان کرتا اور لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے - مگر یہ ہر دل عزیزی اس کی رومانی نظموں کو نصیب تھی - "یوان چن" کو، ' پو ' ایک خط میں لکھتا ہے : " دنیا میری ان نظموں کی زیادہ تعریف کرتی ہے جنھیں میں خود نہیں پسند کرتا - معاصرین میں صرف تم میری تخیلی نظموں کو سمجھ سکتے ہو - ممکن ہے کہ پھر صدیوں کے بعد کوئی میری نظموں کا سمجھنے والا پیدا ہو "—

' پو ' کی شہرت جاپان تک اس کی زندگی ہی میں پہنچ چکی تھی - جاپان میں اب تک اس کی بہت قدر ہے - یہاں تک، کہ شنطائی مذہب کے پیرو اسے دیوتا تصور کرتے ہیں - برٹش میوزیم میں اس کی تصانیف کی ایک ہی نقل ہے جو جاپان میں سترھویں صدی عیسوی میں طبع ہوئی تھی —

" پو " کی بعض نظموں کے ترجمے دلچسپی سے خالی نہیں ہونگے - اگرچہ ترجمہ سے زبان کی خوبیاں نہیں واضح ہو سکتیں، پھر بھی ہم اس کے تخیل کا مطالعہ کرسکتے ہیں —

" جنونی گیت "

" ہر شخص میں کوئی نہ کوئی فطری کمزوری ضرور ہے -
اور میری کمزوری یہ ہے کہ مجھے شاعری سے رغبت ہے —
میں نے زندگی کی ہزاروں قیود سے آزادی حاصل کر لی ہے -

مگر ابھی تک شاعری کا خبط نہیں گیا —
جب کبھی کسی خوشنما منظر کو دیکھتا ہوں —
یا کسی دوست سے ملاقات ہو جاتی ہے —
تو میں بلند آواز سےکوئی نظم پڑھتا ہوں —
اور ایسا خوش ہو جاتا ہوں کہ گویا میں نے خدا کا جلوہ دیکھ لیا۔
جب سے میں جلا وطن کرکے " سون یانگ " بھیجدیا گیا —
میں اپنا آدھے سے زیادہ وقت پہاڑوں میں گذارتا ہوں —
اور اکثر - جب کوئی نئی نظم تیار کرتا ہوں —
تو میں " مشرقی پہاڑ " کی جانب چلا جاتا ہوں ' —
سفید چٹانوں پر لیٹ جاتا ہوں ' —
جنگلی درختوں کی کسی سر سبز شاخ کو اپنی طرف جھکا لیتا ہوں '
اور میرا جنونی گیت پہاڑوں اور وادیوں میں گونج اُٹھتا ہے —
وحشی جانور ' اور چڑیاں قریب آ کر میرے نغمے سنتی ہیں —
دنیا کی طنز آمیز ہنسی سے بچنے کے لئے '
میں ایسی جگہ پسند کرتا ہوں جہاں انسان کا گزر ہی نہیں " —

---

" لانبا کمبل "

" کتنے غریب لوگ سردی سے ٹھٹھرتے ہونگے ! ہم اُنھیں کیسے بچا سکتے ہیں ؟

صرف ایک آدمی کو سردی سے محفوظ رکھنا کافی نہیں ہے —
کاش میرے پاس ایک بڑا سا کمبل ' ہوتا - دس ہزار فیٹ لانبا جس سے میں بیک وقت سارے شہر کو ملفوف کر لیتا "

"یوان چن" کو خواب میں دیکھ کر"

(یہ نظم "یوان چن" کی وفات کے آٹھ سال کے بعد، "پو" نے کہی تھی)

' میں نے تم کو خواب میں دیکھا ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اِدھر اُدھر سرگرداں رہے'

جب صبح کے وقت میں بیدار ہوا، کوئی اُن آنسوؤں کو روکنے والا نہ تھا جو میرے رومال پر گر رہے تھے'

دریائے 'پینگ' کے کنارے میرا جسم زار تین بار بیمار پڑ چکا ہے *

'سین یانگ †' میں تمہاری قبر کے سبزوں کے لئے آٹھ بار موسم خزاں آ چکا ہے —

تم زمیں کے نیچے دفن ہو اور تمہاری ہڈیاں خاک میں مل گئی ہیں -

میں انسانوں کی بستی میں رہتا ہوں - میرے بال برف کی مانند سفید ہو گئے ہیں —

'آوی' اور 'ہاں لانگ' ‡ نے یکے بعد دیگرے تمہاری اقتدا کی —

عالم بالا میں تم نے اُنھیں بھی دیکھا تھا؟" —

---

جدائی

"کل میں نے سنا کہ فلاں ابن فلاں اس دار فانی سے کوچ کر گیا -

آج صبح مجھے معلوم ہوا کہ فلاں شخص اپنے اعزا کو داغ جدائی دے گیا -

---

* "یوان چن" کی وفات کے بعد

† 'چانگ آن' کے قریب - اس شہر کا جدید نام 'سی نھگان فو' ہے —

‡ 'لی چن' اور 'سوئی سوان لیانگ' کے معروف نام جن سے 'پو' اُنھیں یاد کرتا تھا —

دوستوں اور ملاقاتیوں کا دو تہائی حصہ ،

عالم ارواح میں چلا گیا —

جو گزر چکے ہیں انہیں پھر کبھی دیکھنے کا موقعہ نہیں ملیگا —

افسوس ! اُن کا ، ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا —

جو باقی ہیں ۔ وہ کہاں ہیں ؟

وہ سب منتشر ہیں ۔ ہزاروں میل کے فاصلہ پر

جن سے میں زندگی بھر محبت کرتا رہا —

ان کو میں اپنی انگلیوں پر گن سکتا ہوں ۔ وہ کتنے ہیں ؟

صرف ، ٹنگ ، — ، کوُو ، — ، لی ، اور ، فینگ ، صوبوں کے حاکم ۔ صرف چار اشخاص *

ایک دوسرے کی یاد میں ہمارے بال سفید ہوجاتے ہیں —

اس بزم فانی میں ہم سمندر کی موجوں کی طرح اُفتاں و خیزاں رہتے ہیں —

آہ ! وہ اگلی صحبتیں ۔ وہ محفلیں ۔ وہ بزم آرائیاں ،

ہمیں اس پرا گندہ حالت میں چھوڑ کر فنا ہوگئیں !

ہم پھر کب ملینگے ! اور ساتھ شراب پیئں گے —

اور مسکراکر ایک دوسرے کو محویت سے دیکھیں گے ؟"

---

* " پو " کے چار دوست جن کا تذکرہ اس مضمون میں ہے ، " یوان چن " ، " سوئی سوان لیانگ " — " لیوبو سی " — " لی چن "

( اُردو جامعہ )

# اُردو کے اَن پڑھ شاعر

از

[ جناب مرزا فدا علی صاحب ' خنجر ' لکھنوی ]

## قدرت علی

ان کا نام میر قدرت علی تھا - عہد شاہی میں ' لکھنؤ میں پیدا ہوئے - پڑھے لکھے بالکل نہ تھے مگر نہایت با وضع' احباب پرست ' زندہ دل ' سرنجھ سرنجاں ' خلق مروت میں اگلوں کا صحیح نمونہ' وضع قطع بھی قدیم شرفاے لکھنؤ کی سی تھی - بوکا پائجامہ' کبھی مشرو یا گلوبند کا' سفید کرتا اُس پر باریک انگرکھا یا اچکن' جامدانی کی عبا' جاڑوں میں یہ لباس سرمائی کپڑوں سے بدل جاتا تھا - گھر سے نکلتے تو ہاتھ میں جریب ضرور رہتی - چکن کا کارو بار کرتے تھے' قرب و جوار کے کاری گروں سے مال تیار کراتے اور جب ذخیرہ جمع ہو جاتا تو ممالک ہند میں دورہ کرکے تجارت کرتے - اکثر بلاد ہند کی سیاحی کرچکے تھے - گفتگو میں الفاظ فصیح اور لب و لہجہ شیریں ہوتا اور کچھہ ایسی دل کشی و دلچسپی ہوتی کہ سننے والا گھنٹوں سنا کرتا لیکن سیری نہ ہوتی - حافظہ حد سے زیادہ قوی تھا - شعراے ماضی و حال کے ہزار ہا اشعار ازبر تھے - اردو ہو یا فارسی اچھا شعر ان کی

بیاض حافظہ میں محفوظ رہتا ۔ " محشر صاحب " کا بیان ہے کہ ان دنوں ان کا بارہ تیرہ برس کا سن اور طالب علمی کا زمانہ تھا' شاعری کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ تھی اور میر صاحب اپنے شباب کو شیب سے بدل چکے تھے ۔ جناب " محشر " کے نانا مرحوم سے نہایت درجہ خلوص و ارتباط تھا ' اکثر صحبتیں رہا کرتیں ۔ بچوں سے بہت مانوس تھے' جب کبھی ان میں آ نکلتے تو ایسی باتیں کرتے جو ہم سنوں کو زیبا ہیں ۔ پھر لطف یہ کہ وہ باتیں ایسی با اثر اور مزے دار ہوتیں کہ ان کا سلسلہ ٹوٹنا گوارا نہ ہوتا ۔ ایک مرتبہ میر صاحب تشریف لائے' حضرت " محشر " اور تین چار ان کے ہم سبق و ہم عمر طالب علم موجود تھے ' کتابیں کھلی ہوی آگے رکھی تھیں اور سبق یاد ہورہے تھے لیکن میر صاحب کے آتے ہی کتب درسیات گردان دئے گئے اور سب کے سب میر قدرت علی کی پر کیف باتیں سننے میں مصروف ہو گئے وہ کبھی ان کے قلوب کو اشتیاق کی چاشنی سے بھر دیتے' کبھی لب و لہجہ اور انداز بیان ظریفانہ ہو جاتا جس پر ہنسی ضبط کرنا دشوار تھا ۔ اثنائے گفتگو میں شعر و سخن کا چرچا چلا تو فرمایا " تم لوگوں کو اپنے حافظے پر بڑا ناز ہے' ایک دن مجھ بوڑھے سے بیت بازی ہو جائے میں بھی تو دیکھوں تم لوگ کتنے پانی میں ہو' لیکن شرط یہ ہے کہ دو میدان ہوں ایک دن اردو اور ایک دن فارسی کے اشعار پڑھے جائیں ' اردو ' فارسی شعروں کو کبھی کبھی کرکے پڑھنا مجھے پسند نہیں ۔ یہاں کیا عذر تھا ' یہ تو عین خواہش تھی فوراً اس ادبی الٹیمیٹم کو قبول کر لیا ۔ دن بتائے گئے ۔ میر صاحب حسب وعدہ تشریف لائے ۔ بعد کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر شعر خوانی شروع ہوئی ۔ چار دہیں طالب علم ایک جانب اور ایک اُسی مگر طلباء

شاعر ایک طرف - اسی شغل میں آدھی رات گذر گئی لیکن میر صاحب کی یاد کا خزانہ اُسی طرح پر تھا ! چار نوجوان طالب علم عاجز ہونے لگے - نتیجہ یہ ہوا کہ صبح چار بجے ہزیمت قبول کرنا پڑی —

یہ تو اُس زبان کا حال تھا جس کی آغوش میں پرورش پا رہے تھے ' اب فارسی کا مآل کار سنئے ' وہ میدان بھی میر قدرت علی کے ہاتھ رہا ! —

میر قدرت علی محض حافظ اشعار ہی نہ تھے بلکہ انھیں قدرت نے طبع سلیم و ذہن رسا عطا کیا تھا - فی البدیہہ گوئی میں اتنا زبردست کمال حاصل تھا کہ اساتذہ فن بھی مقابلے میں لائے جائیں تو میر صاحب کا پلہ گراں رہے - طبیعت میں دریا کی سی روانی تھی - کہنے پر آتے تو بر جستہ نظم کے موتی پروتے چلے جاتے - مذاق سخن ستھرا تھا لیکن نام و نمود کی خواہش مطلق نہ تھی - کبھی اپنے آپ کو زمرۂ شعرا میں داخل کرنا پسند نہ کیا نہ کلام جمع کرنے کی فکر ہوئی - اُن کی شاعری محض تفنن طبع اور اقتضائے وقت پر موقوف تھی - جب کہیں اشعار پڑھے جانے لگے ' اُن کی حاضر طبیعت نے درفشانی شروع کردی - ادھر صحبت برخاست ہوئی اور اُدھر وہ اشعار بھی نابود ہو گئے - حضرت محشر کا قول ہے کہ میں نے بارہا اصرار کیا کہ آپ اپنے اشعار لکھوالیا کیجئے ' بلکہ اُن کی یہ خدمت خود انجام دینے کا وعدہ کیا لیکن میر صاحب نے قطعی انکار کرتے ہوئے ملیح کیا کہ میرے شعر نہ لکھنا ' یہ بھی فرمایا " میاں ! میں جاہل آدمی ' شاعری کیا کروں گا ' یہ جو کچھ ہے تم لوگوں کو خوش کرنے کا سوانگ ہے ' بھلا ! میرے اشعار بھی اس قابل ہیں جو لکھے جائیں - اب " محشر صاحب "

اُس وقت کو یاد کر کے متاسف ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں " مجھ سے یہ ایسی غلطی ہوئی جس کا قلق ہمیشہ کانٹے کی طرح دل میں کھٹکا کرتا ہے کیوں کہ مجھے ایسے موقع حاصل تھے کہ اگر چاہتا تو میر قدرت علی کا بہت سا کلام لکھ لیتا ' لیکن اُس زمانے میں بالکل خیال نہ آیا اور اب حافظہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ لاکھ لاکھ غور کرتا ہوں لیکن اُن مرحوم کا کوئی شعر یاد نہیں آتا ۔

میر قدرت علی نے کبھی اس منشا سے شعر نہیں کہا کہ وہ اُس کے ذریعے سے شاعر متصور کئے جائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسی اُستاد فن کے سامنے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا جو کچھ کہتے تھے اُس سے صرف تفریح منظور ہوتی یا سامعین کی ضیافت طبع مراد ہوتی ۔ اُن کا سارا کلام ضایع ہو چکا اب ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہوتا ۔ جس طرح عرصہ ہوا ہوائے اجل نے اُن کا چراغ حیات گُل کر دیا دنیا کے پردے پر اب وہ شریف ہستی موجود نہیں اُسی صورت سے باد مخالف نے اُن کا سرمایۂ زندگی ( کلام ) بھی ناپید کر دیا ۔

جب سے جناب محشر نے اِن مرحوم کے حالات بیان کئے تھے مجھے اُسی روز سے میر صاحب مرحوم کے کلام کی تلاش و جستجو تھی ۔ چوں کہ اُن کے پس ماندوں سے ناواقف محض تھا ۔ لہذا تذکروں کی ورق گردانی شروع کی ۔ اس کام میں تحصیل حاصل کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا ۔ یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ایسے ذہین شخص کے احوال سے تذکرہ خالی رہے ۔ حسن اتفاق سے ایک پرانی بیاض ( دیمک خوردہ ) ہاتھ لگ گئی جس میں کسی شوقین نے اکثر شعرا کے کلام کا انتخاب لکھا تھا ' اس کی سیر میں ایک شعر نظر پڑا جو دیمک کے زہریلے اثر

سے کسی قدر محفوظ تھا شعر کے اوپر " میر قدرت علی چکن فروش " تحریر تھا ' فوراً میرا خیال میر صاحب کی جانب متوجہ ہوا - نہ معلوم وہ یہی بزرگ ہیں یا کوئی اور مگر قیاس کی بنا پر انھیں میر صاحب کو فرض کرتے ہوئے اِن کے نام سے وہ شعر لکھتا ہوں - اِس سے میری غرض یہ ہے کہ حالات زندگی کے ساتھہ ایک شعر بھی ناظرین تذکرہ کو اِن کی یاد دلاتا رہے —

بتلائیے تو دل کو مرے کیا کیا حضور
مٹھی میں ہے کہ آپ کی زلف رسا میں ہے

## کبیر

اس مشہور و معروف عالی دماغ و نازک خیال شاعر نے سنہ ۱۳۹۸ ع میں بمقام کاشی پوری ( بنارس ) مسمی نورعلی یا نیرو کے گھر میں جنم لیا ( جو کپڑا بننے کا پیشہ کرتا تھا ) اور رفتہ رفتہ قوت شاعری کی استمداد و استعانت سے او تار کا مرتبہ حاصل کر کے ' ترقی کی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا شہرت و ناموری کی اُس حد تک پہنچ گیا جس کا دانتدا حیات جاوید کی بگڈنڈی سے جا ملتا ہے

کبیر کی ولادت کے باب میں مختلف روائتیں وارد ہوئی ہیں ، اہل ہنود مورخین کا بیان ہے کہ یہ ایک بیوہ کا ہونہار فرزند ہے جو دَر اصل گرو " رامانند جی " کی دعا کا خوش گوار نتیجہ ہے اور جسے بیوہ نے بد نامی کے خوف اور سوسائٹی کی طعنہ زنی کے خیال سے لہری تالاب ( لہر تارہ ) معروف بہ کبیر تلائی میں ڈال دیا تھا - حسن اتفاق سے اُسی روز نیرو جلاہا اپنی دلہن کو اُس

کے مہکے سے رخصت کراکے اپنے مکان لئے جاتا تھا - راستے میں دلہن کو پیاس معلوم ہوئی اور وہ اپنے خاوند کی اجازت سے تالاب پر پانی پینے گئی - وہاں بچھہ کو پڑا پایا اور گود میں لئے ہوئے شوہر کے پاس واپس آئی - نیرو نے ابتداً ' تو بچھہ کو اپنی حمایت و نگرانی میں قبول کرنے سے پس و پیش کیا لیکن بعد میں رضامند ہو گیا اور گھر لاکر کبیر علی یا کبیر نام رکھا - آگے چل کے یہی خوش نصیب بچھہ اہل ہنود کی عقیدت مندی سے کبیر داس کے لقب سے روشناس ہوا —

نیرو کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اُس نے کبیر کو (جو خواہ صلبی فرزند ہو یا بقول اہل ہنود دستیاب شدہ بچھہ) مثل اولاد کے پرورش کیا - اُس کے گھر میں پشتہا پشت سے کپڑے بننے کا کام ہوتا آتا تھا لہذا کبیر کو بھی بجائے علمی تعلیم کے آبائی پیشہ سکھایا اور وہ نیرو کی طرح جلاہے کا کام کرنے لگا - اس کے علاوہ بھی بہت سی روائتیں ہیں جن میں کثرت سے عقائد شامل ہیں اور اُن سے مورخانہ طریقہ پر کوئی نتیجہ اخذ کرنا بہت دشوار ہے —

اس وہبی شاعر نے جس گھر میں جنم لیا تھا وہاں اصولاً علم و فضل کا چرچا مطلق نہ تھا ' شب و روز تانے بانے اور کرگے کا مشغلہ جاری رہتا اور یہی اُن لوگوں کی معاش تھی - لیکن مبداء فیاض نے کبیر کو فطری ذہانت و ذکاوت عطا کی تھی اُس کی فلسفیانہ طبیعت قدرت کے لا تعداد مناظر کو عمیق نظروں سے دیکھتی اور اُن سے قابل قدر و سبق آموز نتائج پیدا کرتی - یہ سچ ہے کہ خیالات عالیہ کسی کی میراث نہیں ' خزانۂ قدرت جسے یہ دولت عطا کرتا ہے اُسے ملتی ہے - چنانچہ کبیر صغر سنی ہی میں ایسے ایسے قادر تخیلات پیش کرنے لگا

کہ اُس عہد کے علما و فضلا افراط حیرت سے انگشت بدنداں ہوگئے ۔ طبیعت میں تصوف حد درجہ موجود تھا ' اخلاقی و تمدنی مضامین سہلاب کی طرح اُمڈا کرتے ' معمولی معمولی باتوں سے بڑے بڑے نتائج نکال لینا اس کی طبع خدا ساز کا ادنیٰ کرشمہ تھا ۔ یہی سبب ہے کہ منھ سے نکلتے ہی اُس کی بانیاں اور دوہے زبان زد خاص و عام ہوجاتے ' گلی کوچوں میں اشعار پڑھے جاتے پھر لطف یہ کہ ہر طبقے میں اُس کا کلام مقبول اور دل نشین تھا ۔ اگر عوام کی صحبتیں اس کی بانیوں سے گونجتی سنائی دیتیں تو خواص کی مجلسیں بھی اُس کے دوہوں سے رشک گلزار نظر آتیں ۔ ایک طرف عشق طینت طبائع اُس کے کلام سے لطف اندوز ہوتے تو دوسری جانب مرتاض زاہد اور خشک طبیعت پنڈت بھی اُس کے اشعار کو شمع معرفت الٰہی تصور کرتے ۔ مختصر یہ کہ اُس کے کلام کی دھوم تھی اور زمانہ شوق کا دامن پھیلائے اُس کے چمنستان مضامین کی گل چینی میں مصروف تھا —

کبیر مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا اور اہل ہنود کے طبقے میں قابل پرستش ٹھہرا ۔ اس کی بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اُس میں تعصب کا نام تک نہ تھا ۔ جس طرح مسجد کے سامنے سر عبودیت خم کرنا اُس کا اصل ایمان تھا اُسی طرح مندروں اور شوالوں کو پرنام کرنا واجب و لازم جانتا تھا ۔ اُس نے کبھی بھولے بسرے بھی ہندو مسلم قوموں میں تفریق نہیں کی ۔ مخلوق کو ایک خالق کی خلقت تصور کیا اور ہر ایک سے برادرانہ سلوک سے پیش آیا جیسا کہ خود اُس کے مندرجۂ ذیل کلام سے ثابت ہے —

آؤں گا نہ جاؤں گا مروں گا نہ جیوں گا گرو کے ساتھ امیر س پیوں گا
کوئی پھیرے مالا کوئی پھیرے تسبی دیکھو رے لوگو دونوں کسبی

کوئی جاوے مکہ کوئی جاوے کاشی دونوں کے گلے بیچ پر گئی پھانسی
کوئی پوجے مڑیاں کوئی پوجے گوراں دو او کی مڑیاں ہیر لیئی چوراں
کہتے کبیر سنو نرلوئی
ہم نہ کسی کے نہ ہمارا کوئی

کبیر اُن لوگوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا جو مذہبی تعصبات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں - اُس کی یہی بے تعصبی بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ گئی کہ وہ اہل ہنود کے اعتقاد میں واجب التکریم و قابل پرستش دیوتا اور مسلمانوں میں اہل اللہ کے مرتبے پر فائز ہوا —

کبیر کے مزاج میں اول سے فقیری کا رنگ بیش بیش تھا جس نے بعد میں اُس کا آبائی پیشہ ترک کراکے سجادہ نشین اور عابد و زاہد بنادیا —

کبیر کی شادی بھی ہوئی اور دو اولادیں بھی پیدا ہوئیں لیکن خرق عادات نے اُسے جس درجۂ عالیہ پر پہنچا دیا تھا اُسے دیکھتے ہوئے بہتوں نے اُسے نوع انسانی سے جدا کرکے خالقت ملکوتی تسلیم کیا اور جو رسوم خاکی نژاد انسانوں میں رائج ہیں اُن سے کلیتہً مستثنا خیال کیا - اسی وجہ سے ایک بڑا گروہ کبیر کے عیال دار ہونے کا منکر ہے - جس طرح بیسیوں روایتیں اُس کی ولادت کے بارے میں پیش کرتا ہے اُسی طرح مناکحت کے معاملے میں بھی بہت کچھ اختلاف سے کام لیتا ہے اور اُس کے کلام کا وہ حصہ ثبوت میں پیش کرتا ہے جو عورتوں کی طرف سے نفرت و حقارت پیدا کرنے کو تصنیف ہوا ہے اور اسی دلیل سے اُس کے دامن کو علائق کی آلودگی سے بری ثابت کرنے کی سعی سے کام لیتا ہے - اس جگہہ کچھہ کلام نقل کیا جاتا ہے —

ناری کی جھائیں پڑت ' اندھا ہوت بھجنگ
کبیر تن کی کون گت ( جو ) نت ناری کے سنگ

---

کامنی ' سندر سر پنی ' جو چھیڑے تاہی کھائے
جو گرو چرنن راچیا ' تن کے نکٹ نہ جائے

---

ایک ناری ایک نا گنی ' اپنا جایا کھائے
کبھوں سر پر ہینکسی ' اوجے ناگ بلائے

---

نینن کا جو پائی کے ' گاڑھے باندھے کیس
ہاتھوں سہلدی لائے کے باگھنی کھایا دیس

---

پر ناری پونی چھری مت کوئی لاوے انگ
راون کے دس سر گئے ' پر ناری کے سنگ

---

اسی طرح اکثر اشعار سے وہ نفرت ظاہر ہوتی ہے جو کبیر کے دل میں جنس اُناث کی طرف سے موجود تھی —

کبیر کی شاعری میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ الفاظ کے عام معنی سے قطع نظر کرکے دوسرے معنی پیدا کر دیتا ہے - جو کلام تحت میں دیا جائے گا اُس سے کبیر کا طبیعی رنگ معلوم ہو گا ادنیٰ باتوں سے اعلیٰ نتائج نکالنا ہی وہ وصف ہے جس نے اس کے کلام کو حسن قبول عطا کر دیا —

ٹھگنی کا نیتا جھمکاوے تیرے ہاتھ کبیر نہ آوے

کدو کاٹ سرد نگ بنایا ' نیبو کاٹ سجیرا
پانتر تریا منگل گاوے ' ناچے بالم کھیرا

بھینس پدسنی چوھا عاشک ' مینڈک تال بجاوے
چولا پہر گدھیا ناچے ' اونٹ بسن پد گاوے

روپا پہرے روپ دکھاوے ' سونا پہن رجھاوے
گلے ڈال تلسی کا مالا ' تین لوک بھر ماوے

آم چڑھے مچھلی پھل توڑے کچھوا چن چن لاوے
کہیں کبیر سنو بھائی سادھو برلا ارتھ لگاوے

اس میں شک نہیں کہ کبیر کے صوفیانہ مذاق نے اُسے مجرد زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی ہو گی مگر اُس کے عقیدت مند گرد و پیش سے روگردانی کرکے دیکھا جائے تو کبیر کی شادی ہونا امر مسلمہ ہے —

'کبیر' کی بیوی کا نام 'لوئی' تھا جس کے معنے 'کمبل' کے ہیں اور لوئی ایک قسم کے پھول کو بھی کہتے ہیں - اس کے متعلق بھی مختلف باتیں مشہور ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ ایک روز ایک سادھو نے اُسے دریا سے نکالا تھا جو کمبل میں لپٹی ہوئی کہیں سے بہتی چلی آتی تھی - اسی سادھو نے اس لڑکی کو اولاد کی طرح پال پوس کر بڑا کیا - جب 'لوئی' سن تمیز کو پہنچی اور سادھو کا آخیر وقت آ پہنچا تو اُس نے بطور وصیت لوئی کو چند ہدایتیں کیں اور کہا کہ وہ اُس وقت تک اس جگہ سے کہیں نہ جاے جب تک اس کا جائز لے جانے والا نہ آئے - جو شخص اسے لینے آئے گا وہی اس کا شوہر ہوگا اور اس کی شناخت یہ بتائی کہ وہ اس کے تمام سوالوں کا جواب صرف ایک کلمے سے دے گا - چنانچہ سادھو کی وفات کے بعد بھی لوئی وہیں مقیم رہی - اس کا دستور تھا - کہ جو

مسافر یا فقیر راستہ سے گزرتا اُسے اپنی جھونپڑی میں مہمان کرتی، خاطر و مدارات سے پیش آتی اور رخصت کردیتی - ایک دن تین چار سادھو مہمان تھے اور کبیر بھی پہنچ گئے تھے - لوئی نے ہر سادھو کے سامنے علحدہ علحدہ دودھ کا ایک ایک پیالا پیش کیا اور سب نے تو اپنا اپنا ظرف خالی کرکے رکھ دیا لیکن کبیر نے اپنے حصے کے دودھ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا - جب لوئی نے دعوت قبول کرنے کا اصرار کیا تو جواب دیا - " دریا پار سے ایک سادھو آرہا ہے یہ اس کے واسطے بچا رکھا ہے "- جملہ تمام ہوتے ہی ایک سادھو وارد ہوا اور وہ دودھ اُسے دیا گیا - لوئی کبیر کی اس غیب دانی سے نہایت متاثر ہوی اور دریافت کیا " آپ کا نام " جواب ملا کبیر پتہ ٹھکانا اور کئی سوالوں کا جواب صرف لفظ کبیر سے دیا گیا - جس سے لوئی کو اس سادھو کی وصیت یاد آ گئی اس نے اسی وقت جھک کر کبیر کے چرن چھوئے اور کل حال بیان کیا اور کبیر کے ساتھہ چلی آئی —

کبیر سے لوئی کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے ایک بیٹی اور ایک بیٹا - بیٹے کا نام کمال اور بیٹی کا نام کمالی تھا - اس میں کلام نہیں کہ کبیر عیال دار تھا - اگرچہ عورتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی نہ تھا نہ ان سے محبت کرنا پسند کرتا تھا جیسا کہ خود کہتا ہے —

ناری تو ہم بھی کری، جانا نہیں بچار
جب جانا تب پیر ہری، ناری بڑی بکار
جہاں جرائی سنہ ری - تو جنی جائے کبیر
اُوڑی کہ بھسم جو لاگ سی، سونا ہوئے سریر

چھوٹی موٹی کا منی ' سب ھی بس کی بیل
بٹیری مارے داؤں دے ' یہ مارے ھنس کھیل

---

کبیر نے بعض ممالک کی سیر بھی کی ھے اور سیاحت میں جو تجربات حاصل ھوئے اُنھیں فلسفیانہ رنگ سے دل چسپ پیرائے میں بیان کیا ھے - کبیر نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی اور شاعری کو شعار بنایا - سن کے ساتھہ خیالات عالیہ بڑھتے گئے اور زمین سخن میں ایسی ایسی نادر میناکاری کی جو اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتی - کلام میں ھر طرح کا رنگ موجود ھے - تصوف تو خاص چیز ھے جو ھر نظم میں جھلک دکھاتا ھے - اس کے ماسوا اخلاق ' تمدن ' معاشرت ' پند و نصائح کی بھی کچھہ کمی نہیں - اس ذھین و طبع اور وھبی شاعر نے ضلع بستی کے ایک گاؤں مگھہ میں ایک سو بیس۰ سال کی عمر پا کر سنہ ۱۵۱۸ ع میں وفات پائی اور اپنی یادگار میں اپنا زندۂ جاوید کلام چھوڑ گیا - چوں کہ بھاشا زبان کا شاعر تھا جو اُردو سے ملتی جلتی ھے اس لئے نمونتاً تھوڑا کلام نقل ھوتا ھے - حسن تخیل و ندرت مضامین قابل لحاظ ھے —

رنگی کو نارنگی کہیں ' بنے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں ' دیکھہ کبیرا رویا

---

من کو ھارے ھار ھے ' من کو جیتے جیت
کہہ کبیرا پیو پائے من ھی کی پرتیت

---

من پانچوں کے بس پڑا من کے بس نہیں پانچ
جت دیکھوں تت دؤں لگی چت بھاگوں تت آنچ

---

من مرید سنسار ہے ، گرو مرید کوی سادھ
جو ما نے گرو بچن کو ، تا کا متا آگادھ

---

من چلے سو ما نبا ، بے حد چلے سو سادھ
حد بے حد دونوں تجے ، تا کا متا آگادھ

---

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ ماں ثابت رہا نہ کوئے

---

چلوں چلوں سب کوی کہے ، پہنچے برلا کوئے
ایک کنک اردکا ملے ، در گم کھاتی دوئے

---

پر ناری کے راچنے ، سیدھا نر کئے جائے
تنکو جم چھوڑے نہیں ، کوتن کرے اُپائے

---

آپو آپ چیتے نہیں ، کہو تو رسوا ہوئے
کہیں کبیر جو آپو نہ جاگے نا ست آست نا ہوئے

پر گٹ کہوں تو مار یا ' پردے لکھے نہ کوئے
سنہا چھپا پوار تر ' کو کھہ بیرائی ہوئے

---

کلی کھوٹا جگ اندھ ہیرا شبد نہ مانے کوئے
جا ہی کہوں ہت اپنا ' سو اُٹھہ بیری ہوئے

---

من کے متے نہ چالئے ' من کے متے انیک
جو من پر اسوار ہے ' سو سادھو کوئی ایک

---

## گلشن

گلشن بیگم نام گلشن تخلص - لکھنؤ کی باشندہ ' شریف خاندان ' عفت پرست و عصمت مآب - نکبت و افلاس نے امارت کے خواب فراموش کردئے . عسرت و تنگ دستی میں بسر ہوتی - جوانی میں غم بیوگی نصیب ہوا - مدت تک کس مپرسی کے عالم میں پر الم زندگی تیر کی . سنا جاتا ہے سیلے پرونے کے کاموں میں کافی دستگاہ تھی - چکن خوب کاڑھتیں ' کتاؤ کے فن میں کامل ملکہ رکھتیں ' ایام ضعیفی اُجرتی کپڑے سی سی کر بسر کئے - اولاد یں اُن کے سامنے ہی دنیا سے چل بسیں جس سے دل درد مند اور کلیجہ چھلنی ہو گیا - کچھہ مدت ہوئی دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا —

شاعری کا شوق بہت کم تھا لیکن حسن اعتقاد کبھی کبھی نوحہ و سلام کہوا دیتا - مدت العمر میں چند مرتبہ غزل کہنے کا بھی اتفاق ہوا شاید

یہی ابتدا اور یہی انتہا ئے غزل کو ئی ہے - دو شعر دستیاب ہو ئے جو لکھے جاتے ہیں —

تقدیر کی جفائیں ' ستم آسماں کے ہیں
کب تک لڑیں گے ان سے ہم ایسے کہاں کے ہیں

چپ چاپ کر بلا کی طرف بس چلی چلو
' گلشن ' یہ کیوں کہو کہ ارادے کہاں کے ہیں

# ادبیات

## ( از ٹیگور )

۲

### ادبیات کا مسالا

( جس کا ترجمہ اصل بنگالی سے پنڈت ونشی
دھر صاحب ودیا لنکار ' لکچرار اورنٹل آباد کالج نے کیا )

صرف اپنی مسرت کی خاطر لکھنے کا نام ادبیات نہیں ہے بعض لوگ نظم لکھ کر کہتے ہیں کہ جس طرح ایک پرندہ اپنی مسرت کی ترنگ میں چہچہاتا ہے اسی طرح شاعر کے کلام کا وجود اسی کے اپنے واسطے ہوتا ہے گویا پڑھنے والے اُسے چھپ کر سنا کرتے ہیں —

یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ کسی پرندے کا خیال گاتے وقت اپنی ہم جنس جماعت کی طرف نہیں ہوتا اگر ایسا نہیں ہے تو نہ سہی - اس بات پر بحث کرنا فضول ہے لیکن مصنف کے کلام کا مطمح نظر پڑھنے والوں کی جماعت ہوتا ہے —

اِسی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف کا کلام بناوٹی ہو جاتا ہے اور نہ یہ کہنے میں ہمیں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے کہ ماں کا دودھ اپنی اولاد کے لئے ہے اور اسی وجہ سے وہ جوش مار کر خود بخود نکلتا ہے -

بعض لوگ خاموش شعر کوئی اور اندرونی جذبات کے تلاطم ہی کو شاعری خیال کرتے ہیں جو لکڑی جلتی نہیں ہے اگر اسے آگ کہیں تو جو انسان آسمان کو دیکھ کر اسی کی طرح خاموش ہوجاتا ہے اسے شاعر کہنا بھی ویسا ہی ہے - اشاعت ہی

ادبیات ہے - دل کی اندرونی تہ میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس پر غور کرنے سے دوسرے انسانوں کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچتا - بھنڈار میں کیا جمع ہے اس کا اندازہ لگانے میں دوسرے لوگوں کو کوئی نفع یا نقصان حاصل نہیں ہوتا - ان کو تو متھائی دست بدست ملنی چاہئے —

ادبیات میں دلی جذبات کے اندرونی جوش کی بھی یہی حالت ہے - ہمیں یہی تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ تسلیم کرکے ہی غور کرنا پڑے گا کہ کلام خود مصنف کے لئے نہیں ہوتا —

ہمارے دلی جذبات کا یہ ایک قدرتی رجحان ہے کہ وہ بہت سے دلوں تک پہنچنا چاہتے ہیں - ہم قدرت میں دیکھتے ہیں کہ حیوانات کے اندر بڑھنے اور ہمیشہ قائم رہنے کی مسلسل کوشش جاری ہے جو حیوان اپنی اولاد کے ذریعہ خود کو جتنا بڑھا کر جتنی زیادہ جگہ گھیر سکتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کی زندگی کا حق بڑھ جاتا ہے گویا وہ اپنی ہستی کو اتنا ہی زیادہ حقیقی بنالیتا ہے —

انسان کے دلی جذبات میں بھی ایسی ہی ایک تحریک ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ حیوانات کا حق ملک اور وقت پر ہوتا ہے اور دلی جذبات کا حق دل اور وقت پر - دلی جذبات کا کام بہت سے دلوں کو ایک عرصہ تک اپنے زیر اثر رکھتا ہے —

صرف اسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے کتنے ہی قدیم زمانے سے، کتنے ہی اشاروں میں، کتنی ہی زبانوں میں، کتنے ہی قسم کے خطوں میں کتنے ہی پتھروں کی کھدائیوں میں، کتنی ہی دھاتوں کی ڈھلائیوں میں، کتنے ہی چمڑوں کی بندھائیوں میں، کتنے ہیں پیڑوں کی چھالوں میں، پتوں میں، کاغذوں میں، کتنی ہی رنگ کار برشوں میں، کتنی ہی چھینیوں سے، قلموں سے، کتنی مصوری اور کیا کچھ کوشش نہیں کی گئی ہے - بائیں طرف سے دائیں طرف اور دائیں طرف سے

بائیں طرف، اوپر سے نیچے کو ایک سطر سے دوسری سطر میں کیا کیا نہیں کیا گیا؟ میں نے جو کچھہ سوچا ہے، میں نے جو کچھہ محسوس کیا ہے وہ نہیں رہے گا، وہ ایک دل سے دوسرے دل میں، ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں منتقل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہوا اور بہتا ہوا چلے گا - ہمارا گھر، ہمارا سامان وغیرہ، ہمارا جسم، ہمارے سکھہ دکھہ کے اسباب سب کچھہ مٹ جائیں گے، صرف میں نے جو کچھہ غور کیا ہے، جو کچھہ محسوس کیا ہے وہ ابدالاباد تک انسان کے جذبات اور انسان کی عقل کا سہارا لے کر ذی روح دنیا میں زندہ رہے گا —

وسط ایشیا کے ریگستان گوبی کے ریتیلے ٹھیر میں سے جب معدوم انسانی جماعت کے متعلق بھولے ہوے قدیم زمانے کی ایک پھٹی پرانی کتاب باہر نکل پڑتی ہے تب اس کی غیر معروف زبان کے غیر معروف حروف کے بیچ میں سے کونسا درد ظاہر ہوتا ہے کس وقت کی کس زندہ دل کی تحریک آج ہمارے دل کے اندر داخل ہونے کے لئے بے تاب ہے ؟ جس نے لکھا تھا وہ نہیں ہے، جس بستی میں لکھا گیا تھا وہ بھی نہیں رہی لیکن انسان کے دل کا جذبہ انسان کے راحت و الم کے اندر پرورش پانے کے لئے ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں آکر خود کو روشناس نہیں کرسکتا، اپنے دونوں بازوں کو پھیلا کر منہ کی طرف دیکھہ رہا ہے —

دنیا کا سب سے نیک شہنشاہ اشوک اپنی جو باتیں مسلسل آنے والی دنیا کو ہمیشہ سنانا چاہتا تھا ان کو اس نے پہاڑ کے جسم میں کھودیا تھا - وہ سوچتا تھا کہ پہاڑ کسی وقت مرے گا نہیں، ہٹے گا نہیں، ابد کے راستے کے کنارے ہمیشہ کھڑا رہ کر نئے نئے زمانے کے مسافروں کو ایک بات ابد تک دہرا دہرا کر سناتا رہے گا - اس نے پہاڑ کو اپنی بات کے کہنے کی ذمہ داری سونپ دی تھی —

پہاڑ وقت اور بے وقت کا کچھہ بھی خیال نہ کرکے اس کی زبان کا حامل بنتا چلا آیا ہے - کہاں اشوک؟ کہاں پاٹلی پتر؟ کہاں فرض کا احساس رکھنے والے ہندوستان

کا وہ شاندار زمانہ؟ لیکن پہاڑ اس زمانہ کی ان کتنی ہی باتوں کو غیر معروف رسم‌الخط میں، غیر مروج زبان میں آج بھی بول رہا ہے - کتنے دنوں تک وہ جنگل کو اپنی داستان سناتا رہا ہے - اشوک کی وہ عظیم‌الشان زبان بھی کتنی صدیوں تک انسانی دلوں کو گونگے کی طرح اشاروں سے بلاتی رہی ہے - راستے سے راجپوت گئے، پٹھان گئے، مغل گئے، برگی * کی تلواریں بجلی کی طرح نہایت تیزی سے ایک سمت سے دوسری سمت میں علم کے چابک لگاتی ہوئی گزر گئیں لیکن کسی نے پلٹ کر ان اشاروں کا جواب نہیں دیا - سمندر پار کے جس معمولی سے جزیرے کا اشوک نے کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا - اس کے کاریگر جب پتھروں کی بڑی بڑی چٹانوں میں اس کے احکام کو کھود رہے تھے اُس وقت اُس جزیرے کے جنگل میں پھرنے والے " ڈروئڈ " لوگ اپنی پرستش کے جذبے کو بے زبان پتھروں کی لاٹوں میں تعمیر کیا کرتے تھے —— کئی ہزار سال کے بعد اسی جزیرے سے ایک پردیسی نے آکر قدیم زمانے کے اس گونگے اشاروں کے جال میں سے اس کی زبان کو آزاد کرکے زندہ کردیا - اس طرح شہنشاہ اشوک کی خواہش اتنی صدیوں کے بعد ایک پردیسی کی مدد سے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے قابل بنی وہ خواہش اور کچھ نہیں ہے - اشوک خواہ کتنا ہی بڑا شہنشاہ کیوں نہ ہو، وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں، اسے کونسی چیز پسند ہے اور کونسی ناپسند؟ یہ باتیں اسے ایک راستہ کے مسافر کو بھی بتانی پڑیں گی - اس کے دل کا جذبہ اتنے زمانوں سے تمام انسانوں کے دلوں کا آسرا دیکھتا ہوا راستے کے ایک طرف کھڑا ہوا ہے - شہنشاہ کی اس خواہش کے مرکز کی طرف کچھ مسافر دیکھتے ہیں اور کچھ مسافر بغیر

---

* موغلوں کی حملہ کرنے والی مشہور سوار فوج —

دیکھے چلے جاتے ہیں —

یہ کہہ کر میں اشوک کے احکام کو " ادبیات " کہتا ہوں ایسی بات نہیں ہے - اس سے اتنا پتہ لگتا ہے کہ انسان کے دل کی بہت بڑی خواہش کونسی ہے ؟ ہم جس مورت کو گھڑ رہے ہیں، جس تصویر کو بنا رہے ہیں، جس نظم کو لکھ رہے ہیں، پتھر کے جس مندر کی تعمیر کر رہے ہیں اور اس طرح ہر ملک میں ہمیشہ سے جو ایک انتھک کوشش جاری ہے وہ اور کچھ نہیں ہے، انسان کا دل دوسرے انسان کے دل سے زندۂ جاوید ہونے کی خواہش کر رہا ہے —

جو ہمیشہ رہنے والی چیز انسان کے دل میں زندۂ جاوید بننے کی کوشش کرتی ہے عام طور پر وہ ہماری وقتی ضروریات اور حرکات سے مختلف طور پر امتیازی حیثیت اختیار کرلیتی ہے - ہم اپنی ضروریات کے لئے ہی چاول، جو، گیہوں وغیرہ بوتے ہیں - لیکن اگر ہم جنگل قائم کرنا چاہیں تو ہمیں جنگلی نباتات کے بیجوں کو اکھٹا کرنا پڑتا ہے —

ادبیات میں یہی ہمیشہ قائم رہنے کی کوشش ہی انسان کی دلپذیر کوشش ہے - اس لئے ملک کے خیر خواہ نقاد یہ کہہ کر کتنا ہی جوش کیوں نہ دلائیں کہ ملک میں مفید ادبیات کی کمی ہے صرف ڈراموں، ناولوں اور دیوانوں سے سارا ملک بھرتا چلا جارہا ہے، پھر بھی لکھنے والے ہوش میں نہیں آتے کیونکہ مفید ادبیات سے وقتی ضروریات پوری ہوجاتی ہیں لیکن غیر مفید مطلب ادبیات میں یعنے ایسی ادبیات میں جو وقتی ضرورت کو پورا نہیں کرتی قائم رہنے کا زیادہ امکان ہے —

جو باتیں علمی ہیں شائع ہو جانے پر ان کا مقصد پورا ہو جاتا اور وہیں ختم بھی ہوجاتا ہے - انسانوں کے علم میں نئی نئی ایجادوں کے

ذریعے سے پرانی ایجادیں رو پوش ہوتی چلی جا رہی ہیں - کل جو چیزیں پنڈتوں کے لئے نا قابل فہم تھیں وہ آج کے بچوں کے لئے بھی نئی نہیں ہیں - جو حقیقت نئی شکل میں انقلاب انگیز ہوتی ہے وہ پرانی شکل میں حیرت بھی نہیں پیدا کرتی - آج جو حقیقت ایک معمولی سے شخص کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کسی زمانے میں بڑے بڑے عالم اس کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے - اس پر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے —

لیکن دلی جذبات کی حقیقت اشاعت کے ذریعے سے پرانی نہیں ہوتی - کسی علمی حقیقت کو ایک دفعہ جان لینے کے بعد دو بارہ جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی - آگ گرم ہے، سورج گول ہے، پانی مائع ہے یہ سب باتیں ایک مرتبہ جان لینے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں - دوسری دفعہ اگر کوئی شخص انہیں باتوں کو بطور نئی تعلیم کے ہمارے سامنے پیش کرے تو ہمیں اپنی قوت برداشت کو قابو، میں رکھنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن جذبات کی حقیقت کو بار بار محسوس کرنے پر بھی تکان معلوم نہیں ہوتی - سورج مشرق سے نکلتا ہے اس بات میں ہمارے دلوں کے لئے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی لیکن سورج کے نکلنے میں جو حسن اور مسرت ہے اس میں ازل سے لے کر آج تک بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی - احساس جس قدر قدیم زمانے سے اور جتنی مختلف نسلوں میں سے گزرتا ہوا آتا ہے اتنا ہی وہ ہمیں آسانی سے متاثر کر سکتا ہے —

اس لئے اگر انسان اپنی کسی چیز کو ہمیشہ کے لئے انسانوں کے دلوں میں روشن اور نئے جذبات میں زندۂ جاوید کرکے رکھنا چاہتا ہے تو اُسے جذبات کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے - اسی وجہ سے ادبیات کا خاص انحصار علمی مضامین پر نہیں ہے بلکہ جذبات پر ہے - اس کے علاوہ علمی مباحث

کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے سے کام چل جاتا ہے - اصل تصنیف کو دوسری زبان میں بدل دینے سے بعض اوقات اُس کی خوبی اور بھی بڑھ جاتی ہے - اُس کے مضامین کو لے کر مختلف قسم کے لوگوں میں مختلف زبانوں کے ذریعے طرح طرح سے شائع کیا جا سکتا ہے ' اسی طرح اس کا مقصد حقیقی طور پر پورا ہوتا رہتا ہے —

لیکن جذبات کے بارے میں یہ بات نہیں ہو سکتی - وہ جس شکل میں ڈھلے ہوئے ہیں پھر اُس سے الگ نہیں ہو سکتے —

علمی باتوں کو ثابت کرنا پڑتا ہے اور جذباتی کیفیات کو متحرک کرنا ضروری ہوتا ہے - اس کے لئے مختلف قسم کے اشارے کنائے اور طرح طرح کی شوخیوں اور انداز کی ضرورت ہوتی ہے - اسے صرف سمجھا کر کہہ دینے سے کام نہیں چل سکتا اسے خود پیدا کرنا پڑتا ہے —

یہ صناعی کی خوبیوں سے بھری ہوئی تصنیف جذبات کا جسم ہوتی ہے - اس جسم میں جذبات کے قائم کرنے سے مصنف کی حقیقت معلوم ہوتی ہے - اسی جسم کی فطرت اور ساخت کے مطابق ہی اس میں قائم کئے ہوئے جذبات انسانوں کے پاس عزت پاتے ہیں —— اس جسم کی قوت کے مطابق ہی یہ جذبات انسانی دلوں اور زمانوں میں پھیل سکتے ہیں —

روح کا انحصار صرف جسم پر ہے - پانی کی طرح اُسے ایک برتن سے دوسرے برتن میں ڈھالا نہیں جا سکتا - جسم اور روح آپس میں ایک دوسرے کو بڑھا چڑھا کر اک جان ہو کر رہتے ہیں —

جذبات ' اور حقائق تمام انسانوں میں یکساں ہوتے ہیں اگر انہیں ایک انسان ظاہر نہیں کرتا تو وقت آنے پر دوسرا انسان کرے گا - لیکن تصنیف مصنف کی بالکلیہ اپنی ہوتی ہے - وہ جس طرح ایک انسان کی ہو گی بالکل

اُسی طرح دوسرے کی نہیں ہوگی - اس لئے مصنف حقیقی طور پر اپنے کلام ہی میں زندہ رہتا ہے - جذبات اور مضمون میں نہیں —

" تصنیف " کے لحاظ سے " جذبات اور جذبات کو نمایاں کرنے کا طریقہ " ان دونوں باتوں کا ایک ساتھہ علم ہوجاتا ہے لیکن لکھنے کا طریقہ خاص طور پر لکھنے والے کا ہوتا ہے —

تالاب کھلنے سے پانی اور کھودا ہوا قطعہ زمین ان دونوں باتوں کا ہمیں ساتھہ ساتھہ علم ہوتا ہے لیکن ان دونوں میں فضیلت کس کو ہے ؟ پانی انسان کی بنائی ہوی چیز نہیں ہے وہ ایک دوامی شے ہے - اسی پانی کو خاص طور پر زمانۂ دراز تک لوگوں کے استعمال کے لئے حفاظت کرکے قائم رکھنے کا جو طریقہ ہے وہ انسان کا اپنا ہے اور اسی وجہ سے لوگ بنانے والے کے گن گاتے ہیں - اسی طرح جذبہ بھی تمام انسانوں میں مشترک ہے لیکن اسے ایک مخصوص شکل میں تمام انسانوں کے لئے خاص لطف کا سرمایہ بنانے کا طریقہ ہی مصنف کی تعریف ہے —

اس لئے جذبہ کو اپنا بنا کر سب کا بنا دینا ہی " ادبیات " ہے اور یہی فن لطیف ہے - حرارت پانی میں ' خشکی میں ' ہوا میں ' مختلف چیزوں میں عام طور پر سب میں یکساں ہے لیکن درخت اور بیلیں وغیرہ اس کو مخفی طاقت کے زور سے پہلے پہل خاص شکل میں اپنا بنا لیتی ہیں اور اسی طریقہ سے زمانہ دراز تک وہ سب کے کام آنے والی چیز بن جاتی ہے - اس کا استعمال صرف کھانے پکانے اور گرمائی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے سے خوبصورتی ' حفاظت اور صحت بھی حاصل ہوتی ہے —

اس وجہ سے دیکھا جاتا ہے کہ عام لوگوں کی چیز کو خاص طور پر اپنا بنا کر اُسی طریقہ سے پھر اُس کو عام لوگوں کا بنا دینا

ادبیات کا کام ہے —

ایسا ہونے پر علمی چیز ادبیات میں سے خود بخود نکل جاتی ہے کیونکہ انگریزی میں جسے " Truth " کہتے ہیں اُسی کو ہم اپنی زبان میں " سچ " کہتے ہیں - یعنی جو چیز ہمارے فہم میں آسکتی ہے اس کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اُس کو ذاتیات کے اپنا پے سے الگ کرکے لکھا جائے - سچائی ہر حال میں شخصیت سے بالا تر ' بے داغ اور بے لاگ ہوتی ہے - قانون کشش ثقل جیسا ہمارے لئے ہے ویسا ہی دوسرے کے لئے ہے یہاں اس کا کوئی موقع ہی نہیں کہ انسان خواہ وہ کیسے ہی مختلف اور عجیب دلوں کے ہوں ' اسے اپنے رنگ میں رنگ سکیں سایہ پڑنا آسان نہیں ہے —

جو چیزیں دوسروں کے دلوں میں حرکت اور جوش پیدا کرنے کے لئے ایسے دلوں سے جو فطرتاً ذہین ہوتے ہیں ' سروں ' رنگوں ' اور اشاروں سے مالا مال ہونے کی التجا کرتی ہیں —— جو ہمارے دلوں کے ذریعے سے جب تک خلق نہیں ہوجاتیں تب تک دوسروں کے دلوں میں نہیں بیٹھہ سکتیں —— وہی چیزیں ادبیات کا مسالا ہیں - وہ شکل میں ' طریقے میں ' جذبے میں ' زبان میں ' سروں میں ' بحروں میں اسی صورت میں جی سکتی ہیں —— وہ انسان کی بالکلیہ اپنی ہیں وہ ایجاد نہیں ہیں وہ نقل نہیں ہیں وہ انسان کی خلق کردہ ہیں - اس لئے اُن کے ایک دفعہ نمایاں ہوجانے پر انہیں دوسری شکل یا حالت میں بدلنا ممکن ہی نہیں - اُن کے ہر جز پر اُن کے کل کا پورا انحصار ہے - جہاں اس کے برخلاف دیکھا جاتا ہے وہاں وہ جز ادبیات میں سے خارج کردینے کے قابل ہے —

# ترکی ادبیات کا احیاء

## ( ۲ )

( نوشتہ ڈاکٹر جولیس جرمانوس استاد اسلامیات بڈا پسٹ یونیورسٹی )

مترجمہ

مولوی سعید وہاج الدین صاحب لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد

سنہ ۱۸۲۶ ع کا ایک نہایت ابر آلود اور تاریک دن تھا - قصر توپ قاپو میں ' جو قسطنطنیہ میں نہایت پر فضا جگہ پر واقع ہے ' سلطان محمود ثانی نے اپنی سلطنت کے مدبرین ' علماء اور فوجی افسروں کو جمع کیا اور ترکی کے افسوس ناک حالات کے متعلق ان سے گفتگو کی - ملک سرکش ہو چلا تھا ' اور فوج ہزیمت خوردہ ' نظم و نسق ابتر تھا ' اور رعایا مغلوک الحال - سرکش جانثاری افواج سلطنت کی بربادی کے درپے تھیں ' اور کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ ان کی سرکوبی کرے - اس عالم یاس و نا امیدی میں ایک شخص عبدالرحمن آفندی اپنی جگہ سے اٹھا ' اور ایک مختصر لیکن دل ہلا دینی والی تقریر کی - دوران تقریر میں وفور جوش سے اس کی تسبیح اس کے ہاتھہ سے چھوٹ کر میز پر گر پڑی اور اس کے دانے بکھر گئے - اس نے کہا :—

" اگر خدا کی مرضی یہی ہے کہ ہمارا مذہب "

" اور ہماری سلطنت قائم رہے ' تو ہم ان بد کرداروں "
" کا قلع قمع کردیں گے ' نہیں تو اپنی سلطنت "
" اور اپنے مذہب کے نام پر خود قربان ہو جائیں گے "

اس کی یہ تقریر اپنا اثر دکھا گئی - تامل اور پس و پیش کی جو حالت پہلے تھی وہ جاتی رہی اور چند ہی روز میں 'ات میدان' پر چن چن کر ایک ایک جانثاری قتل کردیا گیا —

اسی واقعہ سے ترکی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے - پہلے یہ جانثاری عثمانی شوکت و عظمت کی بنیاد اور اس کے ستون تھے ' لیکن بعد کو یہی سلطنت کے حق میں سب سے زیادہ پر خطر بن گئے تھے ' اور جب ترکی جمہور نیند سے چونکی اور اس میں خودی کا احساس پیدا ہوا تو اس نے مستقبل کی بنیادیں رکھنے کے لئے ماضی کو مسمار کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا - ترکی قوم نے جس طرح اپنے دل کو سخت اور ارادہ کو مضبوط بنا کر جانثاریوں کو قتل کیا ہے ' وہ ان کی آئندہ کی تاریخ کے لئے بطور ایک مثال کے ہے ' اور اس کے بعد سے ہم ہمیشہ یہی دیکھتے ہیں کہ ترکوں نے اپنی مٹی ہوئی عظمت اور شوکت کے کھنڈروں ہی پر ایک تازہ روح اور ایک نئی زندگی کی بنیادیں رکھی ہیں - اگر کسی قوم کی تاریخ محض درباری سازشوں ' سیاسی ناکامیوں ' اور میدان جنگ میں شکست کھانے کی کہتونی نہیں ' بلکہ جمہور کی روحانی زندگی اور تخلیقی قوت ارادی کی داستان ہوتی ہے ' تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ترکی تاریخ بھی زوال کی رام کہانی نہیں ' بلکہ ایک مقررہ منزل مقصود کی طرف برابر ترقی کرتے رہنے کی روئداد ہے - اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدی میں یکے بعد دیگرے متعدد صوبے ترکی کے ہاتھ سے نکل گئے '

لیکن اس کے سپوتوں نے لڑائی کے میدانوں میں ایسی ایسی جیوٹ دکھائی کہ ان کے جانی دشمن بھی ان کا لوہا مان گئے ' اگر ایک طرف ترکوں نے ظالم یورپ کے سیاسی حوصلوں کا مقابلہ تلوار سے کیا ' تو دوسری طرف ان کی ذہانت اور فراست نے ماضی کے نقوش کو ذہنوں سے محو کرکے ' یورپ کے مایۂ ناز مفکرین ' شعراء اور نغز گویوں کی روح کو اپنے اندر جذب کرلیا - ترکوں کی یہ جنگ مذہب کے واسطے نہیں ' بلکہ آزادی اور حریت کے لئے تھی ' جس میں کمال ہمت اور استقلال سے کام لے کر عہد رفتہ کے بہتر سے بہتر سرمایہ کو مستقبل کے فائدہ کے لئے بے دریغ قربان کردیا گیا —

ترکوں کی نشاۃ ثانیہ اور ترکی ادبیات کا تجدد مشرق کی تاریخ کا ایک عجیب و غریب واقعہ ہے - ترکوں کے پاس پہلے ہی سے ادبی سرمایہ موجود تھا ' جو ان کی تاریخ اور ان کے نظم معاشرت سے بہت قریبی مناسبت رکھتا تھا ' لیکن بعد کو جب سلطنت کے اختلال کے بعد پرانی معاشرت کا چولا بدلا ' تو لوگوں میں ایک دوسرا ہی ذوق اور ایک جدید روح پیدا ہوگئی ' جس نے انہیں تہذیب و شائستگی کے میدان میں آئندہ نئی نئی جولانیوں کے لئے تیار کردیا - سلطنت عثمانی کو بے شک زوال ہوا ' لیکن جمہور کی روح مردہ نہیں ہوئی —

قدیم ترکی ادبیات کی جڑیں اس زمانے کی معاشرت کی گہرائیوں تک پہنچی ہوی تھیں - اس ادب کا مرکز اور محور خاص خاص شخصیتیں ہوا کرتی تھیں - قصر شاہی ' سلطان اور اس کے نقباء - یہی شعراء و مصنفین کے سرپرست اور ان کا ماوی اور ملجاء تھے ' اس لئے ادبیات میں بھی انہی کی تحریک کام کرتی تھی - چونکہ رعایا کی حیثیت محض طبقہ اعلیٰ کے ایک اقتصادی

آلہ کار کی سی تھی ' اور لفظ " قوم " کا اطلاق ان پر نہ ہوسکتا تھا ' اس لئے ادبیات کا روے سخن بھی ان کی طرف نہ تھا ' اور ان کے مذاق اور ان کی ضروریات کا اس میں کوئی لحاظ نہ رکھا جاتا تھا —

قدیم ترکی ادبیات کا محور مذہبی الہامات ہوا کرتے تھے - شعراء کے کے دواوین اگر ایک طرف بنی نوع انسان کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور شریفانہ جذبات کے راگ گاتے تھے ' تو دوسری طرف ہوس ناکی کی پستیاں بھی ان میں اکثر نظر آتی تھیں - تصوف کو اعلیٰ سے اعلیٰ یا بدتر سے بدتر معنے پنہانا محض مصنفین یا قارئین کے ذوق پر منحصر تھا - ناسق کمال نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ دواوین سے جو شیطانی خیالات پیدا ہوگئے ہیں ' ان کی بنا پر یہ قیاس کرنا کچھہ زیادہ نا مناسب نہیں ہے کہ لفظ دیوان فارسی " دیو " سے نکلا ہے —

پرانا ترکی ادب محض مصنوعی اور تقلیدی تھا - اس میں معنی آفرینی کے بجاے سارا زور فکر صنایع لفظی پر صرف کیا جاتا تھا - ایسے دور از کار استعارے جو صرف انہیں لوگوں کی سمجھہ میں آسکتے یا پسند ہوتے تھے جو زبان کی باریکیوں سے واقف ہوں ' اس ادب کا مایۂ ناز تھے - ظاہر ہے کہ ایسا طرز نہپنے والا نہیں ہوتا - اس میں ترقی کی صلاحیت نہیں ہوتی ' نتیجہ یہ ہوا کہ بند پانی کی طرح یہ ادبیات بھی صرف چند مخصوص طبقوں میں محصور ہوکر رہ گئی - نثر کا ادب تو اس خصوصیت میں نظم سے بھی بدتر تھا ' اس لئے کہ بحر و قوافی کی پابندیاں پھر بھی مہمل الفاظ کی بھرتی اشعار میں زیادہ نہیں ہونے دیتیں - شعر کا موضوع البتہ تنگ اور محدود تھا - نبی نے ذیل کے اشعار میں اسی کی شکایت کی ہے :-

باقسہ اے اکثر سخن شاہ رخام سنبل و زلف و سے و بلبل و جام
چیقا سان دائرہ دلبردن خط و خال و لب و چشم تردن
(الخ)

(اگر غور کرو تو اکثر شعراء کے سخن کو خام پاو گے —
اس میں صرف سنبل و زلف و سے و بلبل و جام ہوتا ہے۔
ان کے نقوش دلبر کے دائرہ سے باہر نہیں آنے پاتے۔
بس اس کے خط و خال ہیں ' یا لب یا نشیلی نگاہیں۔ ایک سبزہ زار پر کلیلیں کرنا ہے۔ دوسرا بہار کے مزے لوٹتا ہے۔ کوی نئے راستوں میں قدم نہیں رکھتا —
بلکہ پرانے جانے پہچانے رستوں پر پڑے ہوے چلے جارہے ہیں)۔

مذکورہ بالا چند اشعار پڑہ کر ہم قدیم ترکی ادبیات کی اچھی خاصی تصویر اپنے ذہنوں میں قائم کرسکتے ہیں۔ یہ قدیم مذہب ادبیات کلاسک ' لکیر کا فقیر ' اور لفاظی سے بھرا ہوا ہے ' لیکن یہ بات چنداں تعجب خیز نہیں ہے ' اس لئے کہ اس زمانے کی معاشرت اور زندگی بھی ایسی ہی تھی ' انسانوں کی اُمنگیں پست اور اغراض محدود تھے ' چنانچہ ادبیات کے بھی جو تھوڑے بہت اصناف تھے ' وہ بھی انھیں کی ہمنوائی کرتے تھے۔ پرانا مذہب ادبیات تمثیلی تھا۔ حقیقت نگاری اس میں نہ تھی ' اس میں فرضی تخیل آفرینی تھی اور وہ بھی چند بندھی ٹکی اصناف میں۔ جزئیات اپنی اپنی جگہ پر بہت پرشکوہ ہوتی تھیں ' لیکن مجموعی حیثیت سے ساخت ناقص ہوتی تھی۔ اس زمانہ کی ادبیات میں تم کو جذبات کا تلاطم نظر نہ آئے گا ' بلکہ ہلکے اور دھیمے تاثرات' اور ایسے پیش پا افتادہ استعارات ملیں گے' جن کا حقیقی زندگی سے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ مختصر

یہ ہے کہ یہ ادبیات ایک مصنوعی اور خود ساختہ طبقہ کے مذاق کی آئینہ دار تھی، اور اس لئے خود بھی مصنوعی تھی - شعراء جمہور کے درمیان رہتے سہتے تھے، لیکن جمہور کو شعراء کے دیوانوں میں کوئی جگہ نہ ملتی تھی - ان کے پر شکوہ قصیدوں اور عاشقانہ غزلوں میں تمہیں عام انسانوں، کھیتوں میں کام کرنے والوں، کسی دور دراز میدان جنگ میں خون میں نہاکر مرنے والوں کے جذبات، ان کی امنگیں، ان کے صدمات، ان کی خوشیاں، ان کے غم و الم، ان کے حوصلے —— ان میں سے کسی ایک کی بھی صدائے بازگشت سنائی نہ دے گی - اس ادبیات میں کسی قسم کی انفرادیت یا شخصیت تمہیں نظر نہ آئے گی، اس لئے کہ اس نے اپنے سانچے روز مرہ کی معمولی زندگی سے نہیں لئے تھے، بلکہ ایک سانچہ پسند کرلیا تھا، اور اسی کو ہر موقع پر استعمال کیا جاتا تھا - تمام قدیم ترکی شاعروں کے معشوق ہو بہو ایک سے ہیں، اور تمام شعرا کی مثنویوں میں جو جذبات رنج و الم بیان کئے گئے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی فرضی اور خیالی شکستہ دل سے نکلے ہیں —

انقلاب فرانس نے حریت کے انفرادی جذبات پیدا کرکے مشرق قریب کو بھی خواب سے بیدار کردیا - نپولین جب مصر میں پہنچا، تو نئی نئی حربی چالوں کے ساتھہ نیا عربی چھاپہ خانہ بھی اس کے ساتھہ وہاں داخل ہوا - انقلابی خیالات اور یورپی باشندوں کی بیداری نے ترکوں کے تخیلات اور احساسات میں بھی حرکت پیدا کی فرانسیسیوں سے تو وہ پہلے ہی سے واقف تھے، اور جب انھوں نے دیکھا کہ فرانسیسی فوجوں نے یورپ کے صدیوں کے جمے ہوے تخت الٹ کر رکھدئے ہیں، تو مشرق کی کہنہ اور خواب آلود فضا میں بھی انفرادیت، تشکیک اور نئی تحقیق و تلاش کا شوق

تیزی کے ساتھہ سرایت کر گیا - سر زمین فرانس ترکوں کی نظروں میں ایک نیا جہان اور نیا عالم بن گئی' اور جس طرح وہ صدیوں سے مشرقی خیالات پر ثابت قدم تھے' اسی طرح اب صرف فرانس کے مطیع و منقاد اور ثناخواں بن گئے - فرانسیسی تخیلات' فرانسیسی افکار کے نمونے' فرانسیسی مذاق ادبی' فرانسیسی معاشرت - ان کی کشش نے ترکی کے بہترین دل و دماغ کو اپنی طرف مائل کرلیا' اور انھوں نے اس کی کوشش کی جس طرح ہوسکے' فرانس کے خیالات کو مشرق کی فضا کے موافق اور مطابق بدلیا جاے - سلطان محمود کو جن مشکلات و حوادث کا سامنا کرنا پڑا تھا' ان کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ یورپی طور طریقے اختیار کرلئے جائیں' چنانچہ سلطان عبدالمجید خان نے فرمان گل خانہ صادر کرکے ایک نئے دور کی داغ بیل ڈالی - اس فرمان میں مساوات کو قانون' نظم و نسق مملکت' اور عدل' سب سے پہلے جگہ دی گئی تھی - اگرچہ یہ کار روائی اتنی ہی اندیشہ ناک اور پر خطر تھی جتنا کہ جانثاریوں کا قلع قمع' لیکن بتدریج اس کے بعد دوسری کار روائیاں بھی کی گئیں' جن سے پرانی بنیادیں اکھڑ گئیں' اور نئی تعمیر کے لئے جگہ پیدا ہوگئی - اسی فرمان گل خانہ کی بدولت ' شناسی' کو اپنا اخبار" تصویر افکار" نکالنے کا موقع ملا' اور نامق کمال اپنا ڈراما " وطن " لکھہ سکا - لیکن بدقسمتی سے ترکی جمہور اور حکمران طبقہ دونوں دنیا کے حالات سے ہنوز با خبر نہ تھے' اور بہت جلد سازشوں کا بازار ایسا گرم ہوگیا کہ اصلاح کی ساری تجویزیں بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں - "رشید پاشا" نے' جسے یورپی اصلاح کا بانی مبانی کہا جا سکتا ہے' عوام کی تعلیم کا کام شروع کیا' لیکن اس کے صلہ میں اسے قتل کی دھمکی دی گئی' وجہ یہ تھی کہ جو لوگ پرانی وضع پر اڑے ہوے تھے' انھیں رشید پاشا کے مدارس کی جدید تعلیم کی

طرف سے خوف اور بدظنی تھی - اسی نے اخبارات جاری کر وائے ' جن کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ ترکی زبان جو پہلے بعید از فہم تھی ' عام فہم بن گئی - اسی نے اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کے لئے ' انجمن دانش ' قائم کی - لیکن ان اصلاحات کا رد عمل نہایت عجیب و غریب ہوا - اس پر ہر طرف سے لعن طعن ہونے لگی کہ بچوں سے جغرافیہ کے نقشے کھنچوا کر وہ انھیں تصویر کشی سکھاتا ہے ' اور اس کے رسوخ کے مٹتے ہی یہ تمام نقشے تلف کر دیے گئے - اسی طرح سے جب اس نے یہ تجویز پیش کی کہ نوجوان ترک سپاہی اعلیٰ فنون حربی کی تعلیم کے لئے یورپ روانہ کئے جائیں ' تو جو بد ترین بد معاش اور بد اخلاق آدمی مل سکتے تھے ' ان کا انتخاب کیا گیا ' اس میں مصلحت یہ تھی کہ ترکی کے ہونہار فرزند یورپ کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے نہ پائیں گے ' اور باقی رہے خود یہ لوگ ' تو یہ پہلے ہی سے اتنے خراب ہیں کہ یورپ جا کر ان کے اور زیادہ بگڑنے کا اندیشہ نہیں !

اس طرز عمل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ترکی میں آپس کی شکر رنجیوں کو دور کرنا اور جہالت کی تاریکی کو مٹانا کتنا مشکل کام تھا - اراکین نظم و نسق مملکت بھی ان جدتوں اور بدعتوں سے خائف تھے ' اور اسے اپنی ہوس پرستیوں کے حق میں پیام مرگ تصور کرتے تھے —

اس زمانہ میں ادبیات کے اوا بردار ' ' عاقف پاشا ' اور ' پرتو پاشا ' تھے - عاقف یورپی زبانوں سے واقف نہ تھے ' اور انھوں نے بالقصد و ارادہ ادبیات میں کوئی جدت نہیں پیدا کی - دفتری مراسلات میں تو ان کا طرز تحریر اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے بھی ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا ' البتہ ان کے خانگی خطوط اور ان کے بعض بعض اشعار میں ایک خیال ایسا نظر آ جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی روشنی کی کرن

پڑنے والی ہے :—

" وہ اپنی تحریروں میں اپنے دل کی ترجمانی اوراپنی "

" اصلی روح کا نقشہ اتارنا چاہتے ہیں "

' پرتو پاشا ' نے ' روسو ' ( Roussean ) اور ' وکٹر ہیو گو ' ( Victor Hugo ) کی کتابوں کے ترجمے شروع کئے ' اسی طرح ' اپنی نظموں میں انھوں نے یورپی طرز کی مخلوط بحریں استعمال کیں اور ترکی کے عامیانہ گیتوں کے بول ( پنگل ) گنانا شروع کئے - لیکن ان جدتوں میں سے کوئی بھی بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوی - وہ زمانہ ان اصلاحات کے لئے ساز گار نہ تھا ' ابھی تک ایسی کوئی ہستی پیدا نہیں ہوئی تھی ' جو جمہور کو بیدار کرے اور ان میں قومی احساس پیدا کرے - ایک صدی قبل ترکی میں جو کچھہ اصلاحات ہوئیں ' وہ خود سلاطین نے اپنے تخت و تاج کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی تھیں ' مثلاً سرکاری ملازمتوں اور عہدوں میں کچھہ رد و بدل ' اور یہ پہلے بھی کئی مرتبہ کیا جا چکا تھا - لیکن وہ نئی روح جو رفتہ رفتہ رعایا کے اندر سرایت کر گئی سلاطین اور پاشاؤں کی پیدا کی ہوئی نہیں تھی ' بلکہ خود جمہور میں سے ایک شخص کی تھی ' جسے ترکی قومی ادبیات کا سب سے پہلا نمائندہ کہا جا سکتا ہے ' یعنی ' شناسی آفندی ' - ادبیات کے متعلق شروع سے ایک خاص مقصد ' شناسی ' کے پیش نظر تھا - اس کی تحریریں محض تفنن طبع کے لئے نہ ہوتی تھیں - وہ قدیم سے جدید کی طرف زیادہ سے زیادہ اور درجہ بہ درجہ ترقی پسند نہیں کرتا تھا بلکہ خیال کی ایک دوسری ہی فضا پیدا کرنا اس کا مقصد تھا ' وہ انقلاب پسند تھا ' اور وہی ترکی کا سب سے پہلا معاشرتی اور تمدنی انقلابی تھا - پانچ سو برس پہلے کے قدیم ایشیائی مذہب خیالات کی جگہ وہ ایک نیا مذہب

خیالات پیدا کرنا چاہتا تھا ' اور اسے اور اس کے احباب کو جس آسانی سے اس کام میں کامیابی ہوئی ' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مسلک کتنا فرسودہ اور بے جان ہوکر رہ گیا تھا —

شناسی سنہ ۱۸۲۶ م میں پیدا ہوا - اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جو لوگ سرکاری ملازمتیں چاہتے تھے وہ دفتر کلم ( Kalem ) کے مدرسہ میں بھیج دئے جاتے اور جو لوگ کسی علمی خدمت پر جانا چاہتے وہ " مدرسہ " میں شریک ہوتے - لیکن رعایا کی بہت بڑی تعداد ناخواندہ اور جاہل رہتی - شناسی نے سرکاری ملازمت کو پسند کیا ' اور اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان بھی سیکھی - عنفوان شباب ہی میں وہ پیرس بھیج دیا گیا ' اور یہیں سے اس نے وہ یاد گار خط اپنی والدہ کے نام لکھا جس کے آخری الفاظ یہ ہیں :—

" میں ہمیشہ شریفانہ کاموں میں مشغول رہوں گا "

" اور مذہب اور ملک' وطن اور ملت پر اپنی جان فدا کردوں گا "

شناسی ہی وہ پہلا ترک ہے ' جس نے سب سے پہلے ' اور وہ بھی صرف سترہ سال کی عمر میں " وطن " اور " ملت " کے الفاظ کو ان معنوں میں استعمال کیا - چونکہ اسے ادبیات سے خاص شغف تھا ' اس لئے اسے فرانسیسی مصنفین کی صحبت مل گئی ' اور لامارتی نے ( Lamartine ) ارنست رینان ( Ernest Renan ) اور ساسی ( Sacy ) کے علمی حلقہ تک اس کی رسائی ہو گئی - چند سال کی تعلیم کے بعد وہ ترکی واپس آیا ' اور یہاں پہنچ کر مصلح اعظم رشیدپاشا نے اسے " انجمن دانش " کا رکن بنادیا ' لیکن جیسے ہی رشیدپاشا کا رسوخ مٹا ' شناسی کو محض اس وجہ سے کہ وہ " تازہی مقدا " تھا وہاں سے نکال باہر کیا گیا ! اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ پھر

پیرس واپس چلا گیا ' اور اگرچہ اسے کئی خدمتیں پیش کی گئیں ' لیکن اس نے ان کے قبول کرنے سے انکار کردیا اور سنہ ۱۸۷۰ ع میں ایک ترکی اخبار نکالا ' جس میں یورپی طرز اختیار کرنے پر زور دیا جاتا تھا - قدامت پرستوں نے اس کی مخالفت شروع کی ' لیکن جوان ہمت شناسی ' اپنے گنتی کے چند دوستوں کی رفاقت میں ' آخر تک ان کے مقابلہ میں پامردی سے جما رہا - اس کا انتقال قبل از وقت یعنی ۴۶ سال کی عمر میں ہوا ' لیکن جو بیج اس نے بویا تھا ' وہ اس کی زندگی ہی میں ایک چھتنار درخت بن چکا تھا - سیاسی حیثیت سے ' وہ مشروطہ خواہ تھا - ادبیات میں اس کا مسلک یہ تھا کہ متقدمین کی فرسودہ رسمیت کو توڑ دیا جائے ' اس نے اپنے ملک کی بہت بڑی خدمت کی ہے اس کی دلیری ' پامردی ' اور اخبار نویسی کی قابلیت نے تجدد میں جتنا حصہ لیا اور اس تحریک کو جتنا آگے بڑھایا ' وہ کسی اور سے نہ ہوسکا - لیکن اس کے اغراض و مقاصد اس قدر بلند اور شریفانہ تھے کہ اس کی ادبی قابلیت ان کا ساتھ نہ دے سکی - اسے خود بھی اس کا احساس تھا کہ میرا طرز کسی قدر سطحی اور خشک ہے اور میرے معتقدات کی ترجمانی پوری طرح نہیں کرسکتا :-

اینچہ در کرچہ بو فکرم قابا دوشدی تعبیر
ایلدم صانکہ سوکب ایلہ حوری تصویر

( افسوس میرے خیالات سطحی ہیں اور ان کی زبان ناقص -
گویا میں نے قلم دوات سے حور کی تصویر اتاری ہے ) -

لیکن ان کوتاہیوں کے باوجود ' محض شناسی کے خلوص اور صداقت کی کی وجہ سے ' ایک ایسی تحریک شروع ہوگئی ' جو اس کے تہذیبی اور سیاسی رجحانات کے عین مطابق تھی ' یعنی ترکی زبان کی پاکی اور صفائی -

اسلام کی ہمہ گیری، اور عجمی اور عربی تہذیب کی مقبولیت کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ترکی زبان ایک کار آمد مخلوط زبان بن کر رہ گئی تھی، جو، اگر سنجیدگی اور اعتدال کے ساتھہ استعمال کی جاتی، تو یقیناً شان و شوکت کے اعتبار سے، دنیا کی تمام زبانوں کی، خواہ زندہ ہوں یا مردہ، ہمسری کرسکتی تھی، لیکن اگر بے احتیاطی سے استعمال کی جاتی — اور بدقسمتی سے اکثر یہی ہوتا تھا — تو اس کی حیثیت محض ایک بے معنی طومار لفظی کی سی ہوجاتی تھی - شناسی نے اپنے اخبار میں جس تہیت طرز تحریر کی ابتدا کی تھی، اس کے متبعین اس کو نہ پہنچ سکے - شایستہ اور شستہ زبان لکھنے کے لئے عربی اور فارسی الفاظ کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا، اور شناسی کی تحریر سے بلند پایہ تحریروں میں ان کا استعمال ناگزیر تھا - اس کے شاگرد اور متبعین مثلاً نامق کمال، اکرم اور عبدالحق حامد جن میں صحافت نگاری کی بجائے، شاعری کا رجحان غالب تھا، زبان کے بارے میں اتنا تہیت مذاق نہ رکھتے تھے، جتنا شناسی —

شناسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک ترکی اخبار " ترجمان احوال " نکالا - چونکہ تہیت ترکی کے استعمال کا اسے خاص طور پر شوق تھا، اس لئے اس نے ایک صرف و نحو کی کتاب اور ایک ترکی لغت بھی مرتب کی - چونکہ طبعیت ایجاد پسند تھی، اس لئے اس نے ایک طنزیہ ناٹک " شاعر کی شادی " بھی تصنیف کیا، جس میں ترکی کی شادی کی رسموں کا خاکہ اڑایا گیا تھا —

ترکوں میں جو سیاسی بے چینی اور ہیجان پیدا ہوگیا تھا، اس کا رنگ ان کی ادبیات پر بھی بہت گہرا چڑھا ہے - ان کی تصنیفات میں وطنی اور ادبی دونوں رنگوں کی ایک عجیب و غریب ملی ہوی جھلک نظر آتی

ہے - وہ ترکی ادب، جو متقدمین کے زمانہ میں روز مرہ کی جیتی جاگتی چیزوں سے بالکل بے تعلق اور بے نیاز رہتا تھا، وہی اب جمہور کے جذبات کا ترجمان بن گیا - ضیا پاشا، جو اسی زمانے کا شاعر ہے، اور جس کے اشعار سب سے زیادہ نقل کئے جاتے ہیں، نوجوان ترکوں کی اس خفیہ جماعت کا رکن تھا، جو طرز حکومت کا انقلاب چاہتی تھی، اور جس نے آخر میں چل کر عبدالعزیز کو معزول کردیا تھا - پہلے وہ کئی سرکاری ملازمتوں پر، مثلاً والی صوبہ، منشی‌السلطان وغیرہ رہ چکا تھا - اس کے بعد وہ بھاگ کر یورپ چلا گیا، اور جب واپس آیا، تو مورد عتاب سلطانی بنا اور کسی صوبہ کے شہر میں نہایت کس مپرسی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا - اس پر اس قدر مظالم کئے گئے تھے کہ جب وہ مرا ہے تو کسی شاعر کی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ تاریخ وفات لکھ کر اس کی قبر پر کندہ کراتا - اس کے ادبی مشاغل بکثرت تھے - اس نے فرانسیسی زبان سے کتابیں ترجمہ کیں اور دوسروں کے ترجموں کی عبارت کو مثلاً " تاریخ اندلس " پر شکوہ بنایا، لیکن اس کا اصلی کمال اس کے مقالات سے ظاہر ہوتا ہے، جو اس کی دور اندیشی اور فراست کے ثبوت ہیں - ان مقالات میں اس نے بہت جرأت کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ فارسی عروض ترکی زبان کے لئے موزوں نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے عروض کی بجائے بول ( پنگل ) گننا زیادہ مناسب ہے - ترکوں کی حقیقی روح نے اپنے آپ کو جن مصنوعی اور خود ساختہ زنجیروں میں مقید کرلیا تھا، ان کے خلاف وہ علم بغاوت بلند کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا "ترکیب بند" جو روحی بغدادی کے تصوفانہ ترکیب بند کے جواب میں لکھا گیا، اور وہ ہجو جو اس نے اپنے سیاسی دشمن علی پاشا پر لکھی یہ دونوں فارسی بحروں ہی میں ہیں، اور کہیں کہیں تو اتنی ہی بعید از فہم ہیں، جتنی اس کے پیش روؤں

کی نظمیں - اس کے اشعار آج تک ترکوں کی زبان پر ہیں' اور ان میں سے اکثر تو ضرب المثل بن گئے ہیں —

جس طرح افق مشرق پر ایک کرہ آتشین نمودار ہوتا اور اپنی جگمگاہٹ سے دنیا میں اجالا کردیتا ہے' اسی طرح اب ایک نیا شاعر اور مصنف عرصہ شہود پر جلوہ افگن ہوا' یعنی نامق کمال - اصل میں ترکی ادبیات کا دور جدید اسی سے شروع ہوتا ہے - اگرچہ وہ شناسی کا شاگرد تھا' لیکن ادبی اصلاح کے خیالات کو اس نے انتہائی حد تک پہنچادیا - اس کی ادبی زندگی کا تعلق' بہ نسبت کسی دوسرے شعبہ کے' سیاسیات سے بہت زیادہ تھا - اس کی بے چین اور سیمابی طبیعت نے جمہور کے دل اور تخیل کو مسخر کرلیا' اور اس نے اپنی فصاحت اور شیوہ بیانی سے عظمت رفتہ کو ایک اس سے بھی زیادہ با عظمت و پر شوکت مستقبل کا پیش خیمہ بنا کر پیش کیا - کمال ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا تھا' جس کے اکثر افراد ترکی کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں - عنفوان شباب میں اس نے ایک سرے سے لے کردوسرے سرے تک ترکی سلطنت کی سیاحت کی تھی' غربت اور فلاکت ' نا انصافیوں اور بے عنوانیوں کے جو مناظر اس کے سامنے آئے تھے ' انہوں نے اس کے دل پر بہت گہرا اثر کیا تھا اور ملت کے لئے لڑنے کے عزم کو راسخ کر دیا تھا - وہ کم سنی ہی سے شعر کہنے لگا تھا ' اور قدیمی مرصع طرز کی غزلیں ' قصائد وغیرہ لکھتا تھا ' لیکن ان ابتدائی زمانہ کے اشعار میں بھی کہیں کہیں وطن پرستی کے رنگ کی جھلک نظر آجاتی ہے - اس نے فرانسیسی کا مطالعہ شروع کیا اور اپنے دیوان کے آخری صفحہ پر بہت ہاتھہ روک روک کر اور سنبھل سنبھل کر' اس نے بعض فرانسیسی مصنفین کے نام لکھے - یورپ نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے

غزلیں لکھنا چھوڑ دیا ' وہ نوجوان ترکوں کی جماعت میں شریک ہو گیا - سلطان عبدالعزیز کی حکومت نے اسے گورنر کا سکریٹری مقرر کر دیا ' لیکن وہ یورپ بھاگ گیا - لندن پہنچ کر ' اس نے ضیا پاشاء کی شرکت میں اخبار " حریت " نکالا ' اور چار برس تک وہاں رہا - جب ترکی میں عام معافی کا اعلان ہو گیا ' تو وہ واپس آیا ' اور قیام یورپ کی بدولت جو اضافہ معلومات اسے ہوا تھا ' اس سے کام لے کر پہلے سے بھی زیادہ جوش کے ساتھ وطنی خدمت میں مشغول ہو گیا - لیکن اس عرصہ میں ترکی کا سیاسی مطلع مکدر ہو چکا تھا ' اور ترقی خواہ نوجوان ترکوں نے ' جو مشروطہ کے لئے جدو جہد کر رہے تھے ' بہت جلد تاڑ لیا کہ سیاسی مطلع کی یہ گھنگور گھٹا اب برسنے ہی والی ہے - جذبہ آزادی نے جو ایک شریفانہ اور ہمدردانہ جذبہ ہونے کی حیثیت سے ہر شخص کو مرغوب ہوتا ہے ' ترکی میں بسنے والی تمام قومیتوں ' مثلاً رومانوی ' سربی ' بلغاری وغیرہ ' غرض سب کے دلوں میں ایک سی امنگیں پیدا کر دی تھیں - سلطنت ترکی کی بد نظمی کا اثر ان سب پر یکساں پڑا تھا ' لیکن جو رعایا مختلف المذہب اور مختلف النسل تھی ' اس نے ( مسلمان ترکوں کے مقابلہ میں ) مظالم کو کہیں زیادہ محسوس کیا - علاوہ بریں ان غیر ملکی عناصر کو یورپ کی مسیحی دول پر بھی بھروسہ تھا ' جن کی حکمت عملی ' اگرچہ وہ نہایت کوتہ اندیشانہ تھی ' یہی تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کر دئے جائیں - سنہ ۱۸۷۶ ع میں سربیوں نے اعلان جنگ کر دیا ' اور بلغاریوں نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا - الگزینڈر باتھ چیف ( Alexander Bothcheff ) نے ' جو ایک بلغاری وطن پرست اور شاعر تھا بمقام سلسترا ( Sillistra ) شاہ دانہ کی لکڑی سے بنی ہوئی بندوق سے پہلی گولی ترکی فوجوں پر چلائی -

اصل میں بلغاریہ اور ترکی دونوں جگھوں کے شاعروں کے دلوں میں ایک ھی سا احساس تھا ' یعنی آزادی اور قومی احساس کی بے روک ٹوک ترقی ' لیکن سیاسی مدبرین اب تک اسی خواب خرگوش میں تھے کہ گرفتاریوں کے خوف اور آھستہ آھستہ اور جرعہ جرعہ اصلاحات دینے سے قومیت کی یہ رو تھم جاے گی —

کمال نے ایک ناٹک ' سلسترا یا خود وطن ' ( سلسترا ' یعنی وطن ) کے عنوان سے لکھا ' اور جب یہ قسطنطنیہ میں دکھایا گیا ؛ تو غیر معمولی طور پر مقبول ھوا - حاضرین پر اس کے طرز بیان اور سوز و گداز کا اس قدر اثر ھوا کہ وہ بے اختیار ھو کر ' زندہ باد وطن ' " زندہ باد ملت " کے نعرے لگانے لگے - کمال کو دوسرے دن ھی گرفتار کرکے ' قبرس ' ( Cyprus ) پہنچا دیا گیا ' اور اس بطل جمہور ' اور پہلے ترکی ڈراما کے مصنف کی یہ قدر کی گئی کہ اسے ایک تیرہ و تار اور مرطوب کوٹھری میں ڈال دیا گیا ' جہاں سے اس کی رھائی اس وقت ھوئی جب عبدالعزیز معزول کیا گیا - جدید سلطان ' یعنی سلطان مراد اور اس کے بعد سلطان عبدالحمید یہ دونوں ترقی خواہ جماعت پر نظر عنایت رکھتے تھے ' لیکن بہت جلد جنگ روس کی بد بلا ترکی پر مسلط ھونے والی تھی ' عبدالحمید نے جو پارلیمنٹ بنائی وہ ترکوں کی آرزوؤں اور خواھشوں کے عین مطابق تھی - اب مستقبل کا راستہ صاف تھا اور ملک میں آزادی کا دور دورہ ھونے والا تھا ' لیکن جوشیلے شعراء اور مصنفین نے حقیقت کو نہیں دیکھا ' وہ دوسری ھی سلطنت کے خواب دیکھہ رھے تھے - ترقی خواہ ترکوں کا بہادر قائد ' یعنی نامق کمال خود آج کل کے معنوں میں قوم خواہ نہ تھا ' بلکہ ایک عثمانی وطن پرست تھا - وطن کے متعلق اس کا تصور یہ تھا کہ مسلمان ترکوں کی سلطنت قائم ھو '

پچھلے زمانہ میں جس طرح راہ اسلام میں جانبازی کی بدولت اسلام کو عروج نصیب ہوا تھا ' وہ انھیں مستقبل کے متعلق بھی ہمت دلا تا تھا - بالفاظ دیگر ترکی قوم پرستی کا منشاء و مدعا یہ تھا کہ انیسویں صدی کے یورپ کے اسلحہ اور طریقوں سے کام لے کر اسلام کا احیاء کیا جاے - نامق کمال کا طرز تحریر ثہیت نہیں بلکہ کسی قدر مغلق تھا اس کی نثر کی کتابیں مثلاً جزمی ' ناولیں اور قصے مثلاً بارکۂ ظفر' قاذچی' اس کے ڈرامے مثلاً " وطن " زاولی چوجق ( غریب بچہ ) ان سب میں کسی قدر لفاظی نظر آتی ہے - سخن آرائی اب تک معنی آفرینی پر غالب ہے ' اس کے قصوں کے افراد اسی کی سی رنگین اور مرصع زبان بولتے ہیں اور ان کی سیرتوں میں جو رقت پسندی نظر آتی ہے وہ بھی کچھہ ایسی زیادہ مرغوب اور پسندیدہ نہیں - لیکن چاہے ہم یہ نہ مانیں کہ کمال فن کا بادشاہ تھا ' تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ میدان عمل کا داھنی تھا ' اور اس کی ذات ہر ترکی محب وطن اور پر جوش انقلابی کے لئے نمونہ بن سکتی ہے - اس کی ادبی کوتاھیوں کے باوجود ' ترکوں کے دلوں میں کمال کی جگہ بحیثیت ایک بلند پایہ اور بہترین مصنف کے ہمیشہ باقی رہے گی ' اس لئے کہ جس روح نے ترکی کو گرما دیا ' وہ کمال ھی کی پیدا کی ہوئی تھی —

کمال کے شاگردوں اور ثناخوانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا - انھی میں سے ' اس کا مخلص دوست اور شاگرد رجائی زادہ اکرم بھی تھا ' جو ادبیات کا پروفیسر اور باب حکومت کا رکن تھا - اگرچہ وہ ہمیشہ سلطنت کا وفادار رہا ' لیکن پولیس کی بدظنی سے وہ بھی نہ محفوظ رہ سکا ' اور اسے اپنے تمام ادبی لکچروں کو محکمہ سیاسیات کو دکھانا پڑتا تھا - اکرم ایک پرگو شاعر بھی تھا ' اس کی شاعری کا رنگ عاشقانہ تھا اور چونکہ

اس میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اس لئے اس کے اشعار زیادہ تر زندگی کے تاریک پہلوؤں کے متعلق ہوتے تھے - اس کے ہم عصر اسے موجد اور اعلیٰ درجہ کا ذہین شخص سمجھتے ہیں، اور اس حیثیت سے وہ بے شک موجد کہے جانے کا مستحق ہے کہ فرانسیسی ادبیات کے اثر سے، اس نے متقدمین کے راستہ سے ہٹ کر شاعری کے لئے نئے نئے موضوعوں کا انتخاب کیا اور قدیم لفاظی اور صنعت بازی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کی، لیکن اس میں وہ اکثر ناکام بھی رہا - باقی رہی اس کی ذہانت اور ذکاوت، تو اس کے ماننے میں ایک خارجی نقاد کو کسی قدر کلام ہوگا، اس لئے کہ دوسرے شعر گویوں کے مقابلہ میں اس میں کوئی خاص ابداع یا اختراع، تخلیقی قوت، یا خیالات کی کوئی غیر معمولی خوبصورتی نظر نہیں آتی - اس کی زبان بھی ہمیشہ بے عیب اور اعتراض سے خالی نہیں ہے اور اس کے حریف معلم ناجی نے اس پر جو سخت تنقیدیں کی ہیں، وہ اکثر و بیشتر حق بجانب ہیں —

نوجوان ترکوں میں جو جذبہ وطن پرستی پیدا ہو گیا تھا، اس کا ایک اور باکمال ترجمان عبدالحق حامد ہے، وہ نامق کمال کا دوست اور شاگرد تھا، لیکن بہت جلد اپنے استاد پر چھا گیا، اور مشرق کے مشہور ترین مصنفین میں اس کا شمار ہونے لگا - وہ سنہ ۱۸۵۱ ع میں ایک شریف اور علمی مذاق رکھنے والے خاندان میں پیدا ہوا، اور اسے دنیا دیکھنے اور مشرق اور مغرب دونوں کی زبانوں اور ادبیات کی گہری واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا - اس نے بمبئی، میدرد، للدن غرض کہ یورپ اور ایشیا کے مختلف شہروں میں ترکی سفارت خانوں میں ملازمت کی، علوم مشرقیہ کے متعلق تو اس کی نظر پہلے ہی سے بہت گہری تھی، اب اس کے ساتھہ

ساتھہ ' اس نے فرانس کے رومانی ( Romantic ) اور انگلستان کے شیکسپیری مذاہب ادبیات کا اثر بھی قبول کیا - وہی سب سے پہلا ترکی مصنف ہے ' جس نے بحیثیت شاعر' نثار اور تمثیل نگار کے ' نو مشقوں کی سطح سے بلند ہوکر ' ترکی زبان کو ادبی خیالات کے اظہار کا ایک اعلیٰ درجہ کا وسیلہ بنادیا - عبدالحق حامد کی زبان میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں آورد اور تصنع کا کہیں نام نہیں ' اور لغت بازی اور تلاش لفظی کا اس میں شائبہ بھی نہیں پایا جاتا - اس کے الفاظ میں اس کے خیالات کی سی روانی پائی جاتی ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ محض زبان لکھنے کے شوق میں لفظ لکھے گئے ہوں —

عبدالحق حامد کا ادبی رنگ یہ ہے کہ وہ اپنے موضوعوں کے انتخاب میں رومانیت اور ان کے بیان کرنے میں حقیقت نگاری سے کام لیتا ہے' اس نے اپنے موضوعوں کو یا تو تاریخ مشرق سے لیا ہے تاکہ وہ انسانی قوتیں جو تاریخ کی تہ کے نیچے کام کرتی ہیں جیتی جاگتی بن کر قارئین کی نظروں کے سامنے آجائیں ' یا پھر حقیقی زندگی کے واقعات کو موضوع بنایا ہے ' تاکہ خاص خاص قسم کی عورتوں اور مردوں کی زندگیاں ' اور ان کے جذبات اور آلام کے نقشے پڑھنے والوں کی آنکھوں کے آگے آجائیں - بحیثیت تمثیل نگار ( تراماتست ) کے وہ اپنے ہم ملکوں میں پیش پیش ہے ' اور اگرچہ اس کے ترانے ہمیشہ کتابی شکل ہی میں رہیں گے ' کیونکہ اپنی پیچیدہ فنی حیثیت کی وجہ سے وہ اسٹیج پر دکھائے جانے کے لئے موزوں نہیں ہیں ' لیکن ان میں جو گہرے انسانی جذبات اور بلند پایہ اسلوب تحریر پایا جاتا ہے ' اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ ترکی ادبیات میں زندۂ جاوید رہیں گے - اس کی ذہانت کا اس سے بڑہ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ باوجود اس کے کہ پہلے سے ترکی اسٹیج پر کوئی

نمونہ اس کے سامنے نہ تھا ' تاہم محض غیر ملکی اثرات کے ماتحت اس نے ایسے ایسے ڈرامے لکھے ' اور اپنے قصوں کے افراد کے ایسے ایسے نفسیاتی چربے اتارے جو بہترین یورپی نمونوں سے ٹکر کھاتے ہیں - اس کی تصنیفات تیس کے قریب ہیں - اس کے بعض ڈرامے نثر اور نظم دونوں میں ہیں ' بعض محض نثر میں ہیں ' اور بعض شروع سے آخر تک منظوم - لیکن ان منظوم ڈراموں میں اس نے فارسی عروض استعمال نہیں کی ہے بلکہ قدیم ترکی طریقہ یعنی ہنگل ( بول ) گننے کا استعمال کیا ہے ' اور اسی کے تقاضہ سے اس کی زبان زیادہ ٹھیٹ اور اس کا طرز تحریر سلیس تر ہو گیا ہے —

عبدالحق حامد کے بعض ڈراموں کے قصے ہندوستان سے لئے گئے ہیں - عنفوان شباب ہی میں ' جب وہ ہندوستان آیا بھی نہ تھا ' اس نے ایک ڈراما " دختر ہندو " لکھا تھا ' جس میں ایک انگریز افسر اور ایک ہندوستانی لڑکی کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے - انگریز افسر ہندوستان میں جس بے فکری اور عیش کی زندگی گزارتے ہیں ' یہ قصہ اس کی ہو بہو نفسیاتی تصویر ہے - ہندوستانیوں اور انگریزوں کی معاشرت میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں اس کے متعلق بھی ہمیں اس قصہ کو پڑھ کر بصیرت حاصل ہوتی ہے ' اور آج سے پچاس سال پیشتر ہی ' ہمیں ( اس ڈرامے میں ) جمہور ہندوستان کو آزاد کرنے کے متعلق ایک موثر اپیل نظر آتی ہے —

بمبئی کے قنصل خانہ کے قیام کی وجہ سے اسے ہندوستان کی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا - وہ اسے " سبز و شاداب ملک " کہتا ہے " جس کے پرندے انسانی زبان میں باتیں کرتے ہیں " - اس گہری واقفیت ہی کی بنا پر اس نے سنہ ۱۸۸۶ ع میں ' جب وہ لندن میں تھا ' اپنا مقبول عام

ڈراما " فن تن " (Fin ten) لکھا - اور سب ڈراموں سے زیادہ اس کے اسی ڈرامے میں ہمیں جزئی سے جزئی باتوں میں خاص اہتمام نظر آتا ہے ' اور اس کے فنی نقوش اور نفس قصہ دونوں میں شیکسپیر کا اثر خاص طور پر نمایاں ہے - اس موقع پر اگر ہم اس ڈرامے کی تلخیص ناظرین کے سامنے پیش کریں تو شاید کچھہ ایسا بے محل نہ ہوگا :-

مسز کراس ( Mrs. Cross ) ' جو " فن تن " کی ہیروئن ہے ' ایک حسین عورت ہے ' جس کی شادی آسٹریلیا کے ایک متمول شخص سے ہوئی ہے ' جو سونے کی کانوں کا مالک ہے - یہ عورت لندن میں مقیم ہے ' اور نظر بازیوں اور عشوہ طرازیوں میں اپنا وقت گزار رہی ہے - یہاں ایک لارڈ اس کے دام عشق کا اسیر ہوجاتا ہے ' مسزکراس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے : جسے اپنا لڑکا سمجھہ کر یہ لارڈ مسزکراس سے شادی کرنا چاہتا ہے - لیکن اس میں کئی دقتیں ہیں ' جنھیں دور کرنے کے لئے حوصلہ مند مسزکراس ( فن تن ) ایک نہایت جسارت آمیز ترکیب سوچتی ہے - پہلے اسے ایک مدقوقہ لڑکی کی تلاش ہے ' جس کی شادی لارڈ سے کردی جاے ' اور اپنے ناجائز اور کاودی لڑکے کو اس لڑکی کی جائز اولاد بتا دیا جاے - اس کے بعد وہ یہ چاہتی ہے کہ اپنے وفادار نوکر کے ہاتھوں اپنے شوہر کو مروا ڈالے - اپنے طبیب خاص کی مدد سے اسے مدقوقہ لڑکی تو ایک اسپتال سے مل جاتی ہے ' لیکن اس کا وفادار نوکر دولاجی راو ' جو ہندوستانی ہے ' راضی نہیں ہوتا ہے ' وہ اپنی مالکہ کا ہر حکم بجالانے کے لئے تیار ہے ' وہ اس کے لئے تیار ہے کہ جنگل میں جاکر شیرنی کے پنجے سے اس کے دودھ پیتے بچے اٹھالاے ' لیکن اپنے بوڑھے مالک ' مسٹر کراس ' کو مارنے کے لئے وہ آمادہ نہیں ہوتا - بہت کچھہ

بحث مباحثہ کے بعد ' جس میں 'فن تن' 'دولاجی راو' کی محبت کا دم بھرتی ہے ' اور جس سے برسبیل تذکرہ یہ راز بھی آشکار ہوتا ہے کہ وہ ناجائز لڑکا دراصل اس نوکر کے عشق ہی کا نتیجہ ہے ' بالآخر نوکر نمک حرامی پر راضی ہوتا اور آسٹریلیا کی طرف روانہ ہوجاتا ہے -

لیکن یہاں سے پیچیدگیاں پڑنا شروع ہوتی ہیں - مدقوقہ لڑکی ' ( جسے اسٹیج پر لاتے وقت شاعر نے گریز کرکے بیماروں، ان کے آلام اور ان کی موت کے متعلق لمبے چوڑے اشعار لکھے ہیں ) لارڈ سے محبت کرنے لگتی ہے ' اور اپنی مہلک بیماری سے اچھی ہوکر اس کے ساتھ 'بیروت' بھاگ جاتی ہے ' 'فن تن' آتش رقابت سے جل کر ان کا پیچھا کرتی ہے - لیکن اب وہ لارڈ دل و جان سے اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے جو پہلے مدقوقہ تھی ' اور وہ 'فن تن' کو منہ بھی نہیں لگاتا - اس کے بعد سمندر پر ایک طوفان خیز رات کا منظر پیش کیا گیا ہے ' 'فن تن' ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ہوکر لارڈ کے تعاقب میں جاتی ہے اور قریب ہے کہ طوفان میں ہلاک ہوجائے ' لیکن دولاجی راؤ جو آسٹریلیا سے اپنے مالک کو قتل کرکے واپس آرہا ہے ' اس کی چیخیں سنتا ہے ' اور اسے بچا کر اپنے جہاز پر لے آتا ہے ' جس پر خود اس کی معشوقہ جو ایک کسان کی لڑکی ہے ' اس کے ساتھ سفر کررہی ہے - یہاں پھر کسان کی لڑکی اور فن تن کے درمیان رقابت کا منظر پیش آتا ہے اور دولاجی راؤ اس لڑکی کو قتل کرڈالتا ہے ' اور فن تن کو گود میں لیکر جہاز سے کود پڑتا ہے اور تیر کر صحیح و سلامت کنارے پر پہونچ جاتا ہے - اب یہ دونوں لندن میں زندگی بسر کرتے ہیں - فن تن لارڈ کو بھول جاتی ہے ' لیکن اپنے لڑکے کو واپس پانے کی غرض سے ' اسے مطلع کرتی ہے کہ اس

کا اصلی باپ دولاجی راؤ ہے - یہ دونوں شادی شدہ زندگی بسر کرتے ہیں ' لیکن دونوں میں سے کسی کو بھی اطمینان نصیب نہیں ہے - دولاجی راؤ قید ہو جاتا ہے ' اس کو وہاں سے چھڑانے کے لئے فن تن کئی روز گھر سے باہر رہتی ہے ' اور بالآخر اسے رہا کرا لاتی ہے ' لیکن دولاجی راؤ' فن تن کی طرف سے بدظن ہو جاتا ہے اور غصہ میں آکر اپنے لڑکے کو مار ڈالتا ہے' فن تن محبت مادری سے بے تاب ہو کر دولاجی راؤ کو گولی سے ہلاک کر دیتی ہے —

سیاہ فام دولاجی راؤ کی رقابت ہمیں آتھیلو کی رقابت یاد دلاتی ہے' لیکن ڈرامے میں کچھہ ایسے فنی نقائص پائے جاتے ہیں کہ ہم ان دونوں (آتھیلو اور دولاجی راؤ) کا محض سطحی طور پر ہی مقابلہ اور موازنہ کرسکتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامے کو مصنف نے بہت کچھہ محنت اور کاوش سے لکھا ہے ' لیکن اس کے بعض بعض اشعار میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے - ایک اور ڈراما ' جس کا قصہ تاریخ ہندوستان سے لیا گیا ہے ' ' اشبر ' ہے - اس کے لکھتے وقت ترکی مصنف کے سامنے کارنیلی کا ' جو رومانی طرز کا جید فرانسیسی استاد تھا ' قصہ ہوریس ( Horace ) بطور نمونہ کے تھا - اشبر کشمیر کا بادشاہ ہے - فاتح عالم سکندر رومی اس کی حسین بہن پر عاشق ہو جاتا ہے - یہ لڑکی جس کا نام ' سمرو ' ہے اس خیال سے کہ اس کے بھائی اور سکندر میں جدال و قتال کی نوبت نہ آنے پائے ' معاملہ کو رفع دفع کرنے اور سمجھوتا کرانے کی کوشش کرتی ہے ' لیکن مغرور بادشاہ اس پر راضی نہیں ہوتا اور اپنی بہن کے قتل کا حکم دے دیتا ہے - اس اثنا میں سکندر ملک پنجاب کی طرف پیش قدمی کرتا ہے رکزن ( Rokzan ) دارا کی بیٹی ' جو خود سکندر پر عاشق ہے

اس کی کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنی معشوقہ سمرو سے نہ ملنے پائے ' لیکن سکندر اسے ہاتھی کے قدموں کے نیچے روندواکر مار ڈالتا ہے ' اور بہادر اشبر کو شکست دیتا ہے ' جو شرم کے مارے خود تلوار مار کر مر جاتا ہے۔ اس کشت و خون کے دوران میں ارسطو بھی اسٹیج پر آتا ہے اور اس طنزیہ جملہ سے ڈرامے کو ختم کرتا ہے " اسی کا نام فتح ہے ! " —

اگر چہ اس ڈرامے کی فضا مصنوعی ہے ' جسے تاریخی ڈراما لکھنے والے فرانسیسی رومان نویسوں کا ورثہ سمجھنا چاہئے ' تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں تمثیلی توازن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے —

عبدالحق حامد کا ایک اور ڈراما بھی ہے ' جو کارنیلی (Corneille) کے " لی سد " ( Le Cid ) کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے پہلی مرتبہ پنگل کی بحروں کو استعمال کیا ہے ' لیکن چونکہ اسے اسٹیج کی زبان کا لحاظ بھی رکھنا پڑا ہے ' اس لئے اس کی موسیقیت جا بجا کسی قدر اکھڑی اکھڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس ڈرامے کا نام " نسترن " ہے۔ قصہ کا مظہر کابل میں ہے اور اس میں تخت و تاج کے ایک جھوٹے مدعی کی ' اپنے باپ کے خلاف سازشوں کو دکھایا گیا ہے۔ قصہ میں جان ڈالنے کے لئے رومانی عشق و محبت کی چاشنی دی گئی ہے —

ایک اور رومانی ڈراما ' " زینب " ہے ' جس میں مافوق البشری قوتوں کی تاثیرات اور الہامات سے بحث کی گئی ہے۔ اس کا ماحول بھی مشرقی ' یعنی ہندوستانی اور افغانی ہے۔ اس کا کچھ حصہ منظوم ہے ' اور کچھ نثر میں ' نثر کا حصہ نسبتاً زیادہ برجستہ اور جاندار معلوم ہوتا ہے —

اب ہم اس پرنویس مصنف کے بقیہ ڈراموں کے صرف عنوانات ہی

بتانے پر اکتفا کرتے ہیں - اس کی پرنویسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب اس کی غیر معمولی طبیعت حاضر ہوتی اور آمد شروع ہوتی تو وہ ایک ایک دن میں دیڑھ سو شعر کہہ دیا کرتا تھا :—

' سر دنپل '' آشوری زمانے کا ایک تاریخی ناٹک ہے طارق ' ابن موسیٰ ' طزر اور عبداللہ الصغیر ' ان سب کے قصے عربی اندلس سے لئے گئے ہیں ' لبرتی ' یہ ایک مثالیہ قصہ ہے ' جس میں عبدالحمید کی استبدادی حکومت پر چوٹیں کی گئی ہیں : الخان اور ترخان ان میں مصنف نے تورانی ترکوں کی سابقہ عظمت کے گیت گائے ہیں - ان دونوں ڈراموں کو گویا اس تحریک '' توران خواہی '' کی منادی سمجھنا چاہئے ' جو بعد میں چل کر ظاہر ہوئی —

عبدالحق حامد صرف ایک پر زور تمثیل نگار ہی نہ تھا ' بلکہ بیانیہ شاعری پر بھی اسے اعلیٰ درجہ کی قدرت حاصل تھی - اپنی نظم صحرا و بلدہ میں اس نے اس عشق کا اظہار کیا ہے جو اسے سبزہ زاروں ' مرغزاروں ' دھیمی ہوا میں ہلنے والے درختوں اور ان کی تر نم ریزیوں کے ساتھ تھا - ان چیزوں کو وہ خالص الہامات سمجھتا ہے اور ان کے مقابلے میں شہروں کے تصنعات اور زر پرستیوں کو ننگ دھڑنگ ہے - حامد سے پہلے کسی ترکی شاعر نے نہ تو دیہات کی فضا کا اتنا گہرا اثر اپنے قلب پر لیا تھا ' اور نہ اس زور اور قدرت کلام کے ساتھ اسے بیان کیا تھا - اد بیات کی یہ صنف خالص مغربی الاصل ہے ' اور اسی کی خاطر حامد نے مشرقی عروض کو چھوڑ کر ' فرانسیسی طرز کے مخلوط قوافی استعمال کئے ہیں - حامد کا اس طرح لوچ کے ساتھ دیہاتی فضاؤں کی تصویریں اُتارنا خاص کر اس وجہ سے اور زیادہ قابل توجہ ہے کہ وہ شہروں کی زندگی '

ان کے شور شغب اور ان کی دلچسپیوں کا بہت شوقین تھا چنانچہ اپنی نظموں کے ایک مجموعہ " دیوانہلی کلیرم " ( میرا جنون شباب ) میں اس نے انھی چیزوں کو بیان کیا ہے —

اس نے ایک منظوم قصہ " غرام " ( جذبہ عشق ) بھی لکھا ہے ' جس میں مذہب ' تصوف ' فنا وغیرہ کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں —

اپنی پہلی بیوی کی وفات کا ' جو بیروت میں واقع ہوئی تھی ' حامد پر اتنا اثر ہوا ' کہ وہ خود کشی کرنا چاہتا تھا ' اور اس کے اعزا و اقربا کو کامل چالیس دن تک اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنی پڑی - اس زمانہ میں اس نے مقبرہ کے عنوان سے اپنی بیوی کا ایک نہایت پر اثر اور دل ہلا دینے والا مرثیہ لکھا ' جو اس وجہ سے کہ اس میں رقت اور سوز و گداز کا عنصر بہت افراط سے تھا ' اُس زمانہ میں تو مقبول نہ ہو سکا ' لیکن اب اس نے ترکی ادبیات میں اپنی ایک مخصوص اور معزز جگہ پیدا کر لی ہے —

ترکی ادبیات کی تاریخ میں ایک اور نمایاں ہستی جو خاص کر ترکی ناول نویسی کے سلسلہ میں قابل ذکر ہے " سزائی بے " کی ہے - انھوں نے اپنی کتابوں ' ' کو چک شے لر ' ( چھوٹی چھوٹی چیزیں ) اور ' سر گزشت ' میں سب سے پہلی مرتبہ ایسے قصے لکھے جو بڑی بڑی حرم سراؤں اور ان کی کنیزوں کے حالات پر مبنی تھے - اگرچہ مصنف نے مشرقی زندگی کے اس رنگین رخ پر سخت سخت تنقیدیں کی ہیں ' تاہم ان کی قوت بیان بہت زبردست ہے ' اور ان افسانوں کے مختلف اجزا کے درمیان کمال کا تسلسل پایا جاتا ہے - یہ ایک عیب اس میں بے شک ہے کہ لمبے چوڑے جملے لکھ کر عبارت کو خراب کر دیا گیا ہے - یہ ناول تمثیلی نہیں ہے -

اور اس اعتبار سے پرانی شاعرانہ سے الگ ہے بر خلاف اس کے یہ حقیقت پر مبنی ہے ' اور اس میں مصنف نے مشرقی زندگی کے متعلق ایک نیا تصور قائم کرکے جدت کا ثبوت دیا ہے

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادبیات کی یہ نئی روح پرانی روح کو ایک دفعہ ہی مٹا نہیں سکی - جس طرح اب تک ہم نے مشرق کو مغرب سے ملانے والی ادبی کڑیوں کو ( خصوصاً صنف نظم میں ) دیکھا ہے ' اسی طرح ہم کو ' یئی شہرلی اونی ' ' ہر سک لی عارف حکمت ' اور ' لس کاتچلی غالب بے ' کے ناموں کو بھی نہ بھولنا چاہئے ' ان لوگوں نے اپنا ایک مخصوص ادبی حلقہ قائم کرلیا تھا اور ترکی شاعری کی پرانی روایات پر ثابت قدم تھے - رجعت پسند طبقہ کا نمایندہ معلم ناجی تھا جس نے اپنے ادبی مشاغل کے ابتدائی دور میں نئے مذہب شاعری کے بے تکے پن ' خصوصاً اکرم اور عبدالحق حامد پر سختی سے تنقیدیں کیں - لیکن دوسرے دور میں ' جب وہ فرانسیسی زبان سیکھ چکا ' تو ان ادبی بدعتوں کے متعلق اس کا رویہ کسی قدر نرم ہو گیا ' اور خود اس نے کئی اعلیٰ درجہ کی نثر کی تحریریں ' تہیت ترکی زبان میں اور اعلیٰ درجہ کی فصاحت کے ساتھ لکھیں ترکی زبان کی صفائی ' اور صرف تہیت زبان لکھنے کے متعلق اس کی رائے اس کے اس جملے سے معلوم ہوتی ہے : —

' اگرچہ ترکی زبان میں عربی و فارسی کے بے شمار '
' الفاظ ہیں ' لیکن ان کو صرف ایسے اجزا '
' سمجھنا چاہئے جنہیں ترکی اپنے مخصوص '
' معنوں اور اپنے مخصوص تلفظ کے ساتھ استعمال '

" کرسکتی ہے " ۔ *

اسی زمانے میں " ترجمان حقیقت " اخبار جاری ہوا تھا ' اور اس کے ادبی نقاد کی حیثیت سے انہیں اپنے ہم وطنوں کو الفاظ کا صحیح استعمال سکھانے کا بہت کچھ موقع حاصل تھا ۔ اپنی قوم میں وہ بجائے مصنف کے ' استاد زبان کی حیثیت سے زیادہ معروف تھے اور اسی وجہ سے انہیں " معلم " کا لقب دیا گیا ۔ ان کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اپنے تنقیدی مضامین لکھ لکھ کر انہوں نے ' جوشیلے جدت پسندوں کی روک تھام کی ' جو اکثر اپنے جوش اختراع میں ادبی ذوق کی حد سے بھی متجاوز ہوجاتے تھے ۔ ان کی خاص خاص تصنیفات یہ ہیں : ۔

آتش پارہ ( چنگاری ) ۔ اس کتاب کے ذریعہ سے انہوں نے بقول خود —

" ویردم آتش دللرہ سوز دل آوارہ دن
ایلدم ایجاد بہ یک یا تعین بر آتش پارہ دن "

( ایک دل سوزاں و آوارہ سے میں نے کئی دلوں میں آگ لگائی ایک چنگاری سے ہزاروں دیا سلائیوں کو جلا دیا )

حمیت کے عنوان سے انہوں نے ارطغرل غازی کی ایک مقفیٰ تاریخ بھی لکھی ہے ۔ ان کے منظوم کلام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی بہت زیادہ بلند مرتبہ شاعر نہیں ہیں ۔ ان کی نثر کی تصانیف مثلاً سنبلہ ' جو چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ہے اور بیچ بیچ میں کچھ نظمیں بھی ہیں —— اپنی سلاست کے اعتبار سے خاص طور پر

---

* انشاللہ خاں نے " دریائے لطافت " میں اردو زبان کے مختلف الاصل الفاظ کے متعلق بھی بعینہ یہی رائے ظاہر کی ہے —

قابل ذکر ہے —

اس ادبی زندگی اور جدوجہد کے ساتھہ ساتھہ' انیسویں صدی میں ترکوں کے علوم بھی خواب غفلت سے بیدار ہوے - علم کے میدان میں سب سے اعلیٰ اور افضل ذات ' احمد جودت ' کی تھی ' جو ماہر سیاسیات بھی تھا اور استاد اور مورخ بھی - اور اپنی زبان کی سب سے بڑی خدمت انھوں نے تاریخ ہی کے شعبہ میں انجام دی ہے' یعنی ان کی تاریخ ترکی جو بارہ جلدوں میں ہے اور سنہ ۱۷۷۴ ع سے سنہ ۱۸۲۵ ع تک کے زمانہ پر حاوی ہے - ترکی میں اس سے زیادہ مستند اور کوئی تاریخ نہیں اور اس کی زبان از اول تا آخر سیدھی سادھی اور تصنع سے بری ہے —

مغرب کی سمت سے جو ہوائیں آ رہی تھیں' انھوں نے ترکوں میں ایک خاص ادبی فضا پیدا کردی' اور انیسویں صدی کی رومانیت ( Romanticism ) سے مسحور ہو کر انھوں نے کمال شوق کے ساتھہ مختلف علوم کا مطالعہ شروع کردیا' اور ان میں ایک باکمال ذات ایسی پیدا ہوگئی جس نے اپنی قوم کی تلاش علم اور تغریب کی خواہش دونوں چیزوں کو پورا کردیا - یہ ذات ' احمد مدحت ' کی تھی - واضح رہے کہ ' احمد مدحت ' سیاست داں اور مدبر دوسرا شخص تھا - یہ ' احمد مدحت ' اپنے زمانہ کا قاموس نویس تھا - اسے ہر چیز کے متعلق تھوڑی بہت معلومات تھی' اور وہ اسے اپنے ہم وطنوں کو بھی فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا - جریدہ عسکریہ' 'جریدہ حوادث' اور ترجمان حقیقت کے مدیر کی حیثیت سے اس نے ہزاروں ہی مضامین لکھے' وہ نہایت پر نویس اور جامع‌الحیثیات تھا اور ہر موضوع پر' جس ضخامت کا مضمون اس سے کہا جاے لکھہ سکتا تھا - بحیثیت فلسفی کے' اس نے اپنی تمام تر توجہ روحانی مادئیں پر مبذول رکھی' اور فلاسفہ مغرب کی

تردید سے تو اس کا قلم کبھی تھکتا ھی نہ تھا' اور اس موضوع پر اس کی تحریریں کئی جلدوں میں سما سکتی ھیں - اگرچہ بعض اوقات اس کا استدلال نہایت غیر فلسفیانہ ھوا کرتا تھا' لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنے زمانے میں ( یعنی سنہ ۱۸۸۰ اور اس کے قریب ) اسی کی دلچسپ کتابوں نے ترکوں کے ذھنی جمود کو توڑا' اور انھیں تعمق اور تفکر پر اُبھارا - اس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام کی اعلیٰ اور شریفانہ روح سائنس اور فلسفہ کی ترقی کے منافی نہیں ھے —

اگرچہ اسے ایک اعلیٰ درجہ کا ناول نویس نہیں کہا جا سکتا ' تاھم اس حیثیت سے بھی اس کی خدمات کچھہ کم قابل لحاظ نہیں ھیں . اس کی کتابیں' نہ صرف ترکی میں' بلکہ تمام ایشیا کی ترکی بولنے والی اقوام میں پڑھی جاتی تھیں - اگر ھم صرف اس کی ناولوں کے عنوانات ھی لکھیں' جن میں سے کچھہ ترجمے ھیں اور کچھہ اپنی خاص چیز' تو اسی میں کئی صفحات خرچ ھو جائیں - کم از کم ان کی تعداد ایک سو سے تو ضرور اوپر ھے - اگر وہ کسی ناول کا ترجمہ کرتا' تو اس میں اپنی طبیعت سے بھی کچھہ نہ کچھہ اضافہ ضرور کردیتا تھا - اس نے ترکوں کو پڑھنا سکھایا اور ان کے دلوں میں ناول خوانی کا شوق پیدا کیا - شروع شروع میں وہ خیالی اور جالب توجہ قصے لکھا کرتا تھا' لیکن جب اس نے دیکھہ لیا کہ قارئین انھیں انتہائی شوق سے پڑھتے ھیں تو رفتہ رفتہ اس نے ناولوں میں حقیقت آمیزی اور تحلیل نفسی شروع کردی' تاکہ لوگوں کی اخلاقی تعلیم بھی ھوتی رھے' اور ان میں کمال پیدا ھوجاے - اس کے قصوں میں جتنے مجرم اور گنہ گار نظر آتے ھیں' وہ سب کے سب اپنے کیفر کردار کو ضرور پہنچ جاتے ھیں —

چونکہ وہ نہایت ہی وسیع المعلومات تھا، اس لئے اپنی ناولوں کے ذریعہ سے وہ اپنی قوم کا معلم اور استاد بن گیا - وہ مقابلہ میں فرانسیسی مصنف جولس ورن سے کسی طرح کم نہیں ہے ' بلکہ کہیں کہیں تو تخیل آفرینی میں وہ اس سے بھی آگے نکل گیا ہے - اس کی اکثر ناولوں کے واقعات دور دراز ممالک کے ہیں ' مثلاً امریکہ ' برے زیل ' ہندوستان وغیرہ ' اور ان ملکوں کے باشندوں کے عادات ' رسم و رواج وغیرہ کے جو حالات اس نے لکھے ہیں وہ ترکی قارئین کے لئے مدرسوں کی جغرافیہ کی تعلیم سے کہیں زیادہ سود مند ہیں - اس کی تیز نویسی کا ایک قابل افسوس نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کا طرز تحریر عامیانہ ہے اور قدیم ادبی معیاروں تک نہیں پہنچتا ' لیکن غالباً اپنے طرز کی اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ اتنا مقبول بھی ہوا ' اور پڑھنے والوں پر اتنا زیادہ اثر ڈال سکا —

لسانیات کے شعبہ میں جس شخص نے شہرت پیدا کی ' وہ ' احمد وفیق پاشا ' تھا ' وہ مدبر تھا ' لیکن تحریر کا ایک خاص مذاق رکھتا تھا ' اور اپنی فرصت کے اوقات میں اس نے ایسی ایسی لسانیاتی کتابیں تصنیف کیں ' جو ترکوں کے لئے نہایت اہم اور ضروری تھیں - وہی سب سے پہلا ترکی ماہر لسانیات تھا ' جس نے یورپی ماہرین السنہ مثلاً ریڈھاوس ( Redhouse ) کے اصول تحقیق پر کاربند ہوکر ایک ترکی لغت " لہجہ عثمانیہ " مرتب کی ' اور " جگتائے لغاتی " یعنی وسط ایشیا کی ترکی زبانوں کی ایک شرح لکھی - اپنی ان تصنیفات کے ذریعہ سے ' اس نے عثمانی ترکوں میں نسل پرستی کا احساس پیدا کیا ' اور ان کے دلوں میں جذبہ توران خواہی کی بیداری میں حصہ لیا - اس نے " ابوالغازی بہادر خاں " کی ' شجرات ترک ' کا بھی ترجمہ

کیا - لیکن مذکورہ بالا ادبی خدمات سے بھی کہیں زیادہ قابل قدر اس کے وہ اعلیٰ درجہ کے تراجم ہیں ' جو اس نے فرانسیسی کتابوں کے کئے - اگرچہ اس سے پہلے بھی یوسف کیامل پاشاہ نے ' فےنی لان ( Fenelon ) کی مشہور کتاب تے لی ماک ( Telemaque ) کا ترجمہ کیا تھا ' لیکن اس میں مغلق اور متروک الفاظ و عبارات کی کثرت تھی ' اس کے مقابلہ میں احمد وفیق پاشا کے تراجم آج تک ترکی زبان کے کلاسک بنے ہوئے ہیں - اس نے مولیےر ( Moliere ) کے ناٹکوں کو اس طرح پر " اپنایا " کہ ان کے ہیروؤں کو بطور نمونہ لے کے انھیں ترکی بساط پر بٹھا دیا - اب ترکی میں یہی فیشن ہوگیا ہے کہ غیر ملکوں کے ناٹکوں کو اپنا لیا جاے ' یعنی خاص خاص افراد قصہ کی سیرتیں وہی رہیں - جو اصل میں تھیں ' اور قصہ کا عام رنگ بھی وہی ہو ' لیکن افراد قصہ کو ترکی نمونوں میں اور غیر ملکی ماحول کو ترکی ماحول سے بدل ڈالا جاے * - البتہ یہ بات کسی قدر افسوس ناک ہے کہ یہ تراجم اسٹیج پر نہ دکھائے جاسکے - عبدالحق حامد کو بھی ہر نئی چیز کی طرف سے کچھہ ایسا خوف ( جدت ترسی ! ) تھا کہ ترکی میں اسٹیج کے قابل کھیلوں کی ترقی نہ ہوسکی ' بلکہ زیادہ تر ناٹک صرف

---

* اردو کے افسانہ نویس بھی اگر اسی اصول پر کاربند ہوں تو بہتر ہے - خاکسار نے بھی مولیےر کے ڈرامے ( Forced Marriage ) کو " نکاح بالجبر " کے عنوان سے ' علیٰہذا گوگول کے ڈراموں " Marriage " اور " Inspector - General " کو نیز چخوف کے چند افسانوں کو اپناکر اس کا تجربہ کیا ہے ' اور اکثر احباب اور نقادان فن نے انھیں پسند کیا ہے - یہ ڈرامے اسٹیج پر بھی دکھائے جاچکے ہیں —

۱۲ - مترجم

کتابی صورت ھی میں رھے —

اس دور کے مورخین میں 'مراد بے' سب سے بڑا ھے - چونکہ اصل کے اعتبار سے وہ روسی ترک تھا' اس لئے تاریخ کے غیر ملکی مآخذ تک بھی اس کی دست رس تھی - اس کی ضخیم کتاب تاریخ عالم جو چھہ جلدوں میں ھے' فاحش اغلاط سے پر ھے' علی ھذا اس کی تاریخ آل عثمان میں جس کا عنوان " تاریخ ابوالفاروق " ھے قیاسی کلیات اور تعمیمات سے بہت زیادہ کام لیا گیا ھے - ایک عرصہ تک' یعنی اس وقت تک جب کہ نئی انجمن تاریخ نے ترکی تاریخ کے مآخذ کی طباعت شروع کرکے تقابلی مطالعہ تاریخ کے علمی اصول قائم نہیں کئے تھے —— 'مراد بے' کی تاریخ ھی مستند ترین سمجھی جاتی تھی —

اسی سلسلہ میں ' ابوالضیا توفیق ' کا ذکر کرنا بھی ضروری ھے' اس لئے کہ وہ چاھے بلند پایہ مصنف کی حیثیت سے معروف نہ ھو' تاھم ایک پر جوش وطن خواہ اور واقف فن ناشر کتب کی حیثیت سے ضرور ممتاز ھے - تمام بڑے بڑے ترکی مصنفین کے ساتھہ اس کے دوستانہ تعلقات تھے' اور اس نے ان کی تصنیفات کو جس اھتمام اور خوش ذوقی کے ساتھہ شایع کیا ھے' اس کا جواب ترکی طباعت میں آج تک پیدا نہیں ھوا ھے - اس کی کتاب " نمونۂ ادبیات" تاریخ ادبیات ترکی کا سب سے پہلا نمونہ ھے - شمس‌الدین سامی' یعنی قاموس سامی کے مشہور مدون نے بھی اپنی کتاب میں عربی اور فارسی محاورات کے علاوہ عوام کی بول چال اور محاورات کے نمونے جمع کئے ھیں اور اس حیثیت سے اس کی قاموس زبان کے متعلق ایک اعلیٰ درجہ کی حوالہ کی کتاب اور سند کا حکم رکھتی ھے —

ترکی جمہور کی بیداری اگر چہ آھستہ آھستہ اور بتدریج ھوئی' لیکن

اس کے ساتھہ ساتھہ قطعی اور واقعی بھی تھی - حوداث کے تازیانہ نے اس کے روحانی جمود کو توڑا' مثلاً عیسائی رعایا میں قومی احساس کا پیدا ہو جا نا اور حقوق کے مطالبات' سیاسی مظالم کی کثرت' جن کی بدولت' عبدالحمید کے زمانے میں مصنفین جلا وطن کئے گئے اور اس طرح ان میں یورپی تخیلات و افکار کا غیر معمولی شوق پیدا ہوگیا - قوم کے بہترین دماغوں نے بھی اس نئی روشنی کی صرف ہلکی سی جھلک دیکھی تھی' اور اسی لئے جن خیالات کا انھوں نے اپنی تصانیف میں اظہار کیا' ان میں بھی ماضی کی یادداشتیں بکثرت نظر آتی ہیں - جس دور کو اصلاحی دور کہا جا تا ہے' اس میں قوم پرستی کو خلافت کا مرادف سمجھا جاتا تھا - خود عبدالحق حامد نے اپنے ڈراموں میں اندلس کے حالات لکھے ہیں' اور اسے محض اس وجہ سے ایک قومی موضوع بحث قرار دیا ہے کہ یہ ایک اسلامی چیز تھی - اسلام اور تحریک عثمانیت یہ دونوں مل کر ایک تصور ہوگئے ہیں اور ترکی کے روشن خیال مصنفین کا تخیل قومی آزادی کے متعلق ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اسلام کی عظمت رفتہ کو زندہ کرکے اور خلفاے عثمانی کی سرکردگی میں' یورپی علوم اور یورپی مذاق کے ذریعہ قوم کو آزاد کیا جاے - ان لوگوں کی معلومات مشرق کے متعلق غالباً اتنی ہی غیر مکمل اور ناقص تھی' جتنی کہ مغرب کے متعلق - لیکن اس کے ساتھہ ہی ان کی نیت نیک تھی' اور انھوں نے خلوص اور صدق دل کے ساتھہ اس کی کوشش کی کہ زندہ رہیں' اور دریاے ڈینوب ( Danube ) سے لیکر خلیج فارس تک ملت اسلامیۂ عثمانی پر جو روحانی بے حسی طاری ہوچکی تھی' اسے دور کریں - فلسفہ تاریخ کی رو سے یہ بات محال نظر آتی ہے کہ ایک ایسا زبردست انقلاب' جیسا کہ سلطنت عثمانی کی روحانی اور سیاسی زندگی میں ہونے والا تھا' دفعتاً ہوجاے - یہ

نہیں ہوا، بلکہ ایک درمیانی زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں قدیم اور جدید کا سنگم ہوا، پرانے اور نئے دونوں زمانوں کی کوتاہیاں ایک دوسرے سے مل گئیں، اور یہ درمیانی دور گویا اس بات کی قطعی ضمانت تھی کہ ہنوز ترکوں کی روحانی تاریخ کا خاتمہ نہیں ہوا ہے - اس دور میں اخبارات جاری ہوے، ترکی بحروں میں نئی شاعری شروع ہوئی، ناول اور ڈرامے تصنیف ہوے، ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو فرانسیسی اصل سے ( جس کے یہ سب نمونے تھے ) بڑھی چڑھی ہو، ترکی زبان بہت زیادہ انگھڑ تھی، اور اس پر صدیوں سے پرانا رنگ چڑھا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ ان نئے اور غیر مانوس خیالات اور احساسات کے اظہار کا اچھا ذریعہ نہ بن سکی - تاہم ترکوں نے کوشش میں کمی نہیں کی اور ضیا پاشا کے زمانے سے لیکر عبدالحق حامد کے دور تک جس قدر ترقی ہوئی، وہ واقعی تعجب خیز ہے - نوجوان مصنفین کے دل جوش اور فتح مندی کے احساس سے لبریز تھے، اور جب سلطان عبدالحمید کو معزول کیا گیا، تو تاریخ کے اسٹیج پر ایک نئی ترکی قوم نے قدم رکھا - اس نئی قوم کو سخت سے سخت ناکامیوں اور شدید سے شدید مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا - جنگوں کے لامتناہی سلسلے اور اقتصادی مشکلات کی وجہ سے اس کی صفیں کمی و بالا ہوگئیں، لیکن مصائب کے باوجود ترکی روح فنا نہیں ہوئی، ترک بدستور اپنی شاندار شاہراہ ترقی پر گام زن رہے، اور انھوں نے اگلے زمانہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ شاندار کام کر دکھاے - انھوں نے ان ذہنی بندھنوں کو جو متقدمین سے انھیں ورثہ میں ملے تھے، توڑنا شروع کیا، اور تہذیب و شائستگی کے ایک نئے شاندار اور تاریخی دور میں داخل ہوگئے - بالآخر قومی احساس بیدار ہوکر رہا !

# تبصرے


| ادب | صفحہ |
|---|---|
| گوئٹے کا فاوست | ۴۸۵ |
| تاریخ ادبیات ایران | ۴۸۶ |
| شاعر کی رات | ۴۸۶ |
| رفیق تنہائی اور دیگر افسانے | ۴۸۷ |
| دختر فرعون ( حصہ دوم ) | ۴۸۷ |
| ارمغان محبوب | ۴۸۸ |
| گلزار عثمانی | ۴۸۸ |
| فرانسیسی افسانے | ۴۸۹ |
| انقلاب دھلی | ۴۸۹ |
| **تصوف** | |
| صبغۃ اللہ | ۴۹۱ |
| انتخاب دیوان شمس تبریز | ۴۹۲ |
| آئینۂ معرفت | ۴۹۳ |

| | صفحہ |
|---|---|
| **حکمت و معاشرت** | |
| ریاست | ۴۹۵ |
| نفسیات عنفوان شباب | ۴۹۷ |
| سہاگ رات یا بہو رانی کو سیکھہ | ۴۹۸ |
| **مذہب** | |
| دربار رسالت | ۵۰۰ |
| اعتماد محمود | ۵۰۱ |
| **اردو کے جدید رسالے** | |
| طبیہ کالج میگزین | ۵۰۱ |
| جہانگیر | ۵۰۳ |
| مورخ | ۵۰۳ |
| الضیا | ۵۰۳ |
| مطالعہ | ۵۰۴ |

# تبصرے

## ادب

### گوئٹے کا فاؤست

( مترجمۂ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم - اے ' پی ایچ - ڈی -
صفحات ۳۵۰ ' قیمت مجلد چار روپے غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے -
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن )

گوئٹے کا فاؤست اُن کتابوں میں سے ہے جن کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی اور دنیا کے حوادث اور تغیرات اُن کی فضیلت اور شوکت کو کبھی مدھم نہیں کر سکیں گے - اس کتاب میں جرمنی کے سب سے بڑے شاعر اور نقاد نے ڈرامے کے پیرائے میں نظام ہستی کے اُن مسائل اور اسرار پر روشنی ڈالی ہے جس کی تہہ میں بنی نوع انسان کے بر گزیدہ لوگ ہمیشہ رہے ہیں اور آیندہ بھی رہیں گے - شاعر نے اس میں انسان کی روحانی زندگی کی کشمکش کی داستان بیان کی ہے - ایک طرف انسان ہے اور دوسری طرف شیطان - وہ کائنات کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ اُسے مادی لذتوں کی طرف مائل کرنا چاہتا ہے —

یہ کتاب یورپ کے ادب میں بہت بڑا پایہ رکھتی ہے اور اس کا ترجمہ یورپ کی ہر زبان میں ہو چکا ہے - انگریزی میں اس کے متعدد ترجمے موجود ہیں - ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اصل جرمن زبان سے اس کا ترجمہ انجمن ترقی اردو کے لئے کیا ہے اور انگریزی ترجمے بھی پیش نظر رہے ہیں - ڈاکٹر صاحب کے ترجمے کی تعریف میں کچھ کہنا لاحاصل ہے - اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اردو میں نہ تو ایسی اعلیٰ پایہ کی

کتابیں ترجمہ ہوی ہیں اور نہ ایسا اعلیٰ درجے کا ترجمہ ہوا ہے - فاضل مترجم نے شروع میں ۱۱۷ صفحے کا مقدمہ لکھا ہے جس میں گوئٹے سے قبل کے جرمن ادب ' گوئٹے کی زندگی کے حالات اور اس کی تصانیف ' فاؤست کے ماخذ ' فاؤست کی تدریجی نشو و نما ' قصے کے خلاصے اور کتاب کی تنقید پر نہایت خوبی اور تحقیق کے ساتھہ بحث کی ہے - اس ڈرامے نیز جرمن ادب کے سمجھنے کے لئے اس مقدمے کا مطالعہ بہت ضروری ہے —

---

## تاریخ ادبیات ایران

( مصنفہ پروفیسر براؤن مرحوم و مترجمہ سید سجاد حسین صاحب ایم - اے مددگار پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن - قیمت مجلد چار روپے آٹھہ آنے - غیر مجلد چار روپے - انجمن ترقیٔ اردو سے مل سکتی ہے )

یہ کتاب کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں ہماری زبانوں میں تو کیا یورپ کی بھی کسی زبان میں فارسی ادب کی تاریخ پر اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی - یہ حصہ جو اس وقت شایع کیا گیا ہے خاص طور پر نہایت قابل قدر ہے کیونکہ لسانی تحقیق سے ابھی تک ہماری زبان محروم ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ زبان کی تاریخ کا کھوج کیونکر لگایا جاتا ہے اور کہاں کہاں سے اور کیونکر اس کا مسالا جمع کیا جاتا ہے - جسے ہم اب فارسی زبان کہتے ہیں وہ کیا تھی ' کیونکر بنی ' کیا کیا تغیرات ہوے اور کن کن قوتوں اور اسباب نے اس کے بنانے اور بدلنے میں مدد کی - غرض یہ تمام مسائل غور اور مطالعہ کرنے کے قابل ہیں - ترجمہ قابل مترجم نے بہت صاف اور شستہ زبان میں کیا ہے —

---

## شاعر کی رات

( از حضرت جوش ملیح آبادی - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتہ - اعجازالحق قدوسی صاحب نام پلی جدید ( ۱۷۶ ) حیدر آباد دکن

یہ حضرت جوش ملیح آبادی کی اُن نظموں کا مجموعہ ہے جن میں مست رات '

سنہری رات ' برسات کی رات ' صلح کی رات ' اندھیری رات ' وغیرہ وغیرہ عنوانوں کے تحت میں عجیب عجیب کیفیتیں بیان کی گئی ھیں - اب تک حضرت جوش صبح کے شاعر سمجھے جاتے تھے لیکن اب معلوم ھوا کہ رات کی کیفیتیں وہ صبح کی کیفیتوں سے کہیں زیادہ لطف اور دلکشی سے بیان کرسکتے ھیں - رات پردہ پوش ھوتی ھے اور انسان کی آزادی اور تخیل کی جولانی میں زیادہ وسعت پیدا ھوجاتی ھے - جوش جیسے آزاد منش شاعر کو رات دن سے زیادہ عزیز ھے اور یہی وجہ ھے کہ ان نظموں میں ان کا خاص انداز زیادہ اجاگر نظر آتا ھے اور ان میں ایک والہانہ اور مستانہ کیفیت پائی جاتی ھے یہ نظمیں بہت دلکش اور پر لطف ھیں اور پڑھنے کے قابل ھیں —

---

## رفیق تنہای اور دیگر فسانے

( مصنفۂ سید علی عباس حسینی صاحب ایم - اے ' ایل - ٹی ' جوبلی کالج لکھنؤ - قیمت ایک روپیہ — ملنے کا پتہ سید نثار مہدی صاحب گذری پٹنہ سٹی - سید عظم حسین صاحب مدیر ادب لکھنؤ

اس مجموعے میں نو فسانے ھیں جن میں سے بعض مختلف رسالوں میں شایع ھوچکے ھیں - ان فسانوں کو پڑھ کر خوشی ھوئی - قابل مصنف نے ھر فسانے میں تناسب کا بڑا خیال رکھا ھے ' کہیں اعتدال سے آگے قدم نہیں بڑھایا - بعض بعض موقعوں پر نفسیاتی نکات بڑی خوبی سے بیان کر گئے ھیں - زبان بہت شستہ اور اچھی ھے اور موقع محل کے لحاظ سے بہت موزوں ھے اگرچہ آج کل مختصر فسانوں کے لکھنے کا عام رواج ھوگیا ھے لیکن بہت کم اس میں کامیاب ھوئے ھیں اور ھماری راے میں خوش نصیب کامیاب مصنفوں میں سید علی عباس حسینی صاحب کا بھی شمار ھے —

---

## دختر فرعون

( حصہ دوم مترجمہ لطافت حسین خاں صاحب صفحات ۳۳۲ قیمت دو روپے - انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ھے )

ایک جرمن ناول کا ترجمہ ھے اس کے پہلے حصے پر اس سے قبل تبصرہ

ہو چکا ہے یہ اسی کا دوسرا حصہ ہے - مصنف (جارج مارٹنز ایبرس) مصریات کا بڑا ماہر ہے - اس نے مصر و ایران کے قدیم تمدن کو ناول کے پیرائے میں نہایت خوبی سے دکھایا ہے - جو معلومات اس ایک ناول کے پڑھنے سے حاصل ہوتی ہیں وہ بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ سے بھی ممکن نہیں - یہ ایک خاص قسم کا ناول ہے اور اپنے طرز کا بے نظیر ہے - ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مطالعہ نہایت دلچسپ اور مفید ہوگا - یہ شروع سے آخر تک عجیب و غریب معلومات اور واقعات سے لبریز ہے اور اس کے ساتھہ ناول کی دلچسپی میں کہیں فرق نہیں آتا —

---

## ارمغان محبوب

اس رسالے کے شروع میں راجہ نرسنگھہ راج بہادر عالی نے اپنی کچھہ رباعیات جو حمد میں ہیں درج کی ہیں - اس کے بعد اپنے عزیز بھائی رائے محبوب راج محبوب کا مرثیہ اور نوحے ہیں - آخر میں مرحوم کے دوست اور عزیز و اقربا نے اُن کی وفات کی جو تاریخیں کہی ہیں وہ درج ہیں - ان تاریخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کس قدر مقبول اور ہر دلعزیز تھے —

---

## گلزار عثمانی

یہ مولانا محمد عبدالقوی فانی، ایم - اے، معلم شعبۂ فارسی و اردو جامعۂ لکھنؤ کے نو فارسی قصائد کا مجموعہ ہے - ان میں سے آٹھہ قصیدے اعلیٰ حضرت بندگان عالی حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی مدح میں ہیں اور آخری قصیدہ شہزادوں کی کدخدائی کی تہنیت میں ہے - بعض قصائد قاآنی کی تتبع میں لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں - ان کے کلام میں زور اور بلندی پائی جاتی ہے اور فارسی زبان پر پوری قدرت حاصل ہے —

## فرانسیسی افسانے

مرتبہ عزیز احمد صاحب طالب علم کلیہ جامعہ عثمانیہ
حیدر آباد دکن - چھوٹی تقطیع صفحات ۸۲ - لکھائی
چھپائی اور کاغذ معمولی - قیمت ۱۲ آنے ' ملنے کا پتہ :-
مکتبہ ابراھیمیہ حیدر آباد دکن

دنیا کے شاھکار افسانوں کے سلسلے کے تین حصوں پر اس سے قبل تبصرہ ہو چکا ہے - یہ اس سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے - اس کے مرتب عزیز احمد صاحب ہیں ' اس میں کل نو افسانے ہیں ' جو مختلف فرانسیسی مصنفوں کے لکھے ہوے ہیں - افسانے مشہور ہیں - ان کے ترجمے یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں - ان میں سے اکثر مرتب کے مترجمہ ہیں اور بعض دوسروں کے ' جو کہیں سے نقل کر لئے گئے ہیں ' اور حصوں کے مقابلے میں ان افسانوں کے ترجمے اچھے ہیں ' حالانکہ انگریزی سے ترجمہ ہوئے ہیں تاہم ترجمہ در ترجمہ میں اصل سے قریب معلوم ہوتے ہیں - زبان اور بیان دونوں افسانوں کے لحاظ سے نامناسب نہیں —

( چ )

---

## اِنقلاب دھلی

مرتبہ جناب مولانا نظامی بدایونی ایڈیٹر ذوالقرنین - چھوٹی تقطیع صفحات ۱۲۰ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ - قیمت دیڑھ روپیہ - مرتب کے پتے ( بدایوں یوپی ) سے مل سکتی ہے -

مغل اعظم عالم گیر کی وفات ہی سے مغلیہ سلطنت کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگی تھیں ' باھمی نفاق امرا کی سازشوں اور ارکان حکومت کی خود غرضیوں اور کوتاہ اندیشیوں نے رفتہ رفتہ اس عظیم الشان سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا یہاں تک کہ قلم رو مغلیہ کا نام صرف قلعہ معلی کی چار دیواری تھی - پونے دو سو سال قبل ہی بقول ' سودا ' ہند کی وسیع و عریض سلطنت کے بائیس صوبوں کا شہنشاہ کول ( علی گڈھ ) کی فوجداری کے اختیار سے

محروم تھا :—

کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند جو ایک شخص تھا بائیس صوبہ کا خاوند
رہی نہ اُس کے تصرف میں فوجداری کول

اس عرصے میں پیہم کشت و خون اور قتل و غارت کے ہنگامے برپا ہوتے رہے ' دہلی جو پایہ تخت تھی اور تمام ہندوستان کی جان ' ہر وقت ان حوادث کا نشانہ بنی رہی ' اس کی رونق و آبادی اور چہل پہل ہر آن گھٹتی گئی یہاں تک کہ سنہ ۵۷ کی شورش ہوئی ' اور وہ تخت و تاج جس کو بابر و ہمایوں نے بڑی اولوالعزمی اور جانبازی سے حاصل کیا تھا نہایت بزدلی اور کمزوری سے چھن گیا - اس کے ساتھ ہی دہلی جو علوم و فنون کا مرکز ' تہذیب و تمدن کا گہوارہ ' مال و دولت کا گھر تھا ' بے رونق ' مفلس سنسان اور ویرانوں جنگل بن گیا —

آغاز انحطاط سے لے کر اس شورش تک اکثر شاعروں نے دہلی کی تباہی و بربادی کا رونا رویا ہے ' یہ شاعر دہلی کے خراب و برباد اور تباہ و تاراج ہونے کا دکھڑا نہیں سناتے ہیں بلکہ اس عظیم الشان سلطنت کے ملبا ہوت اور تباہ و غارت ہونے پر خون کے آنسو روتے ہیں جس کا پایہ تخت دہلی تھی - یہ نظمیں دراصل دکھ بھری آواز ہے جو عبرت اور غیرت دلاتی ہے اور آئینہ ہے جس میں ایک اولوالعزم قوم کے ادبار و انحطاط اور زوال و نحوست کی تصویر نظر آتی ہے -

حضرت نظامی بدایونی نے یہ بہت مفید کام کیا کہ ایسی نظمیں جس قدر مل سکیں جمع کرلیں اور ان کو خاص اہتمام سے طبع کرکے شائع کیا ہے - اس میں (۴۷) شاعروں کی (۶۷) نظمیں ہیں - یہ بجائے خود ہماری شاعری کا عمدہ نمونہ ہے - اس میں بعض نظمیں بہت بلند پایہ رکھتی ہیں - ' سودا ' کی نظمیں پونے دو سو سال قبل لکھی گئی ہیں لیکن جو حال اس زمانے کا تھا اس کو ہو بہو بیان کیا ہے ' یہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں بعض نظموں میں تغزل کا رنگ غالب ہے - لیکن بہت کم درد اور اثر سے خالی ہیں مولانا حالی کی نظم بہت دلدوز ہے —

حضرت نظامی بدایونی نے سنہ ۵۷ کی شورش کے بعد کے شاعروں کی نظمیں جمع کی ہیں اور قدیم شعرا میں سودا کو لیا ہے - جب قدیم شاعروں کو

انھوں نے اس بزم میں جگہ دی تو کیا مناسب نہ تھا کہ بعض مشہور شاعروں کے کلام سے مسلسل نظمیں نہ ملتیں نہ سہی مختلف اشعار ہی جمع کرلئے جاتے - مثال کے لئے ' میر کے ضخیم کلیات میں متعدد شعر ایسے ہیں جو اس موضوع سے تعلق رکھتے ہیں - ان میں ایک ایک شعر کئی کئی نظموں سے زیادہ پر تاثیر ہے - کیا کہا ہے —

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اس قسم کے اشعار کے علاوہ میر کے کلیات میں دو مخمس ایسے ہیں جو کم و بیش اسی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں میر کے علاوہ ان کے مشہور معاصرین کے کلام میں اور بعد کے شعرا کے کلام میں بھی ایسے اشعار اور نظمیں موجود ہیں - اگر تلاش سے ان کو جمع کر لیا جاتا تو بہت اچھا مجموعہ تیار ہو جاتا —

موجودہ کتاب میں بھی کافی نظمیں ہیں اور عمدگی سے مرتب اور طبع ہوئی ہیں - لائق مرتب نے ہر شاعر کے مختصر سے حالات بھی لکھے ہیں تائٹل بہت خوبصورت ہے ' اس پر ' سودا ' غالب ' ظفر ' حالی ' مجروح اور داغ کی تصویریں ہیں —

کتاب میں ایک جگہ رکت ( بمعنی خون ) کو رکت لکھا ہے - اور کلیات کو بجائے مذکر کے مونث ' صفحہ ۴۹ " ان کی ایک کلیات .. ..... ... بدایوں میں طبع ہوئی ہے " —

( چ )

---

# تصوف

## صبغۃ اللہ

( یعنی مرقعۂ تصوف کا پہلا مقدمہ مصنفۂ شیخ غلام محمد احمد ایم - اے ' ایم - او - ایل ' مجسٹریٹ جموں صفحات ۱۸۴ قیمت قسم اول ایک روپیہ دس آنے ' قسم دوم ایک روپیہ چھ آنے ملنے کا پتہ نواز بک ایجنسی محلہ جو لاهکہ جموں توئی )

فاضل مصنف نے تصوف اسلام پر جو کتاب لکھنی شروع کی ہے یہ اس کا پہلا مقدمہ ہے - باقی مقدمے اور حصے کچھ تو لکھے جا چکے ہیں اور کچھ زیر تالیف ہیں - ان کا ارادہ ان سب حصوں کو انگریزی فارسی اور عربی ترجمہ کرنے کا ہے - انہوں نے ایک بہت بڑا کام اپنے ذمے لیا ہے اور بڑے خلوص اور مستعدی سے انجام دے رہے ہیں - وہ مستشرقین کے اس خیال سے سخت خفا اور بیزار ہیں کہ اسلامی تصوف کے اکثر اصول اس کے اپنے نہیں یعنے اسلامی نہیں بلکہ اوروں کے نظام فلسفہ سے لئے گئے ہیں - اس مقدمے میں انہوں نے اس خیال کی تردید کی ہے - فاضل مصنف رموز تصوف کو حقایق اسلام سمجھتے ہیں اور کسی حال میں بھی اُسے اسلام سے جدا خیال نہیں کرتے - اور اس دعوے کو غلط کہتے ہیں کہ شرائع اسلام میں ابتداً حقائق و دقائق تصوف کا وجود نہ تھا —

اس مقدمے میں تصوف کے بہت سے ابتدائی اور ضروری مسائل پر بحث آگئی ہے - جو لوگ تصوف سے ذوق رکھتے ہیں یا اسلامی تصوف کو سمجھنا چاہتے ہیں اُنہیں یہ کتاب ضرور مطالعہ کرنی چاہئے - قابل مصنف کے طرز بیان میں جوش اور خلوص پایا جاتا ہے - انہوں نے مستشرقین اور انگریزی دان طلبہ پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی ہے اور ان کے خیالات سے بیحد سوء ظنی کا اظہار کیا ہے - ہماری راے میں اس قسم کے مباحث میں اس قدر سوء ظنی اور تشدد مناسب نہیں - اور یہ کہنا کہ اسلامی تصوف پر بیرونی اثر مطلق نہیں پڑا زیادتی ہے - جب کہ مذاہب ایک دوسرے کے اثر سے نہیں بچے تو دوسرے عقائد اور تعلیمات کا کیا ذکر ہے —

---

## انتخاب دیوان شمس تبریز

( از ڈاکٹر نکلسن مرتبہ جناب عبدالمالک آروی صاحب
دفتر ایوان اشاعت گورکھپور - قیمت دو روپے آٹھ آنے )

جناب عبدالمالک صاحب آروی نے پروفیسر نکلسن کے انتخاب دیوان شمس تبریز پر نہایت محققانہ مقالہ لکھا ہے اور اس ضمن میں تصوف، صوفی شاعری اور شعرا اور دوسرے اہم مسائل پر جن کا تعلق تصوف سے ہے بڑی قابلیت سے بحث کی ہے - ان کے ماخذ زیادہ تر انگریزی اور فارسی تذکرے اور کتابیں ہیں - اس کتاب کے مطالعہ سے فاضل موتب کی وسیع نظری اور تنقیدی قوت کا اظہار ہوتا ہے - آخر میں مولانا روم کے دیوان کا (جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے) انتخاب دیا ہے - انتخاب تو صرف پچیس چھبیس صفحے پر ہے لیکن باقی تمام کتاب یعنے تقریباً ۲۰۹ صفحات پر دوسری متعلقہ بحثیں ہیں جو محققانہ معلومات سے لبریز ہیں - لیکن تعجب ہے کہ فاضل مصنف نے سند میں حضرت خواجہ معین‌الدین چشتی اور غوث‌الاعظم عبدالقادر جیلانی (رح) کے اشعار جا بجا پیش کئے ہیں حالانکہ دیوان جس میں سے یہ اشعار نقل کئے گئے ہیں اُن سے خواہ مخواہ منسلوب کردئے گئے ہیں - ہمارے ہاں بارہا ایسا ہوا ہے کہ بڑے بڑے بزرگوں اور اولیا کے نام سے کتابیں لکھ کر شائع کردی گئیں اور غلطی سے انہیں کی سمجھی گئیں - محققانہ بحثوں میں ان سے سند لینے میں احتیاط کی ضرورت ہے —

---

## آئینۂ معرفت

(مصنفۂ سید اعجاز حسین اعجاز صاحب ایم - اے، لکچرر شعبہ اردو - الہ آباد یونیورسٹی - مجلد قیمت دو روپے لالہ نرائن لعل بک سیلر، کٹرہ روڈ، الہ آباد) —

دراصل مصنف کا یہ وہ مقالہ ہے جو انہوں نے سنہ ۱۹۲۹ ع میں الہ آباد یونیورسٹی کے ری سرچ اسکالر کی حیثیت سے تحریر فرمایا تھا اور اب کتاب کی صورت میں شائع ہوا ہے - پہلے باب میں تصوف کی ابتدا اور ترقی

اور فرقۂ ملامتیہ کا ذکر ہے - دوسرے میں شریعت ' طریقت ' معرفت ' حقیقت اور صوفیوں کے فرقوں کا بیان ہے - تیسرے میں فارسی صوفیانہ شاعری اور شعرا اور چوتھے میں پرانی اردو شاعری اور پانچویں میں ولی سے لیکر اب تک کی صوفیانہ شاعری اور شعرا سے بحث ہے - تمہیدی بحثوں اور فارسی صوفیانہ شاعری پر ۱۷۶ صفحے لکھے ہیں ' اردو شاعری پر جو اصل موضوع ہے ' ۱۱۰ صفحے ہیں —

اگرچہ ابتدائی تین باب میں جو اصل موضوع کا مقدمہ ہیں تمام بحثیں سرسری ہیں لیکن اصل موضوع یعنے اردو صوفیانہ شاعری پر جو بحث ہے وہ بھی کافی نہیں —

صوفیوں کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں ایک تو عملی ' دوسرے علمی اور تیسرے رسمی - عملی تو وہ ہیں جنھوں نے ریاضت اور مجاہدت سے اپنے نفس کا تزکیہ کیا ہے اور اعلیٰ مقامات پر پہنچے ہیں اور یہی اصل صوفی ہیں علمی وہ ہیں جنھیں تصوف کے علم و اصطلاحات پر عبور ہے مگر عملی طور پر کبھی اسے حاصل نہیں کیا - رسمی وہ ہیں جن میں عمل ہے نہ علم چند سنی سنائی باتوں یا اصطلاحیں جانتے ہیں اور بس —

اردو زبان کے دکنی یا گجراتی صوفیوں میں بیشک بہت سے حقیقی صوفی تھے لیکن شاعر کہلانے کے مستحق صرف چند ہی تھے - وہ شعر اس لئے کہتے تھے کہ یہ تعلیم کی اشاعت کا مقبول طریقہ تھا اور فخر کا نہ زیادہ رواج تھا اور نہ یہ مقبول تھی - اس میں مصنف نے سلطان قطب شاہ کو بھی شریک کرلیا ہے - اگر قطب شاہ صوفی شاعر تھے تو پھر اردو کا کوئی شاعر بھی غیر صوفی نہیں ہوسکتا —

دوسرے اور بعد کے دور میں انہوں نے میر درد ' میرتقی ' آتش ' غالب اور زندہ شعرا میں آسی ' عزیز اور اقبال کو لیا ہے - اصل یہ ہے کہ ان میں سوائے میر درد کے کوئی بھی صوفی یا صوفی شاعر نہیں - میر درد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردوے معلیٰ کی اردو شاعری میں تصوف کا رنگ پیدا کیا وہ اعلیٰ درجے کے درویش اور صوفی تھے اور اُن کا کلام صحیح صوفیانہ شاعری کا نمونہ ہے - اور انہیں کا اثر تھا کہ بعد کے شعرا مثلاً میر تقی وغیرہ نے اس روش کو کسی قدر اختیار کیا - زندہ شاعروں میں

عزیز ' اقبال اور آسی کو صوفی شاعر کہنا ظلم ہے - ان سے تو کہیں زیادہ بے نظیر شاہ اس کے مستحق ہیں - اور جب آتش صوفی شاعر ہے تو کیوں نہ نظیر کو صوفی شاعر کہا جائے —

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ قدیم اردو کے صوفی شعرا میں مصنف نے قطب شاہ کو بھی داخل کیا ہے لیکن جو کلام نقل کیا گیا ہے وہ قطب شاہ کا نہیں ہے بلکہ اس کے چچا سلطان قلی قطب شاہ کا ہے - اس باب کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان قدیم شعرا کا کلام نہیں پڑھا اس لئے لازم تھا کہ وہ صحیح طور پر حوالے دیتے کہ یہ چیزیں انہیں کہاں سے دستیاب ہوئیں ہیں ہر مصنف اور مولف کے لئے مگر خاص کر ایک ریسرچ اسکالر ( ادبی محقق ) کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ وہ ہر خیال اور کلام کے لئے جو اس نے کسی دوسری جگہ سے حاصل کیا ہے ٹھیک ٹھیک حوالہ درج کرے - اس سے ( جیسا کہ اکثر کم علم اور محدود نظر کے مولف خیال کرتے ہیں ) اُن کی کم علمی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے —

خاتمے پر مصنف نے لکھا ہے کہ " اردو شاعری میں عشق و حسن کے چرچے کا ایک بڑی حد تک ذمہ دار تصوف ہے " - ممکن ہے ایسا ہو لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اردو شاعری میں یہی چرچے نہیں بلکہ دوسرے مضامین بھی بھی جنہیں وہ تصوف کا اثر سمجھتے ہیں فارسی شاعری سے آئے ہیں اور ہمارے شاعروں نے اکثر و بیشتر فارسی شعرا کی تقلید کی ہے —

---

## حکمت و معاشرت

### ریاست

( از افلاطون مترجمۂ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

ایم - اے ' پی ایچ - ڈی پرنسپل جامعۂ اسلامیہ دھلی - صفحات ۶۶۸ ' قیمت فی جلد مجلد پانچ روپے ساڑھے چار روپے غیر مجلد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے )

---

بقول فاضل مترجم کے یہ " دنیا کے سب سے بڑے مصنف کی سب سے اہم کتاب اور " فلاطون کے شجر علم کا پختہ ثمر " ہے - اس سے بڑھ کر اس کتاب کی کوئی تعریف نہیں ہوسکتی اور یہ سچی تعریف ہے - اس کتاب کا موضوع کیا ہے - وہ بھی ہم قابل مترجم کے مقدمے ہی سے نقل کرتے ہیں کیونکہ اس سے بہتر طور پر یہ حقیقت ادا نہیں ہوسکتی --

" اِن ناموں سے ( ریاست اور تحقیق عدل ) یہ سمجھ لینا کہ یہ سیاست یا قانون پر ایک تصنیف ہے غلط ہوگا - سچ یہ ہے کہ اس میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے ' البتہ زیادہ توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے ' اس لئے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پر معلوم ہوتا ہے - لیکن یہ نہیں ہے کہ فکر و خیال کی دنیا کو یک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہو - فلسفہ کی بلندیاں دیکھنی ہوں تو عین خیر میں سب چیزوں کے اتحاد کا جلوہ بھی اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے ' اخلاق کا سبق لینا ہو تو اس میں روح انسانی کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق موجود ہے : تعلیم کے مسائل پر روشنی درکار ہو تو بقول روسو فن تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی گئیں اُن میں یہ سب سے بہتر ہے ' - سیاسی زندگی میں رہنمائی کے لئے یہ ایک جدید ہئیت اجتماعی اور اس کے اداروں کی جیتی جاگتی تصویر لا کھڑی کر دیتی ہے اور انسانی جماعتوں کے تغیر ' عروج و زوال کے اسرار سربستہ کی کنجی کی تلاش ہو تو فلسفۂ تاریخ کے یہ مشکل مسائل بھی اس میں پانی کر دئے گئے ہیں " --

اس کے بعد بھی اگر کوئی پڑھا لکھا شخص ( خصوصاً جب کہ اس کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے ) اس کتاب کو نہ پڑھے تو اس کے حق میں سوائے اس کے کہ دعائے خیر کی جائے اور کچھ نہیں کہہ سکتے --

اس قسم کی حکیمانہ قدیم کتابوں کا ترجمہ نہایت دشوار ہوتا ہے لیکن یہ ترجمہ ایسی صاف ' شستہ اور پختہ زبان میں کیا گیا ہے کہ فاضل مترجم

کی محنت کی داد دینے کو بے اختیار جی چاہتا ہے —

---

## نفسیات عنفوان شباب

( تصنیف پروفیسر اشپرانگر ' استاد فلسفۂ تعلیم و فلسفۂ تمدن برلن یونیورسٹی - مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم - اے ' پی ایچ ' ڈی - صفحات ( بڑی تقطیع ) ۳۰۸ - مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی )

---

شباب کی منزل زندگی میں سب سے زیادہ کٹھن ہے اور اس کا جاننا اور سمجھنا اس سے بھی زیادہ کٹھن ہے - پروفیسر اشپرانگر ہی سا عالم متبحر اس دشوار کام کو انجام دے سکتا تھا - کیونکہ وہ علاوہ فاضل اجل ہونے کے فلسفۂ تعلیم اور فلسفۂ تمدن کے نامور پروفیسر بھی ہیں - ان کو پندرہ سولہ سال سے ہزارہا نوجوانوں سے سابقہ رہا ہے - نیز انہیں جرمنی کی "تحریک شباب" سے جس میں یونیورسٹی کے طالب علموں کے علاوہ اسکولوں کے لاکھوں لڑکے شامل ہیں ' بہت گہرا تعلق ہے - انھوں نے بڑے غور سے ان نوجوانوں کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے اور سالہا سال کی محنت اور فکر کا نتیجہ یہ کتاب ہے - اس کتاب کے موضوع کے متعلق کچھ کہنا بیجا طول ہوگا - یوں سمجھئے کہ یہ شیخ سعدی کے اس جملہ کی تشریح ہے " در ایام جوانی چنانکہ افتد تو دانی " مگر یہ محض حسن و عشق تک محدود نہیں بلکہ نوجوانوں کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو کو حکیمانہ انداز میں بڑی صفائی اور سلاست سے بیان کیا ہے —

مترجم اس کے ڈاکٹر عابد حسین صاحب ہیں - یہ فاضل پروفیسر کے شاگرد ہیں اور ان میں اُستاد کی بعض خوبیوں کی صاف جھلک نظر آتی ہے - یہ ادیب بھی ہیں اور حکیم بھی اور اس کے علاوہ مترجم بھی بے نظیر ہیں - ترجمے کو لوگ معمولی چیز سمجھتے ہیں لیکن اعلیٰ پائے کی تصانیف کا ترجمہ معمولی تالیف و تصنیف سے کہیں زیادہ مشکل اور صبر طلب اور

کہیں زیادہ مفید اور بیش بہا ہوتا ہے —

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ اصل جرمن زبان سے کیا ہے اور ابھی یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمہ نہو نے پایا کہ اردو میں ترجمہ ہوگیا اس پر ہم جامعۂ ملیہ اور قابل مترجم کو مبارک باد دیتے ہیں - جب مصنف ایسا اور مترجم ایسا ہو ' ایک اُستاد اور دوسرا شاگرد اور دونوں ادیب ' حکیم اور معالم تو اس کے بعد کتاب یا ترجمہ کی تعریف میں کچھ کہنا لا حاصل ہے —

جرمنی میں اس کتاب کی اتنی قدر ہوئی کہ پہلا اڈیشن چند مہینے میں چھپ کر فروخت ہوگیا - دیکھیں یہاں اس کی کیا قدر ہوتی ہے —

---

## سہاگ رات یا

## بھورانی کو سیکھ

( مصنفہ پنڈت کرشنا کانت مالوی صاحب ' مترجمہ جگمت موہن لعل صاحب " رواں " ایم - اے ایل ایل بی چھوٹی تقطیع ' صفحات ۴۶۵ درمیانی ٹائپ ' طباعت اور کاغذ عمدہ - قیمت درج نہیں - پنڈت جی کے پتہ ( الہ آباد ) سے مل سکتی ہے —

---

اصلاح معاشرت کے باب میں ہندوستان کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے ' خصوصاً صنف نازک کے خیالات اور اعتقادات کی اصلاح نہایت ضروری ہے - سہاگ رات اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ کس طرح ایک نوجوان لڑکی مکمل عورت اور کامل انسان بن سکتی ہے ' اور ازدواجی زندگی کو خوش گوار و سود مند بناکر زندگی کی مہم کامیابی کے ساتھ سر کرسکتی ہے - اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوے لایق مصنف نے خط

و کتابت کے پیرائے میں اس کو تحریر فرمایا ہے ' بڑی بہن اپنی چھوٹی چچا زاد بہن کو جس کی حال میں شادی ہوئی ہے خطوں کے ذریعہ ازدواجی زندگی کے رموز سے آگاہ کرتی ہے - اس میں کل ۲۶ خط ہیں جو ۴۵۶ صفحوں پر مشتمل ہیں ' شادی سے لے کر صاحب اولاد ہونے تک اور اس کے بعد کے زمانے سے متعلق تمام ضروری اور لازمی باتیں درج ہیں - ان میں معاشرتی ' اخلاقی ' مذہبی - طبی غرض زندگی سے متعلق ہر قسم کے معاملات سے بحث کی ہے - یہ تمام باتیں کوئی نئی اور اجنبی نہیں ' تاہم ان کو جس دلچسپ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ بہت ہی موثر اور سبق آموز ہے - ہر شعبہ زندگی اور مبحث و موضوع کے لحاظ سے جگہ جگہ رشیوں ' مقدس کتابوں اور مغربی مشاہیر خواص تنقید کے حوالے دئے ہیں جن سے کتاب کا پایۂ اعتبار بلند تر ہوگیا ہے اکثر مقامات اس کتاب میں ایسے تھے جہاں اندیشہ تھا کہ مصنف کا قلم عریانی اختیار کرے ' لیکن لایق مصنف نے پردہ ہی پردہ میں نہایت موثر طریقہ سے ان مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہیں متانت کو ہاتھہ سے جانے نہیں دیا —

کتاب ختم کرتے ہی آخر میں مولانا " حالی " کی مشہور نظم " چپ کی داد " پر نظر پڑتی ہے جس میں عورتوں کی عظمت و سربلندی کو نہایت موثر انداز میں جتایا گیا ہے اور ان کو اس پردے میں نہایت دل نشین سبق دئے ہیں - یہ نظم بہت ہی مناسب محل درج کی گئی ہے —

کتاب در اصل ہندی میں لکھی گئی تھی - ہندی داں طبقے میں اس کی کافی شہرت ہوئی ضرورت تھی کہ اردو میں بھی منتقل ہو جاتی ' مقام مسرت ہے کہ خود پنڈت جی نے اپنے ایک دوست جناب " رواں " صاحب سے اس کا ترجمہ کرایا ہے - زبان کی چند فیر اہم فرو گذاشتوں کے قطع نظر ترجمہ بہت صاف ستھرا اور رواں ہے - ترجمہ میں اصل کتاب کے تیور نظر آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کا طرز تحریر مربوط و مدلل ہے —

امید ہے کہ یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مفید اور سبق آموز ثابت ہوگی —

( چ )

# مذہب

## دربار رسالت

مولفہ جناب فضل الدہ خاں صاحب شاہ جہاں پوری
ناظم مدرسہ ہاشمیہ بمبئی نمبر ۳ چھوٹی تقطیع ،
صفحات ۱۳۶ ، لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجے کے
قیمت ۸ آنے ، مولف کے پتہ سے مل سکتی ہے —

---

اس مختصر کتاب میں آنحضرت صلعم کی حیات و سیرت اور تعلیمات کا ذکر ہے - کل سترہ باب ہیں ، پہلے باب میں ظہور نبوی سے قبل کے عرب کی حالت کا نقشہ دکھایا گیا ہے - اس کے بعد ۱۵ ابواب میں رسول اکرم کی حیات ، اسلام کی تعلیم اور اس کی اشاعت کے واقعات ہیں ، آخری باب میں غیر مسلم مشاہیر کی آرا درج کی گئی ہیں جو آنحضرت اور اُن کی تعلیم کے باب میں ظاہر کی گئی ہیں —

---

کتاب گو مختصر ہے لیکن اس میں تمام ضروری اور قابل ذکر واقعات درج ہیں ، کتاب کی تبویب و ترتیب بھی اچھی ہے - ہر باب کے آخر میں چند سوالات طالب علموں کے آموختے اور یاد تازہ کرنے کے لئے دئے ہیں - کہیں کہیں یوروپین مصنفین کے اقتباسات دئے ہیں ، جن کی ضرورت اس کتاب میں نہ تھی ، اُن سے بہتر ، وقیع مستند اور اصل ماخذ موجود ہوتے ہوے بچوں

کی اس مختصر کتاب میں ان کا داخل کرنا کچھ مناسب نہیں —

اگر زبان و بیان میں کسی قدر سلاست و سہولت کا خیال رکھا جاتا تو چھوٹی جماعت کے بچوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی ' بحالت موجودہ مڈل کلاس کے طالب علموں کے لئے مفید ہے —

( چ )

---

## اعتماد محمود

( مصنفۂ مولوی حافظ علی خاں صاحب عزیز ' اسدی سابق ناظم دینیات مسلم اسکول جے پور - قیمت مجلد بارہ آنے ' غیر مجلد آٹھ آنے - ہیڈ ماسٹر صاحب مڈل اسکول جے پور سے مل سکتی ہے ) —

---

قابل مصنف نے قصے کے پیرائے میں جو سراسر حقیقت پر مبنی ہے بڑی خوبی سے اسلام کی خوبیوں کو بیان کیا ہے - محمود کوئی فرضی نام نہیں اس پردے میں آنحضرت صلعم کی زندگی کے حالات اور اُن کے زبردست کیریکٹر کو بیان کرکے اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا ہے - زبان بہت اچھی اور شستہ اور پیرایۂ بیان بہت خوب ہے —

---

# اردو کے جدید رسالے

## طبیہ کالج میگزین

یہ سہ ماہی رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے طبیہ کالج سے شایع

ہونا شروع ہوا ہے - اگرچہ اڈیٹر اس کے طالب علم ہیں لیکن نگران کالج کے قابل پرنسپل ڈاکٹر عطا اللہ بھٹ ایم - ڈی ( برلن ) ہیں اور اڈیٹوریل بورڈ میں کالج کے فاضل طبیب اور ڈاکٹر شریک ہیں —

رسالہ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں اعتبار سے قابل تعریف ہے اور ہم رسالے کے کارکنوں کو اُن کے سلیقے ' محنت اور خوبی مضامین پر دل سے مبارک باد دیتے ہیں —

تمام مضامین تحقیق اور غور کے بعد لکھے گئے ہیں - حکیم عبداللطیف ( فلسفی ) صاحب کا مضمون تجدید طب کے تحت عناصر پر بہت محققانہ ہے اور قدیم و جدید معلومات پر نہایت عالمانہ اور منصفانہ بحث کی ہے اسی طرح دوسرے مضامین مثلاً محمد زکریا رازی ' احتباس لحمث ' تحذیر صحت و مختلف امراض میں کیفیت الدم وغیرہ خاص حیثیت رکھتے ہیں علاوہ ان کے عام فائدے اور معلومات کے متعلق قبض ' حیاتین ' تمباکو ' مکھی وغیرہ کے مضامین بہت مفید ہیں - زبان اور طرز بیان حتی الامکان ایسا ہے کہ صاحب فن اور عام لوگ دونوں مستفید ہوسکتے ہیں —

یوں تو طبی رسالے ہمارے ملک میں متعدد شایع ہوتے ہیں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اس سے بہتر رسالہ اب تک شایع نہیں ہوا - اگر اس کا معیار یہی رہا تو اس میں شک نہیں کہ یہ طب کی بہت بڑی خدمت کرے گا اور اہل ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچائے گا - ہمارے ملک میں صحت و امراض سے متعلق ضروری اور معمولی باتوں سے عام نا واقفیت ہے اگر اس قسم کی معلومات کی جیسی کہ اس رسالے میں درج ہیں عام اشاعت کی جائے تو اس سے نہ صرف ہمارے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ ہم اپنی صحت کو بہت بہتر بناسکیں گے اور بہت سی تکلیفوں سے نجات پا جائیں گے —

رسالہ کا حجم بڑی تقطیع پر ۱۷۰ صفحے ہے - لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ درجے کا - چندہ سالانہ چار روپے ' جو رسالے کی خوبیوں کے مقابلے میں

کچھہ بھی نہیں —

---

## جہانگیر

یہ نیا ادبی ماہانہ رسالہ لاہور سے شایع ہوا ہے - اڈیٹر محمد احمد خاں صاحب درانی اور سید شبیر حسین صاحب قیس حیدرآبادی ہیں زیادہ تر نظمیں اور فسانے ہیں - شعرا میں حضرت جوش ملیح آبادی ' حضرت اصغر گونڈوی ' ایم - حسن لطیفی صاحب ' حضرت جاہل کی نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں - لطف ذوق کے لئے بعض غیر زبانوں کی نظموں کے ترجمے کئے گئے ہیں - حجم بڑی تقطیع پر ۱۲۰ صفحہ ہے - قیمت سالانہ صرف تین روپے —

---

## مورخ

یہ چھوٹی سی تقطیع کا چھوٹا سا ماہانہ رسالہ فیض آباد سے مولوی سید علی اظہر ( عابدی ) کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے - تاریخ میں تحقیق کی بہت گنجائش ہے اور اگر صحنت اور قابلیت سے کام کیا جاے تو بہت مفید اور بڑا کام ہوسکتا ہے - اس رسالے میں طویل مضامین کی گنجائش نہیں - اور اگرچہ اس میں محققانہ مضامین درج نہیں ہیں تاہم جو مضامین اس کے لیے لکھے گئے ہیں وہ دلچسپ اور مفید ضرور ہیں - تاریخی مضامین میں صحت واقعات کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے اور جو واقعہ بھی لکھا جاے اس کے لیے سند حوالہ درج کرنا لازمی ہے - سالانہ چندہ دو روپے چار آنے ہے —

## الضیا

یہ عربی زبان کا ماہانہ رسالہ لکھنؤ سے مولوی مسعود عالم صاحب ندوی کی زیر ادارت ماہ محرم سے شایع ہونا شروع ہوا ہے - لکھنؤ سے پہلے بھی ایک

رسالہ اسی قسم کا شایع ہوا تھا لیکن وہ کچھہ بہت دنوں تک نہ چلا لیکن اِس رسالے نے اپنے معاونین ایسے پیدا کئے ہیں جس سے یہ توقع ہوتی ہے کہ یہ رسالہ کامیابی سے چلے گا - شاید یہ وقت بھی اس کے لئے مناسب ہے - یہ ادبی اور علمی رسالہ ہے جیسا کہ اس کے مضامین سے ظاہر ہے - جو لوگ عربی زبان کے دلدادہ ہیں انھیں اس سے بہتر رسالہ ہندوستان میں نہیں مل سکتا - افسوس ہے کہ رسالہ لیتھو میں چھپتا ہے حالانکہ عربی کے ٹائپ بہت اچھے موجود ہیں اگر ٹائپ میں چھپتا تو اس کا حسن ظاہری بھی بڑہ جاتا --

سالانہ چندہ تین روپے آٹھہ آنے ہے —

---

## مطالعہ

یہ ہفتہ وار جریدہ لدھیانہ سے ایم - حسن لطیفی صاحب بی - اے ( ڈپلوما یافتہ لندن اسکول آف جرنلزم ) کی زیر ادارت اسی سال جاری ہوا ہے پورا جریدہ خود حضرت اڈیٹر لکھتے ہیں - تنہا نگاری کی یہ پہلی مثال ہے - یہ ہر شخص کا کام نہیں - ہم لطیفی صاحب کے عزم و ہمت کی داد دیتے ہیں - انھوں نے خوب سمجھہ کر اس کام کو اپنے ہاتھہ میں لیا ہے - وہ اپنے ہم وطنوں کو اپنے خیالات سے فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں - اُن کا مقصد نیک ہے اور اپنی کامیابی پر وثوق رکھتے ہیں - یہ ہفتہ وار ہے اور اس سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہئے کہ معمولی اخبار ہے - یہ ایک ادبی اور علمی جریدہ ہے اور فاضل اڈیٹر اپنی جدید اور اعلیٰ معلومات سے خیالات میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں - ان کی تحریر میں شان و شکوہ ہے - وہ معمولی الفاظ اپنے جریدہ کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اکثر ان کی بجاے شاندار الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں اور جب نہیں ملتے تو خود وضع کرلیتے ہیں - البتہ یہ بات دل میں کھٹکتی ہے کہ یہ پر شکوہ طرز بیاں ایک جریدہ کے لئے کہاں تک مناسب ہے ؟

ہمیں تعجب ہوا ہے کہ ایک ایسا صاحب عزم ادیب بعض اخباروں کی تقلید سے اس قدر برہم ہو کہ آپے سے باہر ہو جاے اور جواب میں ایسے الفاظ اور فقرے لکھہ جاے جو متین اہل قلم کے لئے زیبا نہیں - مثلاً وہ تحریر فرماتے ہیں " اعتراض

کیا جاتا ہے کہ مطالعہ کی ضخامت بہت کم ہے ' سمجھہ میں نہیں آتا کہ جب پہلے پوسٹر میں اس امر کی وضاحت کردی گئی تھی کہ صرف آٹھہ صفحے ہونگے تو اُس وقت وہ حضرات کیوں خاموش رہے ؟ اور اگر وہ کہیں کہ سائز تو ہمیں معلوم نہ تھا ' وہ خود ہی بتلائیں کہ ایک معقول ہفت روزہ جریدہ کا سائز اور کیا ہو —

ضخامت ! ضخامت ! ضخامت !!! چہ خوب ! چہ خوش ! یہ شور بدتمیزی " سگ بانگ می زند " سے کم نہیں —

عشوہ فروشان " متانت " کو میرا جواب یہ ہے کہ انھیں کوئی مجبور نہیں آتا کہ وہ " مطالعہ " کا پرچہ خرید فرمائیں ' انھیں بار بار " صفحے تھوڑے ہیں " " صفحے تھوڑے ہیں " کہہ کہہ کر اپنی زبان مبارک کو جنبش تکلم دینے کی ضرورت نہیں ..... وہ " گرگان بارہ دید " جو بظاہر معصوم نظر آتے ہیں اُن " بھیگی بلیوں " پر گرم نوازش کیوں ہیں جن کی کرنجی آنکھوں میں " مطالعہ " کی ایک ایک زبر اور ایک ایک زیر نوک خار کی طرح کھٹک رہی ہے ؟ ..... ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ " مطالعہ " کے بعض متین اور سنجیدہ قارئین بھی ضخامت کے کم ہونے کے شاکی ہیں ' تو اگر وہ اپنا چندہ بھجوا چکے ہوں تو خط بھیج کر واپس منگوالیں اور اگر یہ بھی اُن کے مزاج مقدس پر گراں ہو اور وہ غوغا آرائی کو ترجیح دیں تو اس کا بلیغ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اور خریداروں کو تو آٹھہ صفحے ارسال کئے جائیں ' اُن کو صرف چار - ! "

کیا بلیغ جواب ہے - ہمیں اس جواب کو پڑھ کر افسوس اور صدمہ ہی نہیں ہوا بلکہ بہت شرم معلوم ہوئی اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ " مطالعہ " کے سمجھنے کے لئے صحیح دماغ کی ضرورت ہے " - اللہ اکبر ! یہ دماغ !

اگر کسی نے یہ کہا کہ آٹھہ صفحے کم ہیں تو اس میں برا ماننے اور اس قدر طیش میں آنے اور ایسے سخت اور نا ملائم الفاظ کہنے کے کیا معنے - ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ آٹھہ صفحے کم ہیں اور یہی نہیں بلکہ اُن کا استعمال بری طرح کیا جاتا ہے - مثلاً اس کی کیا ضرورت ہے کہ پہلا صفحہ پورا غیر معمولی جلی قلم میں مطالعہ اور اڈیٹر کا نام لکھنے میں صرف کردیا - اس کے لئے آدھا صفحہ کافی ہے اور باقی آدھا آپ اپنے خیالات لطیفہ کے لئے رکھئے - دوسرا صفحہ پورا ایک نظم کی نذر ہو جاتا ہے - اگر نظم جلی قلم میں نہ ہو تو اس میں

بھی کفایت ہوسکتی ہے - اور ایک بار تو سارا اخبار جلی قلم سے لکھی ہوی نظم کی نذر ہوگیا - آخری پورا صفحہ قدر دانوں کے خطوں کے لئے محفوظ ہے - اکثر تیں چار سطر کے خط کے لئے پورے صفحے کا خون کردیا جاتا ہے - ان خطوں میں کوئی بھی تو کام کی بات نہیں ہوتی - ان خطوں کا ( جو خود اڈیٹر کی تعریف میں ہیں ) ویسے بھی درج کرنا نامناسب ہے - ان خطوں سے تو نکتہ چینوں کے اعتراض ہزار درجہ بہتر ہیں —

فاضل اڈیٹر کو خود سمجھنا چاہئے کہ اُن کے اخبار میں بہت کم گنجائش ہے اور جس قدر فضول چیزیں اس میں سے خارج ہوسکیں خارج کر دی جائیں اور ایک ایک انچ جگہ کام کی باتوں کے لئے محفوظ رکھی جاے - مثلاً انہوں نے ایک پرچے میں دو صفحوں پر اپنے دو انگریزی کے خانگی ( پرائیویٹ ) خط شایع کئے ہیں - ان میں سے ایک حقیقہ خط ہے - ہماری سمجھہ میں مطلق نہیں آیا کہ اس سے آپ کی کیا فرض تھی اس خط میں زبان یا خیالات کی کوئی بھی تو ایسی خوبی نہیں کہ اُسے اردو کے جریدے میں خاص طور پر شایع کیا جاتا —

بہر حال ہمارا مشورہ یہی ہے ( اور اس میں ہرگز کسی بدنیتی کو دخل نہیں ) کہ وہ ان تمام فضول اور بیکار چیزوں کو فوراً خارج کردیں اور ممکن ہو تو اس بارے میں کفایت کو کام میں لائیں • چھپائی بہت خراب ہوتی ہے اس کی اصلاح فرمائیں - زبان کو جو بعض اوقات انگریزی سانچے میں ڈھلی ہوتی ہے ' کسی قدر سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کریں - صبر اور تحمل سے کام لیں ' ذرا ذرا سے نکتہ چینی پر اس طرح بگڑنا ان کی شان کے خلاف ہے - اور بے ادبی معاف ! تھوڑا سا انکسار بھی ہو تو کچھہ بیجا نہوگا —